فروری 2021
گھر کے ہر فرد کے لیے
پاکیزہ
کراچی
www.pklibrary.com

اداریہ

سلسلے وار ناول

مکمل ناول

ناولٹ

عورت کہانی

افسانے

خصوصی مضامین

پبلشر و پرو پرائٹر: ذیشان رسول مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

نشاندہی کرتی ہیں اور جذبات، احساسات، تخیلات، تجربات اور مشاہدات کا تحریری بیان ''ادب'' کہلاتا ہے اور اس ادب کو اپنا کر معراج رسول نے سیکڑوں نہیں ہزاروں نہیں لاکھوں الفاظ کو اپنا بنالیا۔ اپنی اور دوسروں کی تحریروں کو اپنے ڈائجسٹوں کے ذریعے ساری دنیا میں پھیلایا۔ جہاں، جہاں اردو بولنے والے بستے ہیں وہ ''جاسوسی پبلی کیشنز'' کے رسالوں کے مداح ہیں اور ان کا انتظار کرتے ہیں۔

2008ء میں معراج رسول صاحب کی طبیعت جب زیادہ ناساز ہوئی تو ان کی بیگم عذرا رسول نے اپنی توجہ پبلی کیشنز کی طرف کی، لکھنا پڑھنا تو ان کے مشاغل میں شامل تھا لیکن تکنیکی باتیں بھی بہت جلد سیکھ کرانہوں نے معراج رسول صاحب کا بوجھ خاصا ہلکا کر دیا، عذرا کے اب دو ہی کام تھے اپنے ادارے کے تحت نکلنے والے ڈائجسٹوں کا معیار نہ صرف برقرار رکھنا بلکہ اسے بلند کرنا اور معراج صاحب کی خدمت۔ اللہ تعالیٰ نے جو وسائل عطا کیے تھے اس میں معراج رسول صاحب کی دیکھ بھال کے لیے ہمہ وقت ڈاکٹر اور نرسیں موجود رہتے تھے۔ لیکن عذرا رسول نے جس محنت اور تندہی سے ان کا خیال کیا وہ اپنی مثال آپ ہے، یہی وجہ تھی کہ آخر کے کچھ عرصے کے علاوہ جس میں معراج صاحب مکمل طور پر صاحبِ فراش تھے، ان کی آنکھوں میں ہمیشہ امید کے دیے روشن رہے، عذرا کے وجود میں انہیں وہ دنیا میسر رہی جہاں سکون تھا، خوشیاں تھیں، بہترین دنوں کی نوید تھی۔

وہ نہ صرف شوہر کی دیکھ بھال، خدمت اور دلجوئی میں مصروف رہیں بلکہ ڈائجسٹوں کو بھی پورا پورا وقت اور توجہ دی، ایک مہینے میں بیک وقت مختلف انداز و نوعیت کے اتنے ڈائجسٹ مرتب کرنا، شائع کرنا، ہر قاری کی پسند اور ذوق کا خیال رکھنا کوئی معمولی بات نہیں لیکن ایک مستعد، فعال اور منظم سپہ سالار اپنی فوج سے کرشمے کروا سکتا ہے اور عذرا رسول نے یہ کام بخوبی کیا۔ یہ جادوگری، یہ حُسنِ انتظام کچھ عذرا کی فطرت میں تھا اور کچھ معراج رسول کی رفاقت میں میسر آیا۔

معراج صاحب سیلف میڈ شخص تھے، ان کے والد اور خاندان کا مادی اثاثہ گھر، مکان سب تقسیم کے وقت پیچھے رہ گیا تھا۔ معراج رسول اس وقت بہت چھوٹے تھے لیکن قدرت کی عطا کردہ ذہانت کے سبب حالات و واقعات کو سمجھنے کی بے پناہ صلاحیت تھی...... وہ بہت جلد عملی زندگی کے حصہ دار بننے لگے اور پاکستان آنے کے بعد ان کے خاندان نے جو سفر صفر سے شروع کیا تھا اس میں سیکڑوں ''صفر'' کا اضافہ کر کے بات ہزاروں، لاکھوں تک پہنچادی۔

معراج رسول پر سحر انصاری کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ

فصیلِ شہر میں پیدا کیا ہے در میں نے
کسی بھی بابِ رعایت سے میں نہیں آیا

ڈائجسٹوں کے متعلق لوگوں کو عموماً یہ تاثر ہے کہ اسے صرف خواتین ہی دلچسپی سے پڑھتی ہیں لیکن معراج رسول نے ایسا مواد، ایسا ادب فراہم کیا کہ کیا مرد، کیا عورت سب کی توجہ ادھر مبذول ہوگئی۔

جاوید اختر کی نظم ہے جس کے چند اشعار نذر ہیں۔

عجیب آدمی تھا وہ
وہ بندشوں سے کہتا تھا
میں تم کو توڑ سکتا ہوں
سہولتوں سے کہتا تھا

میں تم کو چھوڑ سکتا ہوں، عجیب آدمی تھا وہ
محبتوں کا گیت تھا
بغاوتوں کا راگ تھا
کبھی وہ صرف پھول تھا
کبھی وہ صرف آگ تھا، عجیب آدمی تھا وہ

یادوں کے پتے...... اختر شجاعت، کراچی

پاکیزہ کے ساتھ اپنی وابستگی بیان کرنے کے لیے ماضی کے پتے پلٹتی ہوں تو بہت خوب صورت یادوں کی کہکشاں بکھری نظر آتی ہے۔ ہر یاد، ہر لمحہ میرے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ پاکیزہ کے ساتھ تعلق کچی عمر سے لے کر عمر کی پختگی تک ساتھ، ساتھ چلتا رہا اور کرم ہے اس رب کا کہ اب تک چل رہا ہے۔

لکھنے کی ابتدا ماہنامہ پاکیزہ سے کی، یہاں موجود ہر فرد نے بہت تعاون کیا اور اسی تعاون اور اپنائیت کی بنا پر میرا تعلق مضبوط ہوتا گیا۔ نام بدلتے رہے۔ چہرے بدلتے رہے مگر ادارہ انتہائی خوش اسلوبی اور کامیابی سے آگے بڑھتا رہا۔ مگر بے حد عجیب بات ہے کہ اتنی طویل وابستگی کے باوجود میری کبھی معراج صاحب سے ملاقات نہ ہوئی اور نہ کبھی بات ہوئی جس کا مجھے افسوس ہے۔ عذرا کے ساتھ میری ایک بھرپور ملاقات انجم انصار کے بیٹے کے ولیمے میں ہوئی جو بہت دیرپا ثابت ہوئی۔ وقت کے چند پتے اور پلٹے تو پھر یادوں کے ایک پتے پر رک سی گئی اور یہ پنا بہت اہم تھا۔

وہ پاکیزہ کی ایک تقریب تھی جو سن سیٹ کلب میں منعقد ہوئی تھی۔ تقریب کے اختتام پر جب میں واپس جا رہی تھی تو عذرا نے بہت خلوص سے کہا کہ ”اختر! میرے گھر چلو میں تمہیں اپنے میاں جی سے ملواتی ہوں تم ان کی عیادت کر لینا۔“ ان کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

ان دنوں معراج صاحب اپنی بیماری کے باعث مکمل طور پر بیڈ پر تھے۔ میں عذرا کے ساتھ ان کے خوب صورت گھر میں داخل ہوئی وہ سیدھا مجھے اور (میرے شوہر) افتخار کو لے کر معراج صاحب کے روم میں داخل ہوئیں۔

معراج رسول صاحب کے قریب پہنچ کر عذرا نے بہت محبت سے آہستہ، آہستہ ان کی پیشانی پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ وہ ساتھ، ساتھ بولتی بھی جا رہی تھیں اس بات سے بے پروا کہ وہ ان کی بات کا جواب دینے کی پوزیشن میں ہیں یا نہیں مگر وہ اپنی دنیا میں مگن ان سے بول رہی تھیں۔ اس لمحے عذرا کے چہرے پر محبت کا نور بکھرا ہوا تھا اور لہجہ محبت کی چاشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے بس ایک نظر عذرا کو دیکھا اور پھر معراج صاحب کو...... میرے دل نے بہت سچائی سے دعا کی کہ اے میرے پروردگار! تو معراج صاحب کو صحت عطا فرما۔ اور یہ جوڑا سلامت رہے، بس وہ ایک لمحہ میری یادوں کے پتے پر چپک گیا۔

پھر معراج صاحب کی حالت سنبھلتی رہی، گرتی رہی اور پھر ایک دن زندگی ان سے روٹھ گئی۔ عذرا نے ایک پُرخلوص، وفا شعار اور انتہائی خدمت گزار بیوی ہونے کا حق ادا کر دیا۔ بہت صبر و ضبط اور ہمت سے یہ سب کچھ سہا اور اس دکھ کو اپنے اندر اتارتے ہوئے ان کے لب مسکراتے رہے۔

آج میں ان کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ کریم انہیں ہمت، طاقت اور صحت عطا کرے سلامت رہیں...... اور اللہ کریم معراج صاحب کی مغفرت فرمائے، اور ان کے درجات بلند فرمائے، آمین الٰہی آمین۔

معراج رسول، مجسّم ادارہ...... تسنیم منیر علوی، دبئی

معراج رسول صاحب صرف ایک ادارے کے مالک ہی نہیں بلکہ خود اپنی ذات میں مکمل ایک ادارہ تھے۔ ایک

ایسا پیڑ جس کی گھنی چھاؤں میں لکھنے والوں نے اٹھ کر دوڑنا سیکھا۔ انہوں نے اہلِ ادب پر ایک احسان عظیم کیا، افراد کو رجحان ساز بنایا اور وہ اردو زبان کی طرف مائل ہوئے پھر اس کی آبیاری میں شامل ہوئے۔ مختلف مزاج کے افراد کے لیے رسالوں کا اجرا کوئی معمولی بات نہیں جو تجسس، تحیر، کھوج و جستجو کو پسند کرتے ان کے لیے جاسوسی اور سسپنس جیسے رسالوں کی بنیاد رکھی اور جو رومانی اور ہلکی پھلکی اور حقیقت سے بھرپور کہانیوں کے دلدادہ تھے ان کے لیے پاکیزہ اور پھر سرگزشت کا اجرا کیا۔ ماہنامہ پاکیزہ صرف نام کا ہی پاکیزہ نہیں بلکہ ادب کی دبیز پاکیزگی کا عنصر اس میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ جب ہماری کہانی پہلی مرتبہ پاکیزہ کا حصہ بنی تو ادارے کی طرف سے حوصلہ افزائی ہوئی پھر تو اتر سے تین چار کہانیاں پاکیزہ کا حصہ بنیں۔ میرے شوہر مرحوم ہم کو پاکیزہ آفس بھی لے کر آئے۔ اس وقت شاید نادرہ گیلانی اور بھی کچھ لوگوں کے نام جو اس وقت ذہن میں نہیں سے ملاقات ہوئی اور سب سے بڑھ کر معراج صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ بہت تپاک سے ملے۔ اس پہلی اور آخری ملاقات کے مناظر آج بھی نگاہوں میں جلا بخشتے ہیں۔ دل کو چھوتا ہوا نرم اور ہموار لہجہ ان کی شخصیت کا آئینہ دار تھا، وہی تاثر آج چند سطور لکھتے وقت بھی میرے سامنے موجود ہے۔ اس وقت شہر میں خواتین میں اجرک کا فیشن نیا، نیا وارد ہوا تھا اور ہم بھی اجرک کو چادر کی طرح اوڑھے ہوئے تھے۔ نادرہ اور دوسرے اراکین سے اجرک کے موضوع پر گفتگو ہوئی اور پھر اگلے ماہ پاکیزہ میں اجرک پر سروے موجود تھا اور ظاہر ہے، ہم بھی وہیں موجود تھے۔ وہ کسی نئی اور چونکا دینے والی چیز کو فوراً اور ابھی کرنے پر یقین رکھتے تھے۔ وہ صلاحیت شناس تھے اسی لیے باصلاحیت افراد کو سامنے لانے میں ذرا دیر نہیں لگاتے۔ ان کی اسی خوبی کی بدولت آج دنیائے ادب پر چھائے ہوئے جانے کتنے لکھاری اسی روشن دماغ شخصیت کی بدولت فروزاں ہیں۔ آج بھی ٹی وی چینلز پر آنے والے اور دوسرے ادبی پرچوں میں چھپنے والے ان گنت ہیرے معراج صاحب کی ہی بدولت کندن بن کر چمک دمک رہے ہیں اور وہی سالارِ کارواں ہیں۔ آج اس کا ثمر یہ ہے کہ ان کے مختلف رسالے چہار جانب روشنی پھیلا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ عذرا صاحبہ کو بہت ہمت اور طاقت عطا فرمائے اور ان جلتے چراغوں کو مزید روشن اور تابناک رکھے اور ادارے کے محنتی کارکن معراج صاحب کو اسی طرح کامیابی سے خراجِ تحسین پیش کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ معراج صاحب کے درجات بلند فرمائے، الٰہی آمین۔

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم...... شگفتہ شفیق، کراچی

دن اس قدر تیزی سے گزرتے ہیں کہ لگتا ہے جیسے کل کی بات ہو...... نہ جانے یہ دو سال کیسے پلک جھپکتے ہی گزر گئے۔ دو برس پہلے فجر کی نماز کے بعد جو واٹس ایپ چیک کیا تو انتہائی افسوس ناک خبر ہماری منتظر تھی کہ ہماری عذرا کے معراج رسول صاحب آج انہیں اکیلا چھوڑ کے ابدی سفر پر روانہ ہو گئے ہیں۔ ہائے دل پر اداسی چھا گئی تھی کہ ہم عذرا کے معراج رسول صاحب کے عشق سے خوب واقف ہیں۔ ان کی تو ہر بات شوہر کی محبت والفت کی آئینہ دار دیکھی ہم نے۔ نوکروں اور میڈیکل اسٹاف کے ہوتے ہوئے بھی معراج صاحب کے بیشتر کام عذرا خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی تھیں۔ ان کی دوا، پانی اور خوراک کا انتظام سب کچھ خود کرتیں۔ سالوں عذرا نے یہ سب کام کیے یعنی بہت خدمت کی پھر بھی اس دن وقت جدائی عذرا کا رونا بلکنا دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ تب ہم نے اللہ سے بہت دعا مانگی تھی کہ اللہ ان کو صبر و ہمت عطا فرمائے۔ وہ بہت بہادر ہیں۔ سارے خاندان کا معراج رسول کی طرح خیال رکھنے والی، اپنے ورکرز پر معراج صاحب کی طرح مہربان...... عذرا نے معراج صاحب کے جانے کے بعد بڑے حوصلے سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ کاروبارِ زندگی کو دوبارہ رواں دواں کیا اور ثابت کر دیا کہ واقعی وہ معراج رسول کی بہترین چوائس تھیں۔ مجھے

ان دونوں میاں بیوی میں ایک خوبی بہت وافر انداز میں نظر آتی ہے وہ ہے انکساری اور دوسروں پر مہربانی اور میرا خیال ہے کہ یہ خوبیاں جس میں ہوں وہ ان شاء اللہ دنیا و آخرت میں سرخرو رہے گا۔ اللہ پاک عذرا کو شاداب و شگفتہ رکھے اور مزید ہمت عطا فرمائے، آمین۔ اللہ معراج صاحب کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ مرحوم سیلف میڈ آدمی تھے اور بہت زیادہ محنتی تھے رسائل کے مطالعے کے بہت شوقین تھے اسی شوق کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے سب سے پہلے جاسوسی ڈائجسٹ کی اشاعت سے ابتدا کی۔ جس میں بے شمار اعلیٰ پائے کی لازوال تحاریر شائع ہوئیں۔ پھر سسپنس ڈائجسٹ کی شروعات نے ان کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ اس کے بعد ماہنامہ پاکیزہ نکالا جو اپنی بہترین کہانیوں اور منفرد سلسلوں کی بنیاد پر خواتین کی اولین چوائس بن گیا۔ اس کے بعد ماہنامہ سرگزشت آیا اور چھا گیا اور آج تک یہ تمام رسائل قارئین کے دلوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ ایک بڑا اعزاز یہ ہے کہ سلسلے وار طویل ناول جسے محی الدین نواب نے لکھا 33 سالوں تک مسلسل چھپتا رہا جو اپنی جگہ ایک کمال ہے اور آج ہم ان ہی صاحب کمال، معراج رسول صاحب کے لیے جنہوں نے اپنی اور بہت سارے لوگوں کی دنیا بدل دی تھی دعا گو ہیں کہ اللہ ان کو جنت میں بھی اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ اور ان کے قائم کردہ ادارے کو عذرا رسول اور ان کے فرزند ارجمند ذیشان رسول کی سربراہی میں مزید ترقیاں عطا فرمائے، آمین!

تعزیتی پیغام......انجم انصار

نزہت اس موقع پر کیا کہوں۔ معراج رسول صاحب کے بارے میں لکھنا گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ آج کل طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے، صدیقی صاحب کے جانے سے تو میرا قلم بالکل ہی رک گیا ہے۔ کیا لکھوں...... کیسے لکھوں، عذرا کے دکھ میں برابر کی شریک ہوں۔ ہر نماز میں خصوصاً نماز شب میں، میں معراج صاحب کو ضرور یاد رکھتی ہوں، اللہ ان کے درجات بلند کرے۔ اتنا طویل عرصے کا ساتھ چند سطروں میں کیسے بیان ہو۔ ان کے ادارے کے لیے بہت دعائیں ہیں۔

معراج رسول ہر ایک کا دوست......معراج صاحب کے دیرینہ دوست انور صلاح الدین

معراج کی شخصیت ہمہ گیر تھی۔ وہ ادبی محفلوں میں بہت مقبول تھے۔ اُن کے حلقۂ احباب میں محض ادیب ہی نہیں بلکہ ادب کا عمدہ ذوق رکھنے والے اور عام افراد بھی شامل تھے۔ نو آموز ادیب اور خاص طور پر یونیورسٹی کے طالبعلم اُن کے پاس رہنمائی حاصل کرنے اور تصحیح کروانے آتے تھے۔ معراج اپنی ذات میں انجمن ہی نہیں ادارہ بھی تھے۔ نہایت صاف گو انسان تھے۔ انسانیت کا یہ عالم تھا کہ اپنا درد بھول کر دوسروں کی مدد کے لیے تیار رہتے تھے۔ بذلہ سنج بھی تھے، اُن کے چٹکلوں سے محفل میں جان پڑ جاتی تھی بعد میں بھی اُن کے چٹکلے یاد کر کے لوگ لطف اندوز ہوتے تھے۔ جس نے بھی ایک مرتبہ معراج رسول سے بات کر لی وہ اُن کا ہمیشہ کے لیے ہو جاتا تھا۔

غیر معمولی شخصیت......سلمیٰ غزل۔ کراچی

محترم معراج رسول مرحوم کے بارے میں لکھنے سے پہلے کافی سوچنا پڑتا ہے کیونکہ ان سے کبھی ملی نہیں مگر کافی سال پرانے عذرا رسول کے انٹرویو نے ایک خاکہ سا ذہن میں بنا دیا ہے۔ بے حد زیرک، معاملہ فہم، اچھے منتظم اور اچھے شریکِ حیات ہونے کے ساتھ ساتھ دوست بھی پھر چار رسالوں کی ادارت سنبھالنا اور اسے کامیابی سے چلانا کسی معمولی آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے شریک حیات کا چناؤ بھی بڑی سمجھ داری سے کیا جو اُن کی

زندگی اور بعد از مرگ بھی بہترین منتظم ثابت ہوئیں۔ مرحوم کے چالیسویں میں، میں شریک تھی اور عذرا رسول کا بلک، بلک اور تڑپ، تڑپ کر رونا اور بیٹے اور بہو کا تسلیاں دینا مجھے یاد ہے۔ کسی نے چھوٹی سی کہانی سنائی تھی۔ ایک خاتون شوہر کے مرنے کے بعد بھی دروازے پر مردانہ چپل رکھتی تھیں۔ بیٹی نے پوچھا تو بولیں۔ ''بیٹا کسی کو پتا نہ چلے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔'' اور واقعی عذرا رسول کے حوصلے کی داد دینی چاہیے مرحوم کئی سالوں سے صاحبِ فراش تھے مگر عذرا رسول کی ہمت اور حوصلہ عورتوں کے لیے ایک مثال ہے۔ مرحوم اس لحاظ سے بھی خوش نصیب تھے کہ انہیں عذرا رسول کی شکل میں باہمت، حوصلہ منداور باصلاحیت منتظم بیوی ملی ہیں۔ میں خود چونکہ یکم جنوری 2020ء کو اس سانحے سے گزر چکی ہوں اس لیے زیادہ احساس ہو رہا ہے۔ اللہ مرحوم کے درجات بلند کرے، انہیں جنت میں اعلیٰ مقام دے اور کوئی بھی ان کی نیکی بخشش کا ذریعہ بن جائے۔ اللہ عذرا رسول اور ان کے بچوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین

فاطمہ حسن...... منتظمِ اعلیٰ لائبریری اور آرکائیو آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی

معراج رسول صاحب کو جمال احسانی کی وجہ سے میں جانتی تھی۔ اُن سے غائبانہ تعارف زیادہ رہا، بالمشافہ ملاقاتیں کم رہیں۔ شعبہ اطلاعات سندھ کی میری ملازمت کے ابتدائی زمانے میں میری ایک کہانی ماہنامہ پاکیزہ میں شائع ہوئی تھی لیکن میرے پاس جو معراج صاحب کی بہت اچھی یاد ہے وہ یہ کہ ساقی امروہوی صاحب کا شعری مجموعہ ''مگر اب شام ہوتی جارہی ہے'' شائع نہیں ہو پارہا تھا اور وہ ضعیف اور بیمار تھے۔ میں نے معراج رسول صاحب سے کہا کہ اگر آپ اُن کا مجموعہ شائع کردیں تو ایک اچھے شاعر کی شاعری محفوظ ہو جائے گی۔ مزید یہ کہ انہیں بھی ایک خوشی ملے گی۔ معراج صاحب نے فوری اس مجموعے کی اشاعت کا اہتمام کردیا۔ معراج صاحب ایک نفیس اور کم گو انسان تھے۔ میرے دل میں اُن کی بہت قدر ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند کرے۔ آمین

رُودادِ وفا...... ڈاکٹر ممتاز عمر، کراچی

معراج رسول صاحب کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ ان کی یہ نسبت اس حوالے سے منفرد و ممتاز ہے کہ اس مردم خیز زمین نے خواجہ حیدر علی آتش، شیخ امام بخش ناسخ، مولانا عبدالحلیم شرر، رجب علی بیگ سرور جیسے یکتائے روزگار اہلِ علم و دانش کو جنم دیا۔ اگر لکھنؤ کی نسبت سے شخصیات کا تذکرہ شروع ہوا تو موضوع طویل ہوتا جائے گا۔ میں تو محض وہاں کی علمی و ادبی حیثیت کا تذکرہ کر رہا ہوں جس کے ایک چشم و چراغ معراج رسول بھی ہیں جو ہجرت کے بعد پاکستان تشریف لائے اور یہاں قلم و قرطاس کے شعبے سے وابستہ رہے۔ ان کا قلبِ حزیں اصلاحِ معاشرہ، ہمدردی اور خدمت انسانی سے لبریز تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ایسے موقر جریدے کی ضرورت ہے جس میں تاریخی، معاشرتی اور سماجی موضوعات پیش کیے جاسکیں۔ یہ وہ دور تھا جب الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کا وجود تک نہ تھا۔ لوگوں کی تفریحِ طبع کی خاطر جہاں ناولز، افسانوں اور شاعری کا شغف پایا جاتا تھا وہیں اس بات کی ضرورت بھی تھی کہ دلچسپ پیرائے میں ایسے موضوعات سامنے لائے جائیں جو حیرت و استعجاب کے ساتھ دلچسپی کی ان بلندیوں کو چھوتے ہوں جہاں تک انسانی عقل و دانش کی پہنچ نہ ہو۔ یہی نہیں کچھ ایسے تجربات و مشاہدات بھی پیش کیے جائیں جو عام زندگی کا حصہ ہیں۔ اس سلسلے میں محی الدین نواب اور ساجد امجد نے شہرت عام پائی۔ جاسوسی ڈائجسٹ کے اجرا سے معراج رسول کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ ان کے لیے آگے بڑھنے میں معاون و مددگار رہی۔ عوام الناس کے ذوق و شوق کو دیکھتے ہوئے

بیادِ معراج رسول کے بقیہ تاثرات صفحہ نمبر 236 پر ملاحظہ فرمائیں

سلسلے وار ناول

زندگی کبھی، کبھی انسان کو ایسے کربناک حادثے سے دوچار کر دیتی ہے کہ اس کا اپنی ذات اور ارد گرد کے لوگوں پر سے اعتماد متزلزل ہو جاتا ہے۔ اس حادثے کی وجہ بعض اوقات اس کی اپنی توقعات بھی ہوتی ہیں جو وہ کسی بے نام تعلق سے وابستہ کر لیتا ہے۔ وہ جذبے جو رشتوں کے توسط سے دل میں بسیرا کریں ان کی پزیرائی تو مذہب اور معاشرہ دونوں کرتے ہیں، ان کی حق تلفی پر جواب طلبی بھی کی جاسکتی ہے مگر وہ دلی تعلق جنہیں رشتوں کی سند نہ حاصل ہو، انہیں کسی عدالت سے بھی سزا نہیں سنائی جا سکتی، سوائے ضمیر کی عدالت کے۔ جبکہ وہ رشتے جنہیں تعلق کا نام بھی دے دیا جائے کبھی کبھی وہ اپنے جائز حق سے بھی محروم کر دیے جاتے ہیں۔ اور ان کی جوابدہی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہ دنیا دارالعمل ہے جہاں انسان کے دو ہی امتحان ہیں ، ایک شکر کا دوسرے صبر کا . . . مگر جب حضرتِ انسان حسد یا ہوس کی خاطر تقدیر سے لڑنے کی ٹھان لے تو پھر اس کے اپنے فیصلے ہی اس کی آزمائش بن جاتے ہیں۔

حادثوں میں گزری ہے راس بس تباہی ہے — زندگی کی چاہت میں زندگی گنوائی ہے
خواب اب نہیں میرے ، نیند تک پرائی ہے — عارضی محبت تھی مستقل نبھائی ہے

امیدوں، جذبوں، فیصلوں اور احساسِ جرم پر مبنی کچھ ایسے کرداروں کی کہانی جو دل سے دیکھتے، دل سے سنتے اور دل سے ہی سوچتے ہیں

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیرازی ولا میں مقیم مظفر اور سائرہ کی بیٹی ردا کی منگنی اس کی مرضی سے آصف کے ساتھ ہوتی ہے۔ جس میں یو ایس اے سے تین سال بعد واپس آ کر مظفر صاحب کا یتیم بھتیجا عکرمہ بھی شریک ہوتا ہے۔ دُرِ مکنون، سائرہ بیگم کی بھانجی تھی جس کی ذمے داری مظفر احمد نے اس کے ماں باپ کے انتقال کے بعد اٹھائی تھی۔ ایک رات در مکنون کی طبیعت خراب ہونے پر دادی اسے سکون آور دوا دیتی ہیں اور اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کا بتاتی ہیں۔ اسٹڈی میں در مکنون کو دیکھ کر آنسو بہاتے مظفر شیرازی، عکرمہ کے ذہن میں ہلچل مچائے ہوئے تھے۔ مظفر صاحب نے اپنی نئی ول بنوائی تھی وہ لے کر عکرمہ نکلتا ہے تو زاویار کا شیری کے ساتھ رویہ دیکھ کر سوچتا ہے کہ کوئی عورتوں کے ساتھ اس طرح بھی برتاؤ کرتا ہے۔ خولہ، در مکنون سے عکرمہ کے بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ اگر آپ اس گھر میں بہو بن کر آئیں تو بہت خوش رہیں گی، اس جملے کو سن کر عکرمہ ایک انجانے سے احساس سے دوچار ہوا تھا۔ سائرہ بیگم، عکرمہ کو بھی شام کو گھر پر رہنے کا کہتی ہیں۔ عکرمہ کو زاویار سے مل کر یاد آ جاتا ہے کہ اس نے صفدر صاحب کے آفس کے باہر اسے دیکھا تھا اور لڑکی سے اس کا خراب برتاؤ بھی یاد آ جاتا ہے۔ زاویار کو دیکھ کر دُرِ مکنون بے ہوش ہو جاتی ہے۔ عینی، در مکنون سے ملنے آتی ہے اور اس کا حوصلہ بڑھاتی ہے، عکرمہ کو یہ جان کر شاک لگتا ہے کہ در مکنون کے خوف اور وحشت کی وجہ اظہار بھائی ہیں۔ سائرہ بیگم، در مکنون کو بتاتی ہیں کہ زاویار نے رشتے سے انکار کر دیا ہے اور وہ اس کا رشتہ جلد از جلد کرنا چاہتی ہیں کیونکہ ان کے بعد عکرمہ اور سیف کی فیملی اس کی ذمے داری نہیں اٹھا سکے گی۔ عکرمہ اندر آتا ہے تو دُرِ مکنون بتاتی ہے کہ کوئی طاہرہ آنٹی آئی ہیں، عکرمہ بہت تیزی سے ان سے ملنے کے لیے جاتا ہے۔ دادی عکرمہ اور مظفر صاحب کو بتاتی ہیں کہ انہوں نے طاہرہ کو در مکنون کی میڈیکل فائل زوہا کے ذریعے دے دی ہے۔ طاہرہ بانو (ماہر نفسیات) در مکنون کو بتاتی ہیں کہ عکرمہ کی والدہ شگفتہ ان کی دوست ہی نہیں دودھ شریک بہن بھی تھی۔ در مکنون جب طاہرہ بانو کے پاس سے واپس آتی ہے تو عینی کا فون آتا ہے۔ اس کے فون رکھتے ہی دوبارہ بیل ہوتی ہے تو وہ عینی کا ہی سمجھ کر اٹھاتی ہے لیکن وہ زاویار کا فون تھا اور وہ اس سے معافی مانگتا ہے دُرِ مکنون کچھ کہہ نہیں پاتی رونے لگتی ہے عکرمہ جو گاڑی کی چابی بھول گیا تھا وہ در مکنون کو روتا دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے اور اس سے فون لے لیتا ہے لیکن دوسری طرف زاویار کی موجودگی اس کے لیے حیران کن تھی۔ ردا کی شادی میں سائرہ بیگم، در مکنون کو ایک فیملی سے ملواتی ہیں رخصتی کے بعد آصف اپنی پھپھو کو ائرپورٹ چھوڑنے جاتا ہے تو واپسی پر ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ آصف کا آپریشن تھا تو سب اسپتال میں تھے اظہار صاحب کو اپنی فیملی کے ساتھ واپس جانا تھا عکرمہ ٹکٹ لے کر آتا ہے تو اظہار اسپتال میں نہیں تھے، وہ پریشان ہو جاتا ہے اور زوہا کے ساتھ گھر آ جاتا ہے، سیڑھیوں پر در مکنون کا دوپٹا پڑا دیکھ کر وہ دادی کے کمرے کا دروازہ بجا ڈالتا ہے۔ ماسٹر کی سے جب وہ لوگ دادی کا کمرا کھولتے ہیں تو دہشت زدہ رہ جاتے ہیں کیونکہ دُرِ مکنون کمرے کے انتہائی سرے پر دیوار کے قریب اوندھے منہ پڑی تھی۔ عکرمہ جب اسپتال سے گھر آتا ہے تو واچ مین اسے اظہار صاحب کا گولڈ پلیٹڈ پسٹل کی شکل کا لائٹر لا کر دیتا ہے کہ کل گیٹ کے پاس گرا ہوا تھا۔ عکرمہ کو اچھی طرح یاد تھا کہ کل زارا نے اظہار صاحب کو لائٹر دیا تھا اور انہوں نے گاڑی میں اسموکنگ بھی کی تھی' ان کا ارادہ اسپتال سے ڈائریکٹ ائرپورٹ جانے کا تھا اور وہ انہیں اسپتال ڈراپ کر کے ٹکٹس لینے گیا تھا تو لائٹر واپس شیرازی ولا کیسے آیا۔ اس کے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔ دُرِ مکنون کو کوما میں گئے دو ہفتے ہو گئے تھے۔ مظفر شیرازی بہت زیادہ پریشان ہوتے ہیں تو دادی کہتی ہیں کہ ڈاکٹر تو پُرامید ہیں جب وہ صحت یاب ہو کر آئے گی تو جشن صحت منائیں گے اور اسی تقریب میں، میں اسے اپنے پوتے سے منسوب کر دوں گی۔ مظفر صاحب کے پوچھنے پر دادی سیف کا نام لیتی ہیں تو مظفر صاحب کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہو سکتا کیونکہ دُرِ مکنون ان کی اور سائرہ شیرازی کی سگی بیٹی ہے۔ عکرمہ بھی یہ بات سن لیتا ہے۔ دادی کہتی ہیں کہ انہیں در مکنون کو دیکھ کر ہمیشہ لگتا تھا کہ وہ ان کی ہے۔ نہیں جانتی تھیں کہ یہی سچ ہے۔ جب سے اسے در مکنون سے اپنے اور اس کے رشتے کا پتا چلا تو وہ اور بھی زیادہ ذمے دار ہو گیا تھا کہ وہ اس کی سگی چچازاد تھی۔ در مکنون گھر آتی ہے تو سب اس کے استقبال کے لیے موجود ہوتے ہیں آصف کو وہیل چیئر پر دیکھ کر وہ آزردہ ہو جاتی ہے۔ عکرمہ، دادی اور مظفر صاحب کو بتا دیتا ہے کہ دُرِ مکنون اس کا انتخاب ہے۔ سائرہ بیگم، عکرمہ کے در مکنون سے شادی کے فیصلے پر بہت سیخ پا ہوتی ہیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ردا کو آصف سے طلاق دلوا کر عکرمہ سے شادی کر دیں۔ دادی نے زوہا کو بلا کر در مکنون تک عکرمہ کا پروپوزل پہنچوایا تو در مکنون انکار کر دیتی ہے۔ عکرمہ، در مکنون سے بات کر کے اسے اس رشتے پر کنوینس کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن... دُرِ مکنون سوچتی ہے کہ اس کا انکار بہتر ہے لیکن فرحان جو ردا کی شادی میں ملا تھا وہ اپنا پروپوزل بھیجتا ہے اور زارا فون پر اس کی طبیعت پوچھتی ہے تو اظہار صاحب اس سے کہتے ہیں کہ جو کام ادھورا رہ گیا وہ مکمل کرنا ہے۔ پھر طاہرہ بھی در مکنون کو سمجھاتی ہیں تو دُرِ مکنون'

عکرمہ سے رشتے کے لیے ہاں کردیتی ہے۔زوہا، عکرمہ سے ٹریٹ مانگتی ہے۔ولی (عکرمہ کا دوست) بھی یہ سن کر بہت خوش ہوتا ہے۔عکرمہ کا بھائی عبید آرہا تھا تو عکرمہ کی شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں، عکرمہ فضول رسومات نہیں کرنا چاہتا تو زارا اسے سمجھاتی ہے کہ وہ نہیں چاہتا تو درِمکنون تو چاہتی ہوگی۔عکرمہ، درِمکنون سے بات کرتا ہے تو وہ کوئی اعتراض نہیں کرتی۔زاویار کا فون آتا ہے اور وہ درِمکنون سے معافی مانگتا ہے تو درِمکنون، عکرمہ کو اپنے اور زاویار اور اپنے ماضی کے رشتے کے بارے میں بتاتی ہے۔زاویار، درِمکنون کی دوست عینی کا بھائی تھا عینی اور درِمکنون اس سے پہلے ایک پروجیکٹ میں مدد لیتی ہیں اور پھر وہ ان کے کلس میں ایڈمیشن کے لیے ان کی تیاری کرواتا ہے، زاویار، درِمکنون کو پسند کرنے لگتا ہے۔صوفیہ (درِمکنون کی ماں) مکرم صاحب کی چھٹی بیٹی تھی جوان کی دوسری بیوی سے تھی ان کی پہلی بیوی سے سات بیٹیاں ہوئیں۔جن میں دو پیدا ہوتے ہی مر گئیں۔ان کو اولادِ نرینہ کی خواہش نے دوسری شادی پر مجبور کیا لیکن دوسری بیوی سے بھی بیٹی ہوئی تو مجبوراً دل کو سمجھالیا۔چار بیٹیوں کی شادی کے بعد ان کی (پہلی بیوی کی) سائرہ اور صوفیہ ہی رہ گئی تھیں۔شادی کے لیے جب زاہد علی نے اپنی والدہ کو ان کے گھر رشتے کے لیے بھیجا جو اس کالونی میں نئے، نئے شفٹ ہوئے تھے۔زاہد علی کی والدہ نے جب مکرم صاحب کی بیٹیوں کو دیکھا تو سوچا کہ زاہد علی نے سائرہ کو ہی پسند کیا ہوگا اور ان کے لیے رشتہ ڈال دیا جو قبول ہوگیا۔شادی سے ایک ہفتہ پہلے جب وہ سب سے چھپ کر اپنے دوست مظفر کے ساتھ ان کے گھر گئے تو دلہن کو دیکھ کر حیران ہوگئے۔انہوں نے شادی سے انکار کیا تو مظفر کی والدہ نے ان کے لیے سائرہ کا رشتہ دیا جو قبول کرلیا گیا لیکن سائرہ کے دل سے یہ بات نہ نکلی۔سائرہ کے لگاتار چار بیٹیاں ہوئیں جن میں سے ایک پیدائش کے فوراً بعد انتقال کرگئی اب اتنے سال بعد صوفیہ اور سائرہ دونوں امید سے ہوگئیں۔صوفیہ کے ساتھ کچھ مسائل تھے لیکن اس بار وہ خوش تھیں کہ خدا نے ان کی گود بھری کی لیکن جب ان کے مردہ بچے نے جنم لیا تو مظفر نے اپنی بیٹی (دُرِمکنون) صوفیہ اور زاہد علی کی گود میں ڈال دی۔اس بات سے صرف زاہد علی اور مظفر ہی باخبر تھے انہوں نے یہ بات اور کسی کو نہیں بتائی تھی۔درِمکنون، صباحت کی منگنی کی شاپنگ کے لیے جاتی ہے تو ٹیکسی خراب ہوجاتی ہے تو ٹیکسی والا اسے راستے میں ہی اتار دیتا ہے۔وہاں زاویار آجاتا ہے وہ اس کے ساتھ جاتی ہے وہ راستے میں اسے پروپوز کرتا ہے......ایک جگہ زاویار کولڈ ڈرنک لینے کے لیے رکتا ہے ان کے پیچھے کچھ بدمعاش ٹائپ لوگ لگ جاتے ہیں جو اسلحے کے زور پر درِمکنون کو اغوا کرلیتے ہیں اور زاویار موت کے خوف سے اسے ان لوگوں کے پاس چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔عکرمہ کہتا ہے کہ وہ زاویار کو معاف کردے۔عبید اور سدرہ بچوں سمیت کراچی آگئے تھے۔دُرِمکنون، طاہرہ کے ساتھ ایک کاؤنسلنگ نشست میں جارہی تھی۔درِمکنون، سدرہ، عبید اور عکرمہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے جاتی ہے تو واپسی پر زاویار کو شیرازی ولا کے باہر دیکھ کر ڈسٹرب ہوتی ہے لان میں آصف اور ردا کی آوازیں اسے گھٹن کا احساس دلاتی ہیں لاؤنج میں جانے لگتی ہے تو سائرہ بیگم کی ناگوار باتیں اس کے کان میں پڑتی ہیں۔طاہرہ، درِمکنون کو کہتی ہیں کہ قرآن کی ہر آیت ہمیں وعظ و نصیحت کرتی ہے اگر ہم سننا چاہیں تو......آصف گھر چھوڑ کر کسی کو بھی بتائے بغیر کہیں چلا گیا تھا اور اس سب کی ذمے دار سائرہ بیگم، درِمکنون کو ٹھہراتی ہیں۔عکرمہ، ردا کو تسلی دیتا ہے کہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔شہرین، میمونہ بیگم کو زاویار کے متعلق بتاتی ہے تو وہ سوچتی ہیں کہ آغا جان اور شہریار سے بھی اس کا دل صاف ہوجائے گا۔جلال انصاری (آغا جان)، شہریار کو کہتے ہیں کہ وہ زاویار کو کال کریں۔عاصمہ، زاویار کے باپ شہریار سے طلاق لے چکی تھیں۔وہ شہرین کو اپنے دوسرے شوہر عثمان کے انتقال اور مومنہ کی شادی کا بتاتی ہیں اور اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دیتی ہیں۔شہریار انصاری، زاویار کو فون کرتے ہیں اور زاویار کے بدتمیزی سے جواب دینے پر فون بند کردیتے ہیں۔میمونہ بیگم، شہرین کو بتاتی ہیں کہ آغا جان چاہتے ہیں کہ خولہ کی یا شہرین کی شادی زاویار سے ہوجائے۔زاویار تین سال پہلے کے اس منظر سے کسی طرح نکل نہیں پارہا تھا۔تین سال بعد آغا جان، زاویار کے سامنے تھے اور ان کے انداز بھی خاصے بدل گئے تھے، ان کے ساتھ شہریار اور عینی بھی تھے۔آغا جان، زاویار سے کہتے ہیں کہ گزرے دنوں کو بھول جاؤ اور اپنا دل صاف کرلو......لیکن وہ کہتا ہے کہ کچھ نقصان ناقابلِ تلافی ہوتے ہیں۔شیری کھانا لے کر آتی ہے تو اس کو بتاتی ہے درِمکنون، زارا بھابی کی کزن ہے اور وہ اس کے لیے ہاں کب کررہا ہے:، اور عینی جاکر اسے زاویار کے نام سے چھیڑیں گی۔عاصمہ، زاویار کو سمجھاتی ہیں کہ آغا جان کے لیے جو کدورت اس کے دل میں ہے وہ نکال دے لیکن زاویار کہتا ہے کہ وہ یہ نہیں کرسکتا۔عینی، زاویار کو بتاتی ہے کہ شہرین نے اسے دُرِمکنون سے ملوایا۔عاصمہ صبح، صبح اسپتال آجاتی ہیں زاویار کے پوچھنے پر وہ بتاتی ہیں کیونکہ تمہارے پاپا کی فلائٹ ہے اور وہ تم سے ملنے آئیں گے تو میں ان کے آنے سے پہلے یہاں سے نکل جاؤں، زاویار کہتا ہے کہ آپ اس انسان کے لیے اچھا کیسے سوچ سکتی ہیں جس نے مجھے، آپ سے جدا کردیا اس پر وہ کہتی ہیں کہ وہ پرانی بات تھی اب تم میرے ساتھ ہو اس لیے جب شہریار انصاری اور آغا جان آئے تو زاویار نے

اپنے منفی جذبات پر کسی حد تک قابو پالیا تھا۔ زاویار، طارق اور خولہ کی انگیجمنٹ میں جاتا ہے تو طارق اس کے اور آغا جان کے درمیان ہونے والی ناراضی پر بات کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ ان باتوں کو چھوڑو اور اپنی خوشی کو انجوائے کرو۔ عاصمہ، زاویار کو جلال انصاری کا فیصلہ ماننے کے لیے راضی کرنا چاہتی ہیں تو وہ بتاتا ہے کیونکہ طارق اپنی کسی ڈاکٹر کولیگ میں انٹرسٹڈ تھا اس لیے آغا جان نے طارق کو خولہ سے منسوب کر دیا حالانکہ شہریار انصاری، طارق سے عینی کا رشتہ کرنا چاہتے تھے یہ انکشاف سن کر وہ حیران رہ جاتی ہیں۔ عاصمہ، زاویار سے وعدہ لیتی ہیں کہ وہ ان کے اور اپنے پاپا کے کیے کی سزا خود کو نہیں دے گا تو زاویار کوشش کرنے کا کہتا ہے۔ آغا جان، شہرین کے ساتھ زوبی سے ملنے آتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ زاویار شادی کرے تو وہ کہتا ہے کہ میرے پاس آپ کے سوال کے جواب میں نہ کے سوا کچھ نہیں۔ زاویار، شہریار صاحب سے کہتا ہے کہ شیری کو اس کے نام پر نہ بٹھائیں اسے اس سے شادی نہیں کرنی ہے۔ جس پر اس کو شہرین کی طرف سے تھینکس کا میسج ملتا ہے تو اسے ایک اطمینان سا محسوس ہوتا ہے۔ زاویار اور اس کے دوستوں نے آج ایک اغوا شدہ لڑکی کو بازیاب کرایا تھا اس کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا تھا مگر اس کے گھر والے اسے قبول نہیں کر رہے تھے کہ کئی لڑکیوں کے سامنے اسے اغوا کیا گیا اب اگر وہ اس لڑکی (کلثوم) کو قبول کرلیں گے تو باقی چار لڑکیوں کی شادی میں مسئلہ ہوگا۔ زاویار، کلثوم کو یونیورسٹی کے گرلز ہاسٹل میں چھوڑتا ہے۔ نازیہ، عاصمہ کو بتاتی ہیں کہ دُرِ مکنون کی شادی عکرمہ سے ہو رہی ہے تو زاویار بہت اپ سیٹ ہو جاتا ہے۔ وہ ساحل سمندر پر آتا ہے تو کلثوم اسے فون کرتی ہے وہ فون سن کر ہاسٹل پہنچتا ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اس کی والدہ کی طبیعت خراب ہے اور وارڈن سرفراز کے منع کرنے کی وجہ سے جانے نہیں دے رہی تو زاویار اسے اسپتال لے جاتا ہے، کلثوم کی ماں اب کی شادی ایک چار بچوں کے باپ سے کرنا چاہتی ہے اور زاویار کو کہتی ہیں کہ وہ اسے یہ شادی کرنے پر راضی کرے۔ زاویار، اسما (آفس کی لڑکی) کے ذریعے دُرِمکنون سے بات کرتا ہے تو وہ زاویار کو درمکنون کے حوالے سے چھیڑتی ہے تو وہ اس کو بتاتا ہے کہ اس مہینے درمکنون کی شادی ہے وہ اس کی دوست ہے اور اس سے ناراض تھی تو وہ اس کو منانا چاہتا تھا۔ زاویار، اسما کو یہ کہہ کر بہلا دیتا ہے لیکن خود کو بہلانا اتنا ہی مشکل تھا۔ سرفراز، زاویار کو بتاتا ہے کہ بابر زمان کا پتا چل گیا ہے۔ تین سال پہلے اس کے باپ نے ایک لڑکی کے اس کی نجی جیل سے بازیاب ہونے پر اس پر کیس ہونے کی وجہ سے... بابر زمان کو... باہر بھیج دیا تھا اور اب وہ چند ہفتوں میں لاہور آنے والا ہے۔ زاویار لاہور جانے کا ارادہ باندھتا ہے تو سرفراز نے اسے تنبیہ کی۔ زاویار فون کر کے آغا جان سے دو شرطیں رکھتا ہے کہ اگر وہ اس کو اپنے کچھ کانٹیکٹس اور کیش دیں گے اور فیملی کو اس کے بارے میں نہیں بتائیں گے تو وہ لاہور آنے کے لیے تیار ہے اس پر آغا جان شیری سے شادی کا کہتے ہیں۔ زاویار، عاصمہ، مہران اور مومنہ کو بتاتا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے ابروڈ جانا چاہتا ہے اور اس سے پہلے وہ لاہور جائے گا کیونکہ پاپا اور آغا جان بہت بلا رہے ہیں۔ عاصمہ اسے جانے کی اجازت تو دیتی ہیں لیکن سوچتی ہیں کہ نہ جانے کیا سوچا ہے زاویار نے اپنے دل میں......

......................................اب آگے پڑھیے

قسط نمبر 23

اس موڑ سے شروع کریں پھر یہ زندگی
ہر شے جہاں حسین تھی ہم تم تھے اجنبی

لے کے چلے تھے ہم جنہیں جنت کے خواب تھے
پھولوں کے خواب تھے وہ محبت کے خواب تھے
لیکن کہاں ہیں ان میں وہ پہلے سی دلکشی
اس موڑ سے شروع کریں پھر یہ زندگی

شاید یہ وقت ہم سے کوئی چال چل گیا
رشتہ وفا کا اور ہی رنگوں میں ڈھل گیا
اشکوں کی چاندنی سے تھی بہتر وہ دھوپ ہی
اس موڑ سے شروع کریں پھر یہ زندگی

سرفراز کے ڈرائنگ روم میں ڈیک پر ہلکی آواز میں یہ گیت چل رہا تھا۔ زاویار نے گہری سانس بھرتے ہوئے گیت کے بولوں کو سنا تھا۔ آج سرفراز نے اسے اپنے گھر ڈنر پر بلا رکھا تھا۔ گوکہ اس نے لاکھ منع کرنا چاہا مگر سرفراز نے ایک نہ سنی۔ لہٰذا اس وقت وہ اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا سرفراز کے انتخاب سے لطف اندوز ہونے پر مجبور تھا۔

''کاش، واقعی اس موڑ سے زندگی شروع کی جاسکتی دُرِّمکنون۔ جب حقیقتاً زندگی حسین تھی اور تم اجنبی۔'' اس کے سینے میں جیسے درد سا اٹھا۔ وہ اس وقت جیسے درمکنون کے ''الوژن'' سے مخاطب تھا۔ معاً سرفراز اندر داخل ہوا۔

''آجاؤ زاویار۔ کھانا ریڈی ہے۔'' ٹی شرٹ اور جینز پر ایپرن پہنے سرفراز آداب میزبانی نبھا رہا تھا۔ زاویار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس کی تقلید میں ساتھ بنے ڈائننگ روم تک چلا آیا۔ وہ اس کے گھر پر پہلے بھی کئی بار آچکا تھا۔ مگر ہر بار کی طرح جھجک آج بھی تھی۔

''یہ تم کن چکروں میں پڑ گئے ہو سرفراز میں نے کہا بھی تھا کہ ڈنر وِنر نہیں کرنا مجھے۔ بس چائے ہی کافی تھی۔''

''اچھا......!'' جواباً سرفراز نے مسکراتے ہوئے ایپرن اتارا۔ ''تمہارے لیے اگر چائے کافی ہے تو پھر کافی کیا ہوتی ہوگی؟''

اس کی بذلہ سنجی کے آگے زاویار ہمیشہ ہی خاموش ہو جاتا تھا۔ اس دوران ملازم بقیہ ڈشز لاکر رکھتا گیا۔

''اچھا...... اچھا مجھے گھورنا تم بعد میں۔ پہلے ذرا یہ گرلڈ چکن ٹیسٹ کرو۔ جو میں نے خاص اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے، اسپیشلی تمہارے لیے۔ آفٹر آل تمہیں فیئر ویل جو دینی تھی۔ بلکہ یہ چاول بھی میں نے ہی کک کیے ہیں۔'' سرفراز حسب عادت بہت ریلیکس موڈ میں تھا۔ فخر سے اپنے کارنامے کا ذکر کیا۔ اس کی طرف گرلڈ چکن بڑھائی تو وہ ٹھٹک گیا۔

''تم نے بنائی ہے؟ خیریت؟ بھابی کہاں ہیں؟''

فطری طور پر خیال سرفراز کی اہلیہ کی طرف گیا۔

''نتاشا اپنے میکے چلی گئی ہے۔'' جواباً اس نے رسان سے کہا۔

''کیا مطلب چلی گئیں۔''

نہ جانے اسے سرفراز کے چہرے پر کیا نظر آیا تھا کہ پلیٹ میں چکن نکالتے، نکالتے اس نے رک کر پوچھا تھا۔

''مطلب یہ کہ چلی گئی ہے۔ اب اس بات کا اور کیا مطلب ہوسکتا ہے۔ اینی وے تم کھانا تو شروع کرو۔''

''کیا ناراض ہوکر گئی ہیں؟'' زاویار نے اس کے پُرسکون انداز پر حیرت میں گھرتے ہوئے پوچھا تو سرفراز اس کی پلیٹ میں چکن اور چاول ڈالنے لگا۔

''ہوں۔ کچھ ایسا ہی سمجھو۔''

''مگر کیوں۔ ایسا بھی کیا ہوگیا؟'' درحقیقت اسے تعجب ہوا تھا۔ نتاشا سے پہلے بھی کئی بار ملا تھا وہ۔ خاصی ہنس مکھ اور شوخ مزاج تھی وہ۔ سرفراز اور اس کی پسند کی شادی تھی اور دونوں میں بلا کی ذہنی ہم آہنگی تھی۔ اس کا یوں اچانک جانا زاویار کو حیران کر گیا اور متفکر بھی۔

''کوئی خاص بات نہیں یارا۔ بس یہ خواتین ذرا چھوٹے دل کی مالک ہوتی ہیں۔ اپنے شوہر کو کسی اور کے ساتھ شیئر کرہی نہیں سکتیں۔''

''مگر تم تو الگ رہتے ہو۔ تمہاری فیملی بھی یہاں نہیں ہے۔ پھر کس سے شیئر کرنا تھا انہوں نے تم کو؟''

''میری سیکنڈ وائف کے ساتھ۔'' سرفراز نے بڑے آرام سے دھماکا کیا تھا۔

''واٹ......؟ کیا تم نے دوسری شادی کر رکھی ہے؟'' زاویار بھونچکا سا رہ گیا۔
''نہیں، ابھی نہیں کی مگر کرنے کا ارادہ ہے۔'' سرفراز کا انداز ہنوز پُرسکون تھا۔
''مگر کس سے؟'' زاویار کے لہجے اور آنکھوں میں حیرت کے ساتھ، ساتھ بے یقینی بھی تھی۔
''کلثوم سے۔'' یہ دھماکا اور بھی زوردار تھا۔ زاویار کے تصور میں کلثوم در آئی۔ کہاں وہ لوئر مڈل کلاس واجبی سے نقوش والی سادہ سی لڑکی۔ اور کہاں یہ ایجوکیٹڈ اور ویل آف سرفراز۔ جس کی شخصیت اس کے خاندانی پس منظر کی طرح شاندار تھی۔
''کلثوم سے؟ آر یو میڈ سرفراز۔ یہ تمہیں اچانک کیا سوجھی؟''
''کیوں، کلثوم میں کیا برائی ہے؟'' جواباً سرفراز نے دوبدو سوال کر ڈالا تھا۔
''برائی کلثوم میں نہیں۔ مگر۔''
''مگر کیا زاویار۔ اگر برائی کلثوم میں نہیں تو کیا دوسری شادی کرنا برا ہے؟'' سرفراز کا ٹھنڈا لہجہ، قدرے روکھا تھا۔
''آف کورس ناٹ۔ مگر، مگر کوئی وجہ بھی تو ہو۔ آئی مین۔ تم اچھی بھلی خوشگوار زندگی گزار رہے ہو۔ تمہارا بیٹا ہے۔ پسند کی شادی ہے۔ بھابی کے ساتھ قابلِ رشک انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ اور کیا چاہیے؟'' زاویار اس نئی اطلاع پر بری طرح الجھ گیا تھا۔
''زندگی میں اگر ہم صرف یہ ہی سوچتے رہیں کہ ہمیں کیا چاہیے؟ ہمیں کیا چیز سکھ دے گی۔؟ ہمیں کس طرح سکون ملے گا۔؟ تو ایسے تو باقی جاندار بھی جی رہے ہیں میرے یار۔ جن کا سینٹرل فوکس پوائنٹ ہے ان کی اپنی ذات۔'' اس کے سوال پر اس نے کانٹا پلیٹ میں رکھ کر ساری توجہ اس کی جانب مبذول کر کے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔
''لیکن اگر ہم سب لوگ محض اسی طرح سوچتے رہے تو ہمارے اردگرد جینے والے دوسرے مجبور انسانوں کی فکر کون کرے گا جو اپنی زندگی سے ہارنے لگے ہیں؟'' سرفراز کا سوال بہت گہرا تھا۔
زاویار کے ذہن میں یکلخت کوئی الارم بجا۔
''کیا ہوا کلثوم کو؟'' وہ یک دم جیسے کسی نتیجے پر پہنچا تھا۔
سرفراز نے چند ثانیے خاموشی سے اس کے چہرے کو بغور دیکھا پھر بولا۔
''اس کے پیرنٹس نے جہاں اس کا رشتہ طے کیا وہ اس سے خوش نہیں تھی۔ لاسٹ ویک اس نے بہت ساری سلیپنگ پلز کھا کر خودکشی کی کوشش کی۔ جسے ہاسٹل وارڈن نے ناکام بنایا۔''
''مائی گاڈ۔'' اسے حقیقتاً شاک لگا تھا۔ ''اب کہاں ہے وہ؟''
''کل اسپتال سے ڈسچارج ہو گئی ہے وہ اور اب واپس ہاسٹل میں ہے۔''
''ہوں۔'' اس نے جیسے خود کو ہلکا محسوس کیا یہ جان کر۔
''تو کیا تم نے یہ فیصلہ اس کی ہمدردی میں کیا ہے؟'' کچھ دیر دونوں کے مابین خاموشی رہی پھر زاویار نے استفسار کیا۔
''یہی سمجھ لو۔'' سرفراز نے کندھے اچکائے۔
''تمہیں نہیں لگتا کہ یہ جذباتیت ہے۔''
''آف کورس ناٹ۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ میں financially sound ہوں۔ ایک وقت میں دو گھر افورڈ کر سکتا ہوں۔ اور پھر یہ سنت رسولؐ بھی ہے۔ اس میں کیا غلط ہے۔''
''بات غلط یا صحیح کی نہیں۔ حالات کی ہے۔'' زاویار کی سمجھ نہیں آیا اسے کیسے سمجھائے۔
''کیوں، کیا ہوا ہے میرے حالات کو؟'' سرفراز نے بھویں سکیڑیں۔

''اگر حالات سے تمہارا مطلب نتاشا کا گھر سے چلے جانا ہے تو اس معاملے میں ''وہ'' جذباتی ہو رہی ہے، میں نہیں۔'' وہ رکا۔

''دیکھو زاویار۔ ہمارے معاشرے میں کچھ تو قدرت کی طرف سے اور کچھ معاشی حالات کے باعث کنواری عورتوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسے میں اگر صاحب استطاعت مرد ایک سے زیادہ شادیاں کرلیں تو معاشرے میں پیدا ہونے والے بہت سے بگاڑ اور اخلاقی برائیوں کا قلع قمع کیا جا سکتا ہے۔ اسلام نے بھی دوسری شادی کی اجازت اسی ضرورت کے پیش نظر دی ہے۔'' وہ اپنی سوچ میں بہت راسخ تھا۔

''آج کے دور میں امت مسلمہ پر جس طرح جنگ مسلط کردی گئی ہے۔ آئے دن سیکڑوں عورتیں بیوہ یا بے سہارا ہو رہی ہیں۔ تمہیں نہیں لگتا کہ polygammy اس وقت کی ضرورت ہے۔ مگر ہمارے معاشرے کی خواتین کی تنگ دلی کی وجہ سے آج بہت سی دوسری عورتیں بے راہ روی کی طرف جانے پر مجبور کردی گئی ہیں۔'' سرفراز انتہائی سنجیدگی سے گویا تھا۔

زاویار کو اس کے چہرے پر تفکر اور صداقت نظر آئی تھی۔

''تمہاری بات اپنی جگہ درست سہی۔ مگر کلثوم کے لیے کیا ضروری ہے کہ تم ہی اپنے گھر کی قربانی دو۔ اس کے لیے کوئی اور متبادل شخص بھی تو ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ آئی مین۔ ذرا سوچو اگر بھابی نے واپس آنے کا فیصلہ نہ کیا تو تمہارے بیٹے کا کیا ہوگا۔ میں نے اپنی ماما کے بغیر زندگی گزاری ہے سرفراز۔ بروکن فیملی کا بچہ ہونا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔'' اسے سرفراز کی کسی بات سے اختلاف نہیں ہوا تھا مگر وہ اپنی زندگی کے تلخ تجربے کو بھی ذہن و دل سے نہیں نکال سکا تھا۔

''میں نتاشا کو چھوڑ نہیں رہا زاویار۔ وہ میری بیوی ہے اور پہلی محبت بھی۔ پھر وہ میرے بیٹے کی ماں ہے۔ بروکن فیملی نہیں ہوگی میری۔'' اس نے بھرپور طریقے سے اختلاف کیا تھا۔

''ان شاء اللہ۔ ایسا ہونا بھی نہیں چاہیے۔ مگر ابھی تم جذباتی ہو کر فیصلہ کر رہے ہو۔ کلثوم کے لیے کوئی اور رشتہ بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔''

''سوچا تھا اس پوائنٹ پر بھی۔ مگر کلثوم کے پیرنٹس کو جلدی ہے۔ وہ اس سے کسی بھی طرح کا تعلق رکھنا نہیں چاہتے۔ اور جلد از جلد اس کی ذمے داری سے سبکدوش ہونا چاہ رہے ہیں۔''

''کیا تم انٹرسٹڈ ہو اس میں۔'' یک دم زاویار کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ جسے اس نے فی الفور الفاظ دیے تھے۔

''نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے اسے کبھی غور سے دیکھا بھی نہیں۔ یوں بھی نتاشا کے ہوتے میرے دل میں کسی اور کی جگہ بننا مشکل ہے۔'' سرفراز نے گہری سانس بھری۔

''تو پھر مساوات کیسے کرو گے دو بیویوں کے مابین اور اگر برابری نہیں کر سکتے تو پلیز کلثوم کی زندگی میں کسی اور محبت کرنے والے پارٹنر کے آنے کی امید ختم مت کرو۔''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ہو سکتا ہے اس کی زندگی میں کوئی اور آجائے جو اسے سچا پیار دے سکے۔ اس کے لیے اپنے دل میں جگہ بنا سکے۔ جبکہ تمہارے ساتھ رہ کر تو وہ محض سمجھوتے کی زندگی گزارے گی اور سمجھوتے میں دل سے مان لینے کا element نہیں ہوتا۔'' کہتے، کہتے آخری جملے پر وہ کچھ کھو سا گیا۔ جس پر کچھ دیر کے لیے سرفراز چپ ہو کر کچھ سوچنے لگا تھا۔ پھر بولا۔

''تو کیا میں یہ سمجھوں کہ وہ ''کوئی اور'' تم ہو گے؟'' سرفراز نے ایسا سوال کیا تھا کہ وہ اپنی جگہ متحیر سا رہ گیا۔ استعجاب سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں؟'' بے یقینی سے استفسار کیا۔
''ہوں۔'' دوسری طرف حد درجے اطمینان تھا۔
''کہیں تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو؟''
''نہیں بالکل نہیں...... '' سرفراز نے گہری مسکراہٹ سمیت اسے دیکھا۔
''پھر تو تم شدید غلطی پر ہو۔''
اس نے سر جھٹک کر قطعیت سے کہا تھا۔
''کیوں۔ کہیں انوالوڈ ہو؟'' اِک تجاہلِ عارفانہ تھا سرفراز کے انداز میں۔
اس نے لاشعوری طور پر نظریں پلیٹ پر مرتکز کیں۔
''نہیں۔''
''انگیجڈ ہو؟''
''یہی سمجھ لو۔''
''دُرِ مکنون کے ساتھ صرف کمٹمنٹ تھی یا انگیجمنٹ؟'' اس بار سرفراز نے اسے جگہ سے گویا ہلا ڈالا تھا۔
''دُرِ مکنون کا یہاں کیا ذکر؟'' اس کے ماتھے پر یک دم شکنوں کا جال بن گیا۔
''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے؟'' سرفراز کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔
''آغا جان نے میرے لیے شہرین کو چن لیا ہے۔ پوری فیملی مع میری ماما کے سب ہی راضی ہیں۔ ہوسکتا ہے لاہور جانے کے کچھ عرصے بعد میں شادی کرلوں۔''
اس نے قصداً سرفراز کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہموار لہجے میں بتایا تھا۔ اور یوں لگا جیسے اس سے زیادہ وہ خود کو سمجھا رہا ہو۔
''اور جسے تم نے چنا اسے چھوڑنے کی وجہ؟''
سرفراز نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اس کے گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے معمول کے سے انداز میں سوال کیا۔ تو زاویار کے سست روی سے چلتے ہاتھ رک گئے۔ اس بار اس نے غیر معمولی سنجیدگی سے سرفراز کی طرف دیکھا۔
''تم مجھ سے کیا جاننا چاہتے ہو سرفراز؟''
''وہی جو تم نے آج تک چھپا کے رکھا ہے۔ جب ہم لاہور جم خانہ میں ساتھ اسکواش کھیلا کرتے تھے۔ تم ایسے نہیں تھے۔ مانا کے تند خو ہمیشہ کے ہو۔ مگر گزرے چند سالوں میں تو گویا تمہاری شخصیت ہی بدل گئی ہے۔ تم وہ زاویار ہی نہیں رہے جسے میں جانتا تھا۔''
''عمر کے ساتھ، ساتھ انسان میں میچورٹی آجاتی ہے۔ ہر شخص وقت کے ساتھ بدل جاتا ہے۔ its a natural phenomena کوئی مافوق الفطرت واقعہ نہیں ہے یہ۔''
''بدلنے میں اور شخصیت کے مسخ ہوجانے میں بڑا واضح فرق ہوتا ہے۔ تم محض بدلے نہیں ہو۔ ٹوٹ پھوٹ گئے ہو۔ اور نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ جیسے اس انتشار کی وجہ دُرِ مکنون ہے۔''
''یہ تم نہیں تمہارا پروفیشن بول رہا ہے۔ شک کرنے کی عادت ہوتی ہے تم لوگوں کو۔'' اس نے قصداً بے پروا انداز اپنایا۔
''اور اس شک کے ذریعے ہم سچ کی جس گہرائی تک جا پہنچتے ہیں۔ اس کا تو تمہیں اندازہ ہوگا ہی۔'' اس بار سرفراز کے لہجے میں عجیب سی پُراسراریت تھی۔ زاویار نے کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے اسے بغور دیکھا۔ اس

کے دماغ میں جیسے کوئی گھنٹی سی بجی۔
''کیا مطلب......آخر کس گہرائی تک رسائی حاصل کر لی ہے تم نے؟'' اس نے خود کو غیر متوقع خبر سننے کے لیے گویا تیار کیا اور کرسی کی پشت سے کمر لگا کر بیٹھ گیا۔

☆......☆......☆

پھر سب نے جہاں، جہاں آصف کے ملنے کا امکان تھا وہاں جا کر یا ملنے جلنے والوں کو فون کر کے باتوں باتوں میں اس کا پتا لگانے کی بہت کوشش کی۔ مگر اسے ملنا تھا نہ ملا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے زمین کھا گئی ہو یا آسمان نگل گیا ہے۔ ردا نے یونیورسٹی کے تمام فیلوز سے معلوم کر لیا تھا۔ امریکا آصف کی پھوپی اور کراچی میں موجود اس کے رشتے داروں سے بھی رابطہ کیا گیا مگر وہ کہیں موجود نہیں تھا۔
ردا کی تو جیسے دنیا ہی لٹ گئی تھی۔ مظفر صاحب کے کندھے کچھ اور جھک گئے۔ عکرمہ اور عبید نے تسلی اور دلاسے دیے مگر درحقیقت وہ اندر سے ٹوٹ گئے تھے۔ آصف کے رشتے کے لیے وہ بہت مشکل سے مانے تھے۔ بیٹی کی ضد اور بیوی کے جھکاؤ کے آگے انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔ آج جس طرح وہ بنا نشان اور پتے کے غائب ہوا۔ انہیں پچھتاووں نے مزید گھیر لیا تھا۔
''نہ جانے ابھی اور کتنی آزمائشیں ہیں اماں میرے نصیب میں۔'' وہ ماں کے پاس آ کر بیٹھے تو بہت دلگرفتہ تھے۔
''کبھی، کبھی دل چاہتا ہے۔ سب کچھ چھوڑ کر جنگلوں میں نکل جاؤں۔ آپ میرے لیے دعا کریں اماں کہ میرا مالک میری سزا میں کچھ تخفیف کر دے۔''
ان کی اداسی اماں کے دل پر تیر کی طرح لگی۔
''ایسا نہیں سوچتے مظفر۔ آزمائشیں آتی ہیں۔ انسان کے یقین کو مضبوط کرنے کے لیے۔ تم فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ۔'' اماں کے بوڑھے چہرے پر کرب کے آثار تھے مگر وہ بیٹے کو تسلی دے رہی تھیں۔
''بس فکر ہے تو یہ کہ آصف میاں جہاں بھی ہوں۔ خیریت سے ہوں۔''
''وہ خیریت سے ہی ہو گا اماں۔ لندن میں اس کا علاج ہو سکتا ہے اچھی طرح۔'' ان کا انداز تھکا، تھکا تھا۔
''تم سے کس نے کہا کہ وہ لندن گیا ہے۔'' اماں نے چونک کر انہیں دیکھا۔
''سائرہ نے آج اس کے کمرے کی چیزیں چیک کی تھیں۔ ایک بل نکلا ہے ٹریولنگ ایجنسی کا آصف کی دراز سے۔ وہاں فون کیا تو پتا چلا کہ وہ لندن چلا گیا ہے۔''
یہ خبر بہت اچانک اور تکلیف دہ تھی۔ اماں کو بہت شدید دھچکا لگا۔
''تو کیا وہ علاج کے لیے گیا ہے؟'' انہوں نے تحیر سے سوال کیا۔
''شاید۔'' مظفر صاحب کے لہجے میں تھکن تھی۔
''تو یہ بات وہ بتا کر بھی تو جا سکتا تھا پھر ردا اس کی بیوی ہے۔ وہ اسے بھی چھوڑ گیا یہاں۔'' اماں نے دل پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ ان کے سوال کے جواب میں مظفر صاحب کی معنی خیز خاموشی تھی۔
اس دوران عبید اور عکرمہ اندر کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ سائرہ شیرازی بھی ان کے پیچھے، پیچھے اندر آئیں۔
''سنا تم نے بچوں۔ یہ کیا، کیا آصف نے۔ ہائے ہائے میری معصوم بچی کو رول دیا اس نے۔'' اماں ان دونوں کو دیکھ کر یک دم رو پڑیں۔
''پلیز دادی۔ حوصلہ کریں۔ مت روئیں اس طرح۔ ہو سکتا ہے آصف کو کوئی ایمرجنسی ہو۔'' عکرمہ نے دادی کے کندھے پر بازو پھیلایا۔

''ایسی بھی کیا ایمرجنسی کہ وہ اپنی نو بیاہتا بیوی کو چھوڑ کر چلتا بنا۔ کم ذات کہیں کا۔ میری ردا نے کیا کیا نہیں کیا اس کے لیے۔ اس کی شادی کو کتنے مہینے گزر گئے۔ مجال ہے کبھی آصف کی خدمت میں ذرا سا بھی فرق آنے دیا ہو اس نے۔'' سائرہ غصے سے پھنکارنے لگی تھیں۔

ان کے سوال کا جواب کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔

''ہاں مگر یہ بھی شکر ہے کہ کم از کم ہمیں یہ تو پتا چل گیا کہ وہ گیا کہاں ہے۔ اب اسے ٹریس کرنا آسان ہوگا۔'' عکرمہ نے کہا تو سائرہ بیگم کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے ٹریس کرنے کی۔ اس رزیل، احسان فراموش کو اور میں اب ہرگز اپنی نازوں پالی بچی کی زندگی سے اسے کھیلنے نہیں دوں گی۔ وہ معذور احساسِ کمتری کا مارا یوں بھی میری بچی کو دے ہی کیا سکتا ہے سوائے دکھ کے۔ سن لیں آپ سب کان کھول کر اور ردا کو بھی سمجھا دیں کہ شیرازی ولا کے دروازے اس بے حمیت انسان کے لیے اس قدر آسانی سے نہیں کھلیں گے۔'' غصے وغضب سے فیصلہ کن انداز میں کہتی وہ پھنکارتی ہوئی کمرا چھوڑ گئی تھیں۔ ہر کوئی جہاں کا تہاں رہ گیا۔ کچھ دیر ان سب کے مابین خاموشی گونجتی رہی جسے دادی کی آواز نے توڑا۔

''مگر یہ کوئی مسئلے کا حل نہیں بیٹا۔ آخر کو آصف شوہر ہے ردا کا۔ اس کی زندگی کا ساتھی ہے۔'' وہ مظفر صاحب کی طرف دیکھ کر بولی تھیں۔

''ساتھی ساتھ نباہنے والا ہوتا ہے دادی۔ ایسے بیچ راستے میں چھوڑ جانے والا نہیں۔'' کافی دیر سے خاموش بیٹھے عبید جب بولے تو لہجے اور آنکھوں میں گہری سوچ کی چھاپ تھی۔

''کیا مطلب؟'' دادی متوحش سی پوچھنے لگیں۔

''مطلب یہ دادی کہ آصف کے اس اقدام نے اس کی زندگی میں ردا کی جگہ کا تعین کر دیا ہے بتا دیا ہے کہ اس کی کتنی اہمیت ہے۔ میں چچی جان سے صد فیصد متفق نہیں۔ مگر ان کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ آصف نے نہ صرف احسان فراموشی کی ہے۔ بلکہ اپنے اور ردا کے رشتے کے تقدس کو بھی ٹھوکر ماری ہے۔ اور ایسے شخص کے ہاتھوں میں اپنی بیٹی، بہن دیتے ہوئے ہمیں دس بار سوچنا چاہیے۔'' عبید اپنی سوچ میں بالکل واضح تھے۔

''ہاں مگر یہ معاملات ایسے چٹکیوں میں حل نہیں کیے جاسکتے۔ جب تک آصف سے بات نہ کر لی جائے ہمیں خود سے کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچنا چاہیے۔'' عکرمہ نے بھائی سے اختلاف کرتے ہوئے دادی اور چچا کی طرف دیکھا جو بے بسی سے سر جھکائے بیٹھے تھے۔

ان دونوں کے دکھ نے اسے اندر سے ضرب لگائی تھی۔ دوسری جانب اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ آصف ایسا بھی کر سکتا ہے۔ آخر محبت کی شادی تھی اور پچھلے کئی ماہ سے وہ اس کے ساتھ شیرازی ولا میں رہ رہا تھا۔ کبھی، کبھی وہ مایوسی کی آخری حد پر نظر آتا تھا۔ مگر وہ ایسے سب کو چھوڑ کر چلا جائے گا یہ اس کے سان وگمان میں بھی نہ تھا۔

گزرے چند ہفتوں سے ردا اور اس کے درمیان تلخ کلامی بڑھنے لگی تھی۔ حتیٰ کہ ان کے کمرے سے باہر آتی آصف کے چیخنے چلّانے کی آوازیں اب اوپر کے پورشن میں بھی سنائی دیتی تھیں۔

وہ جانتا تھا کہ آصف احساس بے بسی اور جھنجلاہٹ کے باعث روز بروز چڑچڑا ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی کمپنی نے چھ سات ماہ انتظار کے بعد بالآخر اسے ٹرمینیٹ کر دیا تھا۔

یہ جاب اس نے بہت محنتِ شاقہ کے بعد حاصل کی تھی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی مایوسی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جس کا اثر آصف کے اخلاقی معاملات اور گھر کے ماحول پر بہت منفی پڑا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عکرمہ نے اس کے لیے کسی دوسرے اسپیشلسٹ سے کنسلٹ کیا تھا۔ جو آصف کی ذہنی حالت کے پیشِ نظر کوئی دوسرا ٹریٹمنٹ منتخب

کر سکے کہ اچانک وہ یوں گھر چھوڑ گیا تھا۔
درحقیقت اوروں کی طرح عکرمہ بھی شاکڈ تھا۔ مگر وہ آصف کو ایسے جانے نہیں دے سکتا تھا۔ اسے ڈھونڈنا بہت ضروری تھا اس کے لیے۔

☆......☆......☆

زاویار کی خاموش نگاہیں سرفراز کے متین چہرے پر جمی تھیں جو الفاظ گویا تول رہا تھا۔
''تم کہو سرفراز میں سن رہا ہوں۔'' وہ خطرناک حد تک سنجیدہ تھا۔
''دیکھو زاویار۔ بابر زمان اور شوکت زمان بہت بارسوخ اور خطرناک لوگ ہیں۔ ان سے الجھنا تمہارے لیے بالکل ٹھیک نہیں۔ اور وہ بھی محض ایک کار کی خاطر۔''
زاویار کے چہرے پر فیصلہ کُن تاثرات تھے۔ گویا اس نے بہت کچھ سننے پر خود کو تیار کرلیا تھا۔ سرفراز نے فکرمندی سے کہا تو اس کی بھویں سکڑ گئیں۔
''جب اتنا جان چکے ہو تو پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ معاملہ محض ایک کار کا نہیں تھا۔'' اس کے انداز میں واضح طنز تھا۔ مگر وہ سرفراز کو شرمندہ نہیں کرسکا۔
''میں تمہارے پرسنل میٹرز کی جاسوسی نہیں کررہا تھا زاویار...... یہ ساری انفارمیشن مجھے میرے سورسز نے اس وقت دیں جب تمہارے کہنے پر میرے بندوں نے بابر زمان کو ٹریس کر کے مجھ سے رابطہ کیا۔ میرا یقین کرو۔'' وہ رسانیت سے بولا تھا۔ سچائی اس کے لہجے سے جھلک رہی تھی۔
زاویار نے گہری سانس بھر کر اس کی بات کو گویا دل ہی دل میں تولا۔ ان دونوں کے مابین پھر کچھ دیر خاموشی حائل رہی۔
''کیا وہ لڑکی ڈرِ مکنون تھی؟'' سرفراز کے سوال پر اس نے بے اختیار آنکھیں بند کرلی تھیں۔
وہ کچھ نہیں بولا تھا۔
''آئی ایم رئیلی سوری۔'' کچھ دیر بعد سرفراز کی آواز کمرے میں گونجی۔
''میں سمجھ سکتا ہوں زاویار کہ اس وقت تمہاری کیا فیلنگز ہیں مگر۔'' وہ کچھ کہتے، کہتے رکا تھا۔ جس پر زاویار نے آنکھیں کھول کر سیدھا اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
''نقصان کی تلافی میں مزید نقصان کرنا عقلمندی نہیں۔''
''مطلب؟'' وہ گویا چونکا۔
''مطلب یہ کہ جو کچھ ہوا۔ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں۔ وہ سب شاید اسی طرح ہونا تھا۔ تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا ہتھیار کے سامنے بے بس ہوجاتا۔ لہٰذا سب سے پہلے تو تم اپنے گلٹ سے باہر آؤ۔'' سرفراز کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ اس کے لہجے اور چہرے کے منفی تاثرات کو رسانیت سے نظرانداز کررہا تھا۔
''کیونکہ جب تک تم اس گلٹ سے باہر نہیں آؤ گے۔ انتقام کے جذبات تمہارے اندر کے غصے کو ابھارتے رہیں گے اور غصے میں ہمارا دماغ ایسے انزائمز ریلیز کرتا ہے جو ریزن اور لاجک کو برباد کردیتے ہیں۔''
''میں کسی سے انتقام نہیں لے رہا۔'' اس نے دفاعی انداز اختیار کیا۔ درحقیقت سرفراز کی معلومات اور اپنے متعلق اس کے اندازوں نے اسے متحیر کردیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا سرفراز اسے اتنی اچھی طرح سمجھتا ہوگا۔
''اور کسی سے نہ سہی۔ خود سے تو لے رہے ہو۔ کبھی دیکھا ہے خود کو غور سے۔ یوں لگتا ہے جیسے اپنے اوپر ہر خوشی کو حرام کرلیا ہے تم نے۔''
''یہ محض تمہارے مفروضات ہیں۔ ضروری نہیں کہ میرے بارے میں تمہارا ہر گمان درست ہو۔'' وہ تلخ لہجے

میں بولا تھا۔
''میں کسی گمان میں نہیں ہوں۔ شروع میں، میں حیران ہوتا تھا کہ تم اپنی کوالیفکیشن سے کم سیلری پر، کم پوسٹ پر کیوں راضی ہوئے۔ پھر رفتہ، رفتہ مجھے احساس ہوا کہ تمہیں خاص طور پر اغوا شدہ لڑکیوں کو بازیاب کرانے کی مہمات میں غیر معمولی دلچسپی ہے۔ چاہے اس کے لیے تمہیں اپنی جاب چھوڑ کر میری فرم کو جوائن ہی کیوں نہ کرنا پڑے اور اس لگاؤ کی وجہ مجھے تب سمجھ آئی جب مجھے بابر زمان سے متعلق معلومات حاصل ہوئیں۔'' سر فراز اعتماد سے گویا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے چپ سادھ گیا۔ ''اور اس سے تمہاری دشمنی کی وجہ بھی۔''
''مگر ان سب باتوں سے تم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ میں اس کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی کرنے جا رہا ہوں؟'' اس کا چہرہ تنا ہوا تھا۔
''یہ نتیجہ میں نے ان باتوں سے نہیں تمہارے مبہم رویے سے نکالا ہے۔'' اس نے واضح کیا تو زاویار اسے گہری نظر سے دیکھنے لگا۔
''دیکھو زاویار میں جانتا ہوں کہ یہاں انصاف نہ ملنے کی وجہ سے بہت سے لوگ مایوس ہو کر قانون کو خود ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ مگر میں نہیں چاہتا کہ تم بھی ان میں سے ایک بن جاؤ۔ آج اس وقت جگہ جگہ ہونے والی ٹارگٹ کلنگز کی وجہ محض سیاسی ہی نہیں ذاتی دشمنی بھی ہے۔ فرسٹریشن اور حسد بھی ہے۔ مذہبی عدم رواداری بھی ہے مگر ہمارا مشن ان تمام تعصبات اور ذاتی وجوہات سے بالاتر ہو کر محض لوگوں کی مدد کرنا ہے، قانون شکنی کرنا ہرگز نہیں۔''
''سر فراز واقعی ایک الگ ہی وژن بہت ہی مختلف بصیرت رکھنے والا شخص ہے۔ شاید ایسے ہی لوگوں نے مل کر ایک نظریاتی پاکستان کی بنیاد ڈالی ہوگی۔'' وہ دل ہی دل میں سوچے بنا نہ رہ سکا۔
''ضابطے کے مطابق بابر زمان پر کیس ہونا چاہیے اور وہ بھی متاثرہ فرد یا اس کے لواحقین کی طرف سے۔ تم نہ اس لڑکی کے ولی ہو اور نہ ہی رشتے دار۔ تم پر اس سے بدلہ لینے یا اسے کورٹ تک گھسیٹنے کا بظاہر کوئی قانونی حق نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی فرض ہے تمہارا۔''
''فرض تو تمہارا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کی طرف جن کو مختلف مسائل سے نکالنے کے لیے تم خود کو خطرے میں ڈال لیتے ہو۔ پھر وہ سب کیوں کرتے ہو تم؟'' اس نے لاجواب ہو کر سوال داغ دیا تھا۔
''انسانیت کے ناتے۔'' سر فراز نے بڑے سکون سے دو بدو کہا تھا۔ ''میں نے اپنا مشن بنایا ہے اسے۔ لیکن اس کے لیے میں قانون کو ہاتھ میں نہیں لیتا۔ لا اینڈ آرڈر سے بالاتر ہو کر کام نہیں کرتا۔''
''تو پھر اگر میں بھی انسانیت کے ناتے ایسا کرنا چاہتا ہوں تو اس میں کیا غلط ہے؟''
''یہی تو مسئلہ ہے زاویار کہ تم یہ سب محض انسانیت کے ناتے نہیں کرنا چاہتے۔ اب اس میں تمہاری personal grudge شامل ہو چکی ہے۔ ذاتی عناد اور غصہ شامل ہو چکا ہے۔''
''میں نہیں سمجھتا کہ ایسا کچھ ہے۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔
''آئی وش کہ ایسا ہی ہو۔'' سر فراز نے گہری سانس بھر کر چند ثانیے اسے دیکھا تھا۔
''بہر حال میرے سمجھانے کا غلط مطلب مت اخذ کرنا تم۔ میں دوست ہوں تمہارا۔ خیر خواہ ہوں۔ قانون کے مطابق چلنے کے لیے میں ہر طرح سے تمہاری سپورٹ کرنے کو تیار ہوں۔ لاہور میں میرے واقف تمہاری ہر طرح کی ہیلپ کریں گے۔ بس تم جذباتی اور عاقبت نا اندیش ہو کر فیصلے نہ کرنا۔'' سر فراز کا ناصحانہ لہجہ خلوص سے بھرپور تھا۔ زاویار متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ سر فراز کی سوچ بہت مثبت تھی وہ محض پُر امید نہیں۔ درحقیقت پُر یقین تھا۔ زاویار کے ذہن میں کھڑکیاں سی کھل گئی تھیں اس کی گفتگو سے۔ کھانے کے دوران بھی وہ اسے نصیحت کرنے سے

نہیں چوکا تھا۔ جسے زاویار نے خاموشی سے سنا اور پھر جانے کے قصد سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں چلوں گا اب۔''

''ابھی نہیں۔ پہلے سبز قہوہ پینا پڑے گا میرے ساتھ۔''

''پھر کبھی۔ ابھی کچھ کام ہے مجھے۔'' اس نے رسٹ واچ پر نظر دوڑائی۔

''اوکے۔ جیسے تمہاری خوشی۔'' اس کے فیصلہ کن انداز پر اسے گہری نظر سے دیکھتے ہوئے سرفراز بھی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"thanks a lot" زاویار کا لہجہ متشکر تھا۔

''کس لیے بھائی۔''

''ڈنر اور فکر دونوں کے لیے۔'' اس بار وہ شعوری کوشش کر کے مسکرایا تھا۔ سرفراز نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگالیا۔

''ایوری تھنگ فار یو یار۔'' الگ ہوتے ہوئے کندھا تھپکا۔ اس کے خلوص نے زاویار انصاری کو گویا خرید لیا تھا۔

'' I am honoured بہر حال اب چلتا ہوں۔'' لائٹر اور چابی وغیرہ اٹھا کر وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ آیا تھا۔

''تو پھر کل چلو گے میرے ساتھ کلثوم کے پیرنٹس سے بات کرنے۔'' سرفراز نے پورٹیکو میں رکتے ہوئے اس سے سوال کیا تھا۔ جو کار کا فرنٹ ڈور کھول کر اندر بیٹھ رہا تھا۔

اور وہ جو اپنے مسئلے میں کلثوم والے قصے کو بھول ہی گیا تھا۔ یک دم سرفراز کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر

کچھ سوچ کر بولا۔
''اگر تم یہ ملاقات کچھ دن کے لیے ملتوی کر دو تو میں کلثوم کے لیے تم سے بہتر پروپوزل کا انتظام کر سکتا ہوں۔'' اگنیشن میں چابی ڈالتے ہوئے وہ بولا تو سرفراز کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔
''میری خالہ کا میرج بیورو ہے۔ میں ان سے کنسلٹ کر کے جلد ہی تمہیں انفارم کروں گا۔ تم اس دوران بھابی سے patch up کرنے کی کوشش کرو۔''
''حکم دے رہے ہو مجھے۔''
''کبھی کبھی ناصح کو بھی نصیحت درکار ہوتی ہے۔ مشورہ سمجھو یا حکم۔ مرضی ہے تمہاری۔'' بہت سی تلخ اور دل کو بھاری کرنے والی سوچوں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے وہ سنجیدگی سے کہہ کر کار نکال لے گیا تھا۔
پیچھے کھڑے سرفراز نے گہری سانس بھر کر کچھ سوچا تھا اور پھر اس کی انگلیاں نتاشا کا نمبر پش کر رہی تھیں۔

☆......☆......☆

''کانچ کی طرح نازک نہ بنیں کہ جو چاہے چور، چور کرتا گزر جائے۔ خود کو مضبوط بنائیں، میں ہوں ناں آپ کے ساتھ۔''
''اور ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتوں سے تمہارا دل تنگ ہوتا ہے تو تم اپنے پروردگار کی تسبیح کرتے اور حمد کرتے رہو اور سجدہ کرنے والوں میں شامل رہو۔'' (سورۂ حجر ۹۸)
ایک طرف عکرمہ اور طاہرہ آنٹی کی آوازوں کی بازگشت تھی تو دوسری طرف مظفر انکل، دادی اور میمی خالہ کے چہروں پر لکھا دکھ تھا۔ جس نے اسے اپنے درد اور تذلیل سے ابھرنے میں بھرپور مدد دی۔
جب دادی...... عکرمہ کے کہنے پر اسے ساتھ لے کر اوپر آئیں وہ جیسے حلق تک احساسِ ذلت میں گھری بس آنسو بہائے جا رہی تھی اور تب اس کی نظر دادی پر پڑی تھی۔ جو اس صدمے سے جیسے ٹوٹ سی گئی تھیں مگر اسے تسلی دے رہی تھیں۔ پانی لا کر پلا رہی تھیں اور یہ وہ لمحہ تھا جس سے اسے خود سے یک دم شرم آئی۔ وہ بجائے اس کے کہ گھر والوں کے دکھ میں تسلی بنتی خود روئے جا رہی تھی۔ اس نے گلاس ان کے ہاتھ سے لے کر اپنے آنسو صاف کیے اور پھر وہی گلاس دادی کے ہونٹوں سے لگا دیا تھا۔
''سب ٹھیک ہو جائے گا دادی۔ آصف بھائی ان شاءاللہ واپس آ جائیں گے۔ آپ پریشان مت ہوں۔'' کچھ تھا اس کے لہجے میں دادی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر اسے سینے سے بھینچ لیا تھا انہوں نے۔
''اللہ تمہاری زبان مبارک کرے میری بچی۔'' دادی نے تڑپ کر جیسے دعا کی تھی اور اس لمحے اسے ادراک ہوا تھا کہ صرف خود اسے ہی نہیں۔ اس گھر میں اور بھی لوگ ہیں جنہیں تسلی اور دلاسے کی ضرورت ہے۔ جو اپنے دکھوں کے باعث ادھ موئے ہو گئے ہیں۔ جن کی بوڑھی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہیں۔
دادی اور مظفر انکل کا شمار ان ہی لوگوں میں تھا۔ جبکہ ردا اور سائرہ بیگم بھی ان حالات کے باعث بہت بری طرح متاثر ہوئی تھیں۔ زوہا آئی تو سیف اور ردا کی بہت ہمت بندھائی تھی اس نے۔ اسے اپنی خود غرضی پر شدید پشیمانی محسوس ہوئی۔
یہی وجہ تھی کہ پھر اس نے اپنے سارے آنسو محض تنہائی میں بہائے تھے۔ جن کا گواہ سوائے باری تعالیٰ کے کوئی نہ تھا۔ اور یوں وہ دن یوں ہی گزر گیا تھا۔

☆......☆......☆

''بیٹا تم سائرہ کی باتوں کو دل سے مت لگانا۔ وہ اس وقت پریشان ہے۔ ماں ہے وہ ردا کی۔ بیٹی کے دکھ نے

"میں تمہیں اچھا انسان سمجھتی تھی مگر تم تو تیسرے درجے کے چور نکلے۔" وہ دکھ سے چُور لہجے میں بولی تھی۔ "آئندہ مجھے کبھی نظر نہیں آنا جا کر کہہ دو اپنے خریداروں سے میں اب وہ پہلے والی ہالہ نہیں رہی جسے وہ آسانی سے شکار کرلیں۔" پہلی جیسی تو وہ واقعی نہیں رہی تھی۔ اس نے سوچا نہیں تھا کہ وہ کبھی اس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایسی بڑی، بڑی باتیں کہہ جائے گی مگر شاید یہ وہ سارا غم و غصہ تھا، وہ ساری نفرت تھی جو وہ اپنے دشمنوں سے کرتی آرہی تھی، وہ آج اس شخص پر انڈیل رہی تھی۔ جو اس کے نزدیک ان کا آلۂ کار تھا اور کس کامیابی سے اسے محبت کے دھوکے میں ڈال رہا تھا۔

☆☆☆

شامیں مزید اداس ہوگئی تھیں، اس کی پُر تجسس فطرت دم توڑ گئی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر بلا ضرورت گھومنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ مبادا اس سے سامنا ہو جائے۔ اب اس کی شامیں کھڑکی کے سامنے بیٹھے گزر جاتیں۔

اس دن بھی وہ کلینک سے چھٹی کیے باہر دھوپ میں بیٹھی تھی۔ موسم اگرچہ بدل چکا تھا مگر پھر بھی دھوپ میں بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔ آمنہ خالہ بھی اس کے پاس آ بیٹھی تھیں۔

"بہت عرصہ ہوگیا ہم نے آپس میں بات نہیں کی۔" اِدھر اُدھر کی کچھ باتوں کے بعد وہ بولی تھیں۔

"ہوں......" اس نے تائید کی واقعی عرصے سے وہ دونوں ساتھ رہتے ہوئے بھی اپنے، اپنے خول میں بند تھیں۔

"تو چلو پہل میں کرتی ہوں، ویسے بھی مجھے کچھ بوجھ ہلکے کرنے ہیں۔" وہ کھوئے، کھوئے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ ہالہ پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھی نہ جانے وہ کیا کہنے والی تھیں۔

"یہ پچیس سال پرانی بات ہے۔" وہ اسی کھوئے لہجے میں بولی تھیں۔ "جب میری اور میرے بھائی کی شادی ہوئی تھی۔ وٹے سٹے کی شادی، سب شادیوں کی طرح شروع میں تو سب کچھ ٹھیک رہا مگر پھر میری بھابی نے مسائل پیدا کرنے شروع کردیے۔ وہ خود تو میرے بھائی کے ساتھ مرضی کی زندگی گزار رہی تھی مگر میرے اور میرے شوہر کے درمیان فساد کا کوئی موقع جانے نہ دیتی۔ حالانکہ ہم دونوں ایک دوسرے سے سچی محبت کرتے تھے۔ ہمارا آپس میں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مگر ماں، بہن کے اکسانے پر میرے شوہر پہلے جھگڑا کرتے پھر معافیاں مانگتے...... میں اپنے بھائی سے شکایت کرتی کہ اپنی بیوی کو سمجھاؤ اسے روکو مگر وہ تو اپنی بیوی کے سامنے بالکل بے بس تھا۔ اس نے اس کے خلاف کبھی ایک انگلی تک نہیں اٹھائی۔ آخر کار روز، روز کے جھگڑے، فساد سے میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی۔ اور میرے بھائی نے کچھ بھی نہیں کیا۔ میں اس کے ہوتے مکمل طور پر لاچار اور بے بس تھی۔" اور ہالہ یہ سمجھتی کہ اس کا کوئی بھائی ہوتا تو وہ یوں برباد نہ ہوتی۔

"میں واپس اپنے بھائی کے گھر آگئی جہاں مجھے برباد کرنے والی راج کر رہی تھی۔ میرے بھائی کو فکر تھی تو اتنی کہ اس کی بیوی کا ایک چھوٹا سا بچہ ہے لہٰذا اس کے آرام میں کوئی خلل نہ پڑے۔ سال بھر بعد میری امی فوت ہوگئیں، میری بربادی ان کا سب سے بڑا دکھ بن گئی تھی۔ ان کے بعد میرے لیے ہر رشتہ ہر تعلق ختم ہوگیا۔ یہاں اس علاقے میں ٹیچر کی ضرورت تھی سو میں کسی کو بھی بتائے بغیر یہاں آگئی۔ صرف فائزہ یعنی تمہاری ماں کو پتا تھا کہ میں کہاں ہوں...... ہمارا آپس میں مسلسل رابطہ تھا۔ میں نے خود کو اس علاقے کے لوگوں کے لیے وقف کردیا۔ اب یہی میرے اپنے تھے پھر سالوں بعد ایک دن مجھے پتا چلا کوئی شہر سے آیا ہے مجھ سے ملنے کے لیے...... میں ڈر گئی، کون ہوسکتا ہے بھلا...... سوچا نہ ملوں لیکن آنے والا بہت ضدی تھا۔ مل کر رہا، شکل سے اسے نہ پہچاننے کے باوجود کسی تعارف کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ شاید اسی کو خون کی کشش کہتے ہیں۔ وہ خوب لمبا چوڑا ہوگیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اتنا بڑا ہوگیا کہ اس نے مجھے ڈھونڈ لیا۔ برسوں بعد کسی خون کے رشتے کو یوں سامنے

پا کر میں خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ میں نے روتے ہوئے اسے گلے سے لگالیا۔ میں سسک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ پھپھو آپ نے ہمیں کیوں چھوڑ دیا۔ کیا میری یاد بھی نہیں آئی۔'' وہ بار، بار ایک ہی سوال پوچھ رہا تھا۔

''اعزاز پھپھو کی جان میں نے تمہیں بہت یاد کیا۔'' اور یہی حقیقت بھی تھی ان گزرے سالوں میں ایک وہی تو تھا جس سے میں نفرت نہیں کر سکی تھی۔ برسوں بعد اسے دیکھ کر میری کیفیت ہی بدل گئی تھی۔ میں سب کچھ بھول گئی تھی۔ میں خوش تھی بہت خوش، وہ اپنی پھپھو کو نہیں بھولا تھا، مسلسل میری کھوج میں رہا تھا اور آج میرے سامنے کھڑا تھا...... ہم رو بھی رہے تھے اور ہنس بھی رہے تھے۔ میں اسے گھر لے آئی اور پھر جب وہ گیا تو اس وعدے کے ساتھ کہ وہ کسی کو میرے متعلق کچھ نہیں بتائے گا۔ وہ اکثر چھٹیوں میں میرے پاس آنے لگا تھا۔ میں بھی اس کا انتظار کرتی۔ وہ چاہتا تھا میں اس کے باپ کو معاف کر دوں۔ ''پھپھو وہ بہت یاد کرتے ہیں آپ کو آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' اس نے بتایا تھا مگر میں ماضی کا کوئی بھی دروازہ اب کھولنا نہیں چاہتی تھی، اب مجھے ان کی ضرورت نہیں تھی۔

ایک دن فائزہ کا فون آ گیا ڈاک خانے میں۔ وہ سخت مشکل میں تھی۔ تم لوگ خطرے میں تھے۔ اسے سب سے زیادہ تمہاری فکر تھی۔ اسے اپنی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ تمہارا نکاح کرنا چاہتی ہے اور یہ کہ میں اس کی مدد کروں کیونکہ اس کے پاس وقت بہت کم تھا۔ تب فوری طور پر جو نام میرے ذہن میں آیا وہ اعزاز کا تھا۔'' ہالہ جو بہت غور سے ان کی باتیں سن رہی تھیں چونکی تھی۔

''بس ایک وہی تھا جو مجھے تمہارے قابل لگا۔'' وہ کہہ رہی تھیں۔ ''اور ایک وہی تھا جس سے میں اپنی بات منوا سکتی تھی۔ تھوڑی پس و پیش کے بعد وہ راضی ہو گیا۔ اور یوں ایک رات تمہارا اس کے ساتھ نکاح ہو گیا۔'' ہالہ بالکل سُن ہو کر رہ گئی۔ کس قدر بے خبر تھی وہ اور آمنہ خالہ نے بھی اسے کچھ نہیں بتایا۔

''پھر فائزہ اس دنیا سے چلی گئی اور تم میرے پاس آ گئیں۔'' آمنہ خالہ کی آواز اسے خیالوں سے باہر لے آئی تمہاری حالت اس قدر خراب تھی کہ میں تم سے کچھ پوچھ سکی نہ بتا سکی۔ بعد میں تم نے خود ہی اپنے نکاح کا بتایا جس سے تم سخت بیزار تھیں، ناخوش تھیں۔ میں تو بالکل خاموش ہو گئی اگر میں یہ بتا دیتی کہ تمہارا نکاح اعزاز سے میں نے کروایا ہے تو تم مجھ سے بھی متنفر ہو جاتیں۔ یہاں سے کہیں اور چلی جاتیں جبکہ اس وقت تمہیں تسلی، ہمدردی اور حفاظت کی ضرورت تھی۔ وقت گزرتا گیا تم اسپتال جانے لگیں۔ ایک تمہارے آنے سے لوگوں کے بے شمار مسائل حل ہوئے تھے۔ پھر ایک دن اعزاز یہاں آ گیا، اسے نہ جانے کیسے پتا چلا تھا کہ تم میرے پاس ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ میں تمہیں اس کے ساتھ رخصت کر دوں...... مگر میں نے انکار کر دیا...... یہ نکاح ایک جلد بازی کا فیصلہ تھا۔ اس پر مزید سوچنے کی ضرورت تھی۔'' اچھا تو جب آمنہ خالہ گھنٹوں سوچ میں گم رہتیں اور باہر برف پر قدموں کے نشان ہوتے تب وہ یہاں آتا تھا اس نے حیرت سے سوچا تھا۔

''وہ بہت دفعہ میرے پاس آیا۔'' اس نے آمنہ خالہ کو کہتے سنا۔ ''مگر میں نے ہر دفعہ اسے مایوس کر دیا۔ میں جانتی تھی تم اس رشتے سے بیزار ہو۔ میری بھابی بھی تمہیں کبھی قبول نہ کرتی۔ خاص طور پر جب اسے پتا چلتا کہ یہ شادی میں نے کروائی ہے۔ وہ ایک نہایت... بدفطرت عورت ہے، بھائی کا گھر تباہ کرتے اسے کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا تو بیٹے کا گھر اجاڑنا اس کے لیے کیا مشکل تھا۔ تم پہلے ہی بہت تکلیف دیکھ چکی تھیں میں نہیں چاہتی تھی کہ تم دوبارہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ اور پھر شاید میں خود غرض بھی ہو گئی تھی۔'' انہوں نے جیسے کسی جرم کا اعتراف کیا تھا۔ ''اپنے لیے نہیں اس علاقے کے لوگوں کے لیے، جنہوں نے تمہارے روپ میں ایک مسیحا دیکھا تھا مجھے معلوم تھا اعزاز شادی کے بعد تمہیں یہاں نہیں رہنے دے گا۔ اپنے ساتھ لے جائے گا اور

اس علاقے کے لوگ ایک بار پھر ڈاکٹر، دوائی اور علاج سے محروم ہو جائیں گے۔ اپنی طرف سے میرا حساب کتاب مکمل تھا، اعزاز نے مجھ سے کوئی بحث نہیں کی تھی۔ نہ ہی کوئی شکایت تھی لیکن وہ مضطرب تھا ..... بے چین تھا کسی ان دیکھی آگ میں جل رہا تھا۔ پھر میں نے تمہاری آنکھوں میں اس کے لیے تڑپ دیکھی۔ میں نے تمہیں اس کی حفاظت، اس کی مضبوط پناہ گاہوں کا طلب گار دیکھا ہے۔ تمہیں گھنٹوں اس کے لیے روتے دیکھا۔ تم شاید نہ مانو مگر میں جان گئی تھی کہ تم اس کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہو۔''

''آمنہ خالہ آپ نے یہ سب کب دیکھا؟''

پوچھتے ہوئے اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ اسے یقین تھا وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

''تب مجھے لگا کہ میں غلط ہوں'' انہوں نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ ''مجھے یہ ساری جمع تفریق کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اصل فیصلہ تم دونوں کو کرنا چاہیے تھا۔ مجھے لگا میں تم دونوں کے بیچ وہی کردار ادا کر رہی ہوں جو میری بھابی نے میرے اور میرے شوہر کے بیچ ادا کیا تھا۔'' اسے آمنہ خالہ کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ زنجیر کی کوئی کڑی تھی جو مل کے نہیں دے رہی تھی۔ کچھ تو تھا جس سے وہ انجان تھی۔

''میں اعزاز سے کبھی نہیں ملی۔ پھر آپ یہ سب کیسے کہہ سکتی ہیں......'' اس کی آواز میں لرزش نمایاں تھی۔

''تم مل چکی ہو۔'' وہ بڑے یقین سے کہہ رہی تھیں۔

''نہیں، میں کبھی نہیں ملی۔'' وہ زور دے کر بولی تھی۔

''عمیر...... جسے تم عمیر کے نام سے جانتی ہو وہی تو اعزاز ہے، تمہارا شوہر اعزاز عمیر......'' وہ اگر کرسی پر نہ بیٹھی ہوتی تو گر بھی جاتی اس کا سر چکرا رہا تھا۔ ''وہ آج واپس جا رہا ہے۔'' آمنہ خالہ کی آواز پھر کہیں دور سے آ رہی تھی۔ ''میں نے اور پھر تم نے بھی اسے مایوس کر دیا ہے۔'' ہاں یہ سچ تھا آج تک اسے ہمیشہ دوسروں نے نقصان پہنچایا تھا۔ مگر آج وہ اپنے ہاتھوں

غزل حیات ما

آج دور سارے آزار ہو گئے
پھر سے پرانے خواب بیدار ہو گئے

دکھ سکھ کا ایک ریلا ہاتھوں سے بہہ گیا
تھاما قلم جو ہاتھ میں فن کار ہو گئے

نادانیوں کا اپنی کیا جب محاسبہ
تب، تب وفا کے راہی مسمار ہو گئے

خوش ہو کے یار میرا مجھ سے جدا ہوا
ہم بھی محبتوں کے دعوے دار ہو گئے

اِک مقصدِ حیات جو لے کر چلے تھے ہم
اس میں جنونیت کے طلبگار ہو گئے

بجز و انکسار کی کشتی میں بیٹھ کر
کوثر کئی مسافر سردار ہو گئے

از: کوثر خالد، جڑانوالہ

اپنا سب سے بڑا نقصان کر بیٹھی تھی۔ اس نے خود پر کھلنے والا خوشیوں کا ہر دروازہ بند کر ڈالا تھا۔ اس نے اعزاز عمیر جیسے شخص کو مایوس کر دیا تھا۔ اسے کھو دیا تھا۔ ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے۔

آمنہ خالہ کب کی خاموش ہو چکی تھیں۔ وہ بہت اداس لگ رہی تھیں۔

''مجھے لگتا ہے میں تم دونوں کی قصوروار ہوں......'' وہ بہت افسردگی سے کہہ رہی تھیں۔ مگر وہ اچھی طرح سے جانتی تھی قصوروار کون تھا اور سزا کس کو ملی ہے۔

''آج شاید آخری دفعہ وہ مجھ سے ملنے آئے گا۔ مگر تم اسے روک لینا ایک تم ہی اسے روک سکتی ہو کیونکہ میں جانتی ہوں وہ تم سے محبت کرتا ہے۔'' ہالہ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

''اچھا مجھے کسی کام سے کہیں جانا ہے۔'' وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ''میں رات تک ہی واپس آسکوں گی۔'' انہوں نے نہ صرف کہا بلکہ وہ چلی بھی

گئیں اور وہ انہیں بے بسی سے جاتا دیکھتی رہ گئی۔ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا وہ انہیں چاہنے کے باوجود روک نہیں سکی۔ انہیں گئے کافی دیر ہو گئی تھی مگر وہ اسی طرح گم صم بیٹھی تھی۔ اسے روکنا تو دور کی بات وہ اس کا سامنا بھی کیسے کرے گی۔ اپنا کہا ہر لفظ ہتھوڑے کی طرح دماغ پر لگ رہا تھا۔ کوئی شرمندگی سی شرمندگی تھی۔ ایک وہ تھا جو کاغذی رشتے کو تھامے ایک انجان لڑکی کی خاطر میلوں کا سفر طے کرتا یہاں تک آ پہنچا تھا۔ اپنا آرام، آسائش گھر سب کچھ چھوڑ کر وہ اس کی خاطر یہاں خوار ہو رہا تھا۔ اور ایک وہ تھی جس نے ناکافی ثبوتوں پر نہ صرف عدالت لگائی بلکہ فیصلہ بھی سنا دیا اس کے خلاف...... خود سے سخت شرم آ رہی تھی اسے سردی بڑھ گئی یا اسے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر اندر آ گئی تھی مگر آنے والے کے خیال سے جسم میں کپکپاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی مگر یوں لگتا تھا یہ دستک دروازے پر نہیں اس کے دل پر ہوئی تھی...... تبھی تو زور، زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے بمشکل اٹھ کر دروازہ کھولا تھا۔ وہ سامنے کھڑا تھا۔ چہرے پر مکمل سنجیدگی اور آنکھوں پر سن گلاسز لگائے...... مطلب آج اپنی باتونی آنکھوں کو دل کی کوئی بات بتانے کا موقع نہیں دے گا۔ وہ اندر آ گیا تھا۔

''تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا تھا۔

''کچھ الزامات ہیں جن کا جواب دینا ضروری تھا۔ اس لیے اس چور بہروپیے، اداکار کو آخری بار تھوڑی دیر کے لیے برداشت کرنا پڑے گا۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے سب کچھ کہہ رہا تھا۔

''وہ محض ایک غلط فہمی تھی...... مجھے خالہ نے سب بتا دیا ہے۔'' وہ کمزور سی آواز میں بولی تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ اپنی ناسمجھی اور جلد بازی پر شرمندہ ہے مگر ہمت نہیں تھی۔ اور اس نے ہالہ کی بات جیسے سنی ہی نہیں تھی۔ مطلب وہ سب جانتی ہے یا نہیں اب اسے کوئی پروا نہیں...... اس نے جو بھی فیصلے کر رکھے ہیں وہ اٹل ہیں۔

''کچھ باتیں ہیں جو صرف میں جانتا ہوں، وہ بتانا ضروری ہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''تم نے پوچھا تھا کہ تمہارے خط میرے پاس کیسے پہنچے؟'' خط ہاں وہی تو تھے سارے فساد کی جڑ...... وہ تو انہیں بھول ہی گئی تھی۔

''ایمن جسے تم نے یہ خط لکھے وہ میری بہن ہے۔'' وہ بڑے پُرسکون انداز میں بولا تھا۔ اسے حیران ہونا چاہیے تھا۔ مگر وہ نہیں تھی۔ سارے ایڈونچر اسی کے ساتھ ہونے تھے پھر حیرت کیسی......

''اچھا تو امی کی وہ جاننے والی...... ایمن جن کی رشتے دار تھی وہ آمنہ خالہ تھیں۔ اور دونوں نے ہی ان کے بارے میں زیادہ بات نہیں کی، کرتیں بھی کیسے......'' اب کڑیوں سے کڑیاں ملتی جا رہی تھیں۔

''اس خط میں تم نے دو باتیں کہی تھیں ایمن سے...... تمہیں خلع کے لیے ایمن کے بھائی کی مدد چاہیے تھی۔ اور دوسرے ایمن نے میرے حوالے سے تمہیں مستقبل کے کسی رشتے کی بھی...... پیشکش کی تھی۔ تم نے یہی بات اسے یاد کرائی تھی ناں......'' وہ جیسے اس کا نامۂ اعمال پڑھ کر سنا رہا تھا اور وہ سر جھکائے سن رہی تھی۔

''ہر دو صورتوں میں یہ خط میرے پاس ہی پہنچنا تھا اور پہنچا بھی۔ سارے خط اور تمہارا نام پتا پڑھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ دنیا واقعی گول ہے۔ تم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ جس شخص کے ساتھ تمہارا نکاح ہوا ہے، وہ تمہاری پیاری سہیلی کا بھائی ہے۔ نہ ہی میں نے کبھی سوچا تھا کہ تم میرے خلاف میری ہی بہن سے مدد مانگو گی۔ میں حیران بھی تھا اور ناراض بھی وہ بھی خود سے...... یہ میری غفلت تھی، بے پروائی تھی کہ میں نے تم سے زندگی کا اہم ترین رشتہ جوڑا اور پھر پلٹ کر تمہاری خبر بھی نہیں لی۔ تم پر کیا کچھ گزر گیا تم کس قدر تنہا اور مصیبت زدہ تھیں۔ تمہارا خط پڑھ کر اندازہ ہوا۔ تمہارے اس خط میں میرے لیے بیزاری اور بدگمانی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود تمہارے اور میرے بیچ موجود رشتے کا احساس پہلی بار میرے اندر جاگا تھا۔ میں نے ایمن کو

سب کچھ درست کرنے کی تسلی دی اور یہاں آن پہنچا...... میں نے سب سے پہلے آمنہ پھپھو سے رابطہ کیا مگر انہوں نے میری کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ میں بہت بددل بیٹھا ہوا تھا سوچا واپس چلا جاؤں...... لیکن پھر...... پھر ایک دن تمہیں دیکھ لیا۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔ ''اور تم پر آکر سارے راستے تمام ہوگئے۔ میں جانا چاہتا تھا مگر نہیں جاسکا۔'' وہ جیسے اپنی بے بسی کا اپنی ہار کا اعتراف کررہا تھا۔

''معلوم نہیں یہ ہمارے بیچ موجود رشتے کا کمال تھا یا پھر تم تھیں ہی اس قدر...... خیر چھوڑو پھپھو کی طرف سے مایوس ہوکر میں نے دوسرا طریقہ سوچا۔ تم پر اپنی حقیقت واضح کیے بغیر تمہیں اپنی طرف مائل کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ہر طرح کے چھچھورپن سے نفرت ہے مگر پھر بھی پہروں راستے میں کھڑے ہوکر تمہارا انتظار کیا۔ میں تمہیں کسی صورت کھونا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے ہر قیمت پر تمہیں اپنانا تھا۔ اس دوران ایک دفعہ جب میں واپس گھر گیا تو وہاں تمہارا دوسرا خط موجود تھا جو اتفاق سے ایمن سے پہلے مجھے مل گیا۔ میں اس خوف سے جلدی واپس آگیا کہ تم میری غیر موجودگی میں مایوس ہوکر کوئی ایسا قدم نہ اٹھالو جس پر ہمیں پچھتانا پڑے۔ میں نے تو اپنی طرف سے بھرپور کوشش کی مگر میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس کام میں ناکام رہا۔ میں تمہیں اپنی طرف مائل نہیں کرسکا، میری شخصیت، میری وارفتگی، میری محبت تمہارے دل میں جگہ نہیں بناسکی۔ تم نے اس دن جو کہا میں سمجھ گیا میں تمہیں کبھی متاثر نہیں کرسکوں گا اور یہ تو طے ہے کہ میں محبت کی خاطر عزتِ نفس کا سودا نہیں کروں گا...... محبت جھک کر نہیں کروں گا۔'' وہ اپنی ساری باتیں کہہ چکا تھا اور وہ ایک لفظ بھی نہیں کہہ پائی تھی۔ اس کے چہرے پر بیگانگی اور سختی بڑھ گئی تھی۔ سن گلاسز اسی طرح آنکھوں پر جمے تھے۔ وہ ڈر گئی تھی کیا وہ دوبارہ اس کی آنکھوں میں وہی محبت اور وارفتگی دیکھ پائے گی۔ کیا وہ اسے روک پائے گی؟ یا پھر آج اسے ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے کھودے گی۔ سوال بہت سارے تھے اور جواب کسی ایک کا بھی نہیں تھا اور وہ جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اس کے آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے بے بسی کی انتہا تھی۔

''بہت جلدی میں ہو گیا......؟'' وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے جب اس کے دروازے کی طرف تیزی سے بڑھتے دھندلے پڑتے وجود کو دیکھ رہی تھی تو باہر سے ایک اجنبی آواز سنائی دی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

''آپ......!'' وہ بس اتنا ہی کہہ پایا تھا۔

''کیوں حیرت ہورہی ہے مجھے دیکھ کر؟'' اس نے پھر وہی آواز سنی جو پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔

''آپ یہاں کیسے؟''

''تمہیں لگتا ہے کہ یہاں کا راستہ صرف تمہیں پتا ہے اور کوئی نہیں جانتا۔'' وہ جو کوئی بھی تھا اب دروازے میں آکھڑا ہوا۔ یہاں تک کہ ہالہ بھی اس شخص کو دیکھ رہی تھی۔

''جاؤ تم تو کہیں جارہے تھے ناں......'' انہوں نے ایک طرف ہوکر اسے راستہ دیا تھا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ شاید اس نے جانے کا ارادہ ملتوی کردیا تھا۔

''کیا میرا انتظار کررہے ہو؟ مت کرو، میں تو اپنی بہو کو لے کر ہی جاؤں گا۔'' اس شخص نے ایک اور بم پھوڑا تھا۔ یقیناً یہ عمیر کے والد تھے۔ آمنہ خالہ کے بڑے بھائی، وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ وہ اطمینان سے چلتے اندر آکر بیٹھ گئے تھے مگر بیٹا ابھی تک دروازے میں ہی جما کھڑا تھا۔

''مجھے آمنہ نے بلایا ہے، اس سے پہلے کہ تم سب مل کر پھر کوئی بڑا نقصان کر بیٹھتے۔ اس دفعہ اس نے عقلمندی کی مجھے سب کچھ بتادیا۔ جاؤ بیٹا میرے لیے چائے شائے کا بندوبست کرو۔ یہاں تو بہت سردی ہے۔'' وہ بیٹے سے بات کرکے اس کی طرف پلٹے تھے اس نے موقع غنیمت جانا اور فوراً کچن کی طرف دوڑ گئی۔ وہ باپ بیٹے کے بیچ میں نہیں آنا چاہتی تھی مگر اتنا ضرور جانتی تھی کہ آج وہ اس وقت اس کے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آئے تھے۔ جب سب کچھ ختم ہونے والا

ہی تھا، وہ جو کبھی نہ لوٹنے کے لیے جا رہا تھا رک گیا
تھا اور یہی چیز اسے تسلی دے رہی تھی۔ اس کے چائے
بنانے تک آمنہ خالہ بھی آگئی تھیں۔ دونوں بہن، بھائی
برسوں بعد مل رہے تھے۔ خوش بھی تھے اداس بھی......

”تم نے ہمارے ساتھ اچھا کیا نہ اپنے ساتھ۔“
وہ بہن سے کہہ رہے تھے۔

”ہم تمہارے مجرم تھے مگر سزا تم نے خود کو دی۔
جب تم یوں بغیر بتائے چلی آئیں تو جانتی ہو لوگوں نے
کیسی، کیسی باتیں کہیں تمہارے پیچھے۔ ہم تم جانتے تھے
تم کیوں گئیں مگر لوگ نہیں جانتے تھے اور کبھی، کبھی تو
ہمیں لگتا تھا کہ لوگ شاید ٹھیک ہی کہتے تھے۔“ آمنہ
خالہ سر جھکائے ان کی باتیں سن رہی تھیں۔

”بیٹا گھر والے جتنا بھی برا کر دیں جتنی بھی زیادتی
کر دیں مگر یوں کوئی گھر سے نکل کر اپنا نام خراب نہیں
کرتا۔ اگر تم بتا کر آتیں تو ہم تمہیں کبھی نہ روکتے، ہاں مگر
لوگوں کی باتوں کا کوئی تو جواب ہوتا ناں ہمارے
پاس...... اور کیا تم خدا سے بھی مایوس ہوگئی تھیں تم نے
اس کے فیصلے اور انصاف کا بھی انتظار نہیں کیا۔ اگر تم کچھ
دن رک جاتیں تو تمہیں معلوم ہو جاتا.. تکلیف دینے
والے خود بھی سکون کو ترستے ہیں۔ تمہارے جانے کے
کچھ ہی عرصے بعد تمہاری بھابی سیڑھیوں سے گر گئی۔ اور
اس دن کے بعد سے آج تک وہ صحیح طرح اپنے پیروں پر
کھڑی نہیں ہوسکی۔ اس کی زندگی اسپتالوں اور بستر پر
گزر رہی ہے وہ خود اس بات کو مانتی ہے کہ یہ تمہارے
ساتھ اس کی کی گئی زیادتیوں کا بدلہ ہے۔“ ان کی باتیں لمبی
ہوتی جا رہی تھیں ہالہ چپکے سے باہر آگئی تھی۔ ابھی تھوڑی
دیر پہلے وہ شدید جذباتی تناؤ کا شکار تھی۔ مگر اب اس کا
دل پُرسکون تھا۔ اسے لگ رہا تھا اب سب کچھ ٹھیک
ہو جائے گا۔ کم از کم آمنہ خالہ اب اکیلی نہیں رہیں گی۔
ان کے بھائی ان کے پاس آگئے تھے۔ ان کی ناراضی ختم
ہوگئی تھی۔ آمنہ خالہ نے اسے بچانے کے لیے اپنے بھائی
سے پرانی رنجشیں بھلا دی تھیں۔ انہیں بلا لیا تھا۔

آہٹ پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے
کھڑا تھا۔ اس نے بمشکل گردن موڑی تھی۔ اس کی
آنکھوں کا جادو پھر سے شروع ہو چکا تھا اور وہ جو اتنی دیر سے
اس سے بات کرنے کے لیے الفاظ جمع کر رہی تھی حواس کے
ساتھ، ساتھ وہ الفاظ بھی ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ وہ اسے
بہت غور سے دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں شکایت تھی۔ اس
پر اعتماد نہ کرنے کی، اسے نہ پہچاننے کی۔

”آپ اگر مجھے اپنے لائق نہیں سمجھتے اور چھوڑ کر
جانا چاہتے ہیں تو جا سکتے ہیں۔ میں بابا کو سمجھا لوں گی'
آپ ان کی فکر نہ کریں۔“ وہ اس کے سامنے اتنا ہی کہہ
پائی تھی۔ وہ اس کے لیے یہی کچھ کر سکتی تھی۔

”تمہارا کیا خیال ہے میں یہاں اتنی دور صرف
اس لیے آیا تھا کہ ایک دن تمہیں چھوڑ کر چلا
جاؤں......؟“ وہ اس سے سوال کر رہا تھا۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو آپ کا یہی ارادہ
تھا۔“ وہ خود کو کہنے سے روک نہیں پائی۔

”کوئی کہیں نہیں جا رہا تھا۔“ وہ پورے یقین سے
بولا تھا۔ اس کی نظروں سے بچنے کے لیے اس نے پلٹ
کر دیکھا، آمنہ خالہ برسوں سے جمع کیے آنسو بھائی کے
سامنے بہا رہی تھیں۔ اور وہ انہیں پونچھ رہے تھے۔ ان
کا سر محبت سے سہلا رہے تھے۔ اندر کا منظر بہت حسین
تھا۔ مگر باہر کا منظر حسین ترین تھا۔ وہ اس کے پاس تھا۔
اسے دیکھ رہا تھا۔ ہار جانے کے اعتراف اور پا لینے کی
خوشی کے ساتھ...... وہ مطمئن تھی، خوش تھی، وہ مان گیا تھا
لوٹ آیا تھا اور اب اسے کسی کا ڈر نہیں تھا۔ وہ اپنے محافظ
کی پناہ میں تھی...... مکمل طور پر محفوظ۔ اب اسے خدا سے
کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ اپنے رب کی شکر گزار تھی۔
جس نے اعزاز عمیر کو اس کے لیے منتخب کیا تھا۔ اس کی
محبت اس کے دل میں ڈالی تھی۔ اس کے دل کی طرح
باہر بھی بہار چار سو ڈیرے ڈال چکی تھی۔ ہوائیں خوشبو
سے لبریز تھیں اور ان میں خوشگوار ٹھنڈک تھی، دور
کہیں کوئی ندی گنگنا رہی تھی کسی جھرنے کسی آبشار کی
جلترنگ تھی، فضا گیت گا رہی تھی وادیِ گل جو بن پر تھی۔

❀❀❀

چولھے پر چائے کا پانی رکھ کر میں نے برآمدے کی دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالی..... ساڑھے چار بج چکے تھے۔ عمر آنے ہی والے تھے۔ دودھ پر ابال آ گیا تھا۔ چولھا بند کر کے پیالیاں ٹرے میں رکھیں جب تک چائے تیار ہوئی عمر آ گئے..... ساتھ ہی پڑوس والی بچی بھی آ گئی تھی۔
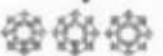
”آنٹی! قرآن خوانی شروع ہو چکی ہے صفیہ باجی آپ کو بلوا رہی ہیں۔“ یہ بچی دس منٹ کے اندر، اندر دوسرا چکر لگا چکی تھی۔

”جی، جی بیٹا..... ! آ رہی ہوں بس دو منٹ میں.....“ میں نے چائے کپوں میں نکالی۔ ساتھ ہی بسکٹ لیے اور کچن سے باہر آ گئی۔

”مریم، فارحہ..... دیکھو..... میں نے چائے نکال دی ہے..... عمر..... پلیز میں ذرا صدیقہ خالہ کے گھر جا رہی ہوں..... آج رسمِ قل ہے۔“ بچیوں کو چائے کا بتا کر

عمر کو بھی جانے کا بتایا۔

''اوہ......اچھا، اچھا ٹھیک ہے۔'' عمر نے جواب دیا۔

میں سر پر دوپٹا جماتے ہوئے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

ویسے سچ کہوں تو مجھے اس طرح سے جمع ہو کر یا مجمع لگا کر قرآن پاک پڑھنا کبھی ٹھیک نہیں لگا...... چلی تو جاتی تھی مگر......اصل میں میرا تعلق معاشرے کے اس طبقے سے ہے جو سفید پوش اور متوسط طبقہ کہلاتا ہے۔ ان گھرانوں میں وسائل نہ ہوتے ہوئے بھی صرف محلے داری اور دکھاوے کے لیے لوگ...... چھوٹی، چھوٹی تقاریب ضرور کرتے ہیں...... اکثر قرآن خوانی اور محافلِ میلاد کا اہتمام کرتے ہیں، نعوذ باللہ میں قرآن خوانی یا محافل کے خلاف ہر گز نہیں...... لیکن خلاف ہوں تو ایسی متبرک اور بابرکت محافل کی بے ادبی کی جہاں ثواب کا مقصد تو برائے نام رہ جاتا ہے۔ جہاں پر کپڑوں کی نمائش، حالاتِ حاضرہ سے لے کر ٹی وی اور شوبز کے معاملات پر تبصرہ یا پھر آپس میں...... ساس اور نندوں کی شکایتیں، بہوؤں کی شکایتیں...... شوہروں کی سرد مہری اور بس بھی، کی ٹھاٹھا ہوتا ہے۔ قرآن پاک پڑھ کر سب اپنی باتوں میں لگ جاتے ہیں۔ میرے خیال میں تو مناسب اور سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے گھر میں رہ کر قرآن پاک کا ایک سپارہ بڑی توجہ، دلجمعی اور خضوع و خشوع کے ساتھ دنیا داری کی لغویات سے بالاتر ہو کر پڑھیں نہ کہ محلے بھر کی درجن بھر خواتین کو جمع کر کے چار گھنٹے میں بمشکل ایک قرآن پاک ختم کروائیں اور جب آخر میں دیکھو تو پچاس فیصد خواتین کے ہاتھوں اور پیروں پر نیل پالش چمکتی دمکتی دکھائی دے...... چہرے پر میک اپ کی دبیز تہ، فیشن کے نام پر چست اور اسکن فٹنگ لباس جسے دیکھ کر ہماری اپنی سانسیں رکنے لگیں۔

یہی وجہ تھی کہ محلے سے جب بھی مجھے قرآن خوانی کا بلاوا آتا میں وہاں جانے کے بجائے اپنے الحمدللہ ہمیشہ ہی پہلے سے پڑھے قرآن کریم کے کچھ پارے بطور ہدیہ دے دیتی...... کبھی، کبھی تو پورا پورا قرآن دے دیتی۔ شکر الحمدللہ کے نوعمری سے ہی تلاوتِ کلام پاک کی عادت ہے۔ اصل بات اپنے لیے ثواب حاصل کرنا تھا...... سو ضروری نہیں کہ با جماعت، شور شرابے اور باتوں کے درمیان وہ ثواب حاصل کیا جائے۔ یہ میرا اپنا ذاتی خیال تھا۔ اور میری اس بات سے عمر بھی بہت خوش ہوتے، ان کے خیالات بھی بالکل میری طرح تھے۔ میری شادی کو اٹھائیس سال ہو چکے تھے۔ ایک بیٹا اور تین بیٹیاں...... سب سے بڑا بیٹا عثمان پھر تین بیٹیاں، مریم، ملیحہ اور منال۔ الحمدللہ چاروں بچے شادی شدہ اور بہترین زندگی گزار رہے تھے۔

عمر ایک کمپنی میں ملازم تھے۔ بے شک بہت محنت اور مشقت کے بعد اس مقام تک پہنچے تھے مگر ان کو محنت کا صلہ اچھی اولاد اور اچھی زندگی کی صورت میں الحمدللہ مل گیا تھا۔ وہیں میں بھی خود کو خوش نصیب تصور کرتی تھی۔ میرے تینوں داماد اور بہو بھی لاکھوں میں ایک تھیں۔ شکر تھا کہ بہت اچھی اور آئیڈیل زندگی تھی ہماری...... جہاں دنیاوی جھمیلے نہ تھے وہیں دین کی جانب بھی رجحان تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ عمر، بچوں اور میری کبھی کوئی نماز قضا ہوئی ہو۔ خدا ترسی، مستحقین کی مدد اور دیگر کاموں میں بھی ہر ممکن بھرپور حصہ ڈالتے۔ نواسے، نواسیاں، پوتے، پوتیاں بھی الحمدللہ ہمارے موجود تھے۔ یعنی کہ اللہ پاک کی نعمتوں، عنایات سے مستفیض بھی ہو رہے تھے تب ہی اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا بھی نہیں بھولتے تھے۔

میں شادی ہو کر اس گھر میں آئی تھی۔ تب عمر کے والدین حیات تھے۔ دو بہنیں جو شادی شدہ تھیں۔ اس وقت حالات تھوڑے مشکل تھے۔ عمر کی نئی، نئی جاب لگی تھی اور عمر کے والد پرائیویٹ کمپنی سے ریٹائرڈ تھے سو اتنا کچھ ملا بھی نہیں تھا...... بہر حال ہم سب لوگ توکل کرنے والے لوگ تھے۔ اس لیے ہر قسم کے حالات کو ہنس کر مل جل کر وقت گزر ہی جاتا ہے۔ اچھی بری یادیں، کچھ تلخ تو کبھی شیریں تجربات دے کر ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔

میری عادت شروع سے ہی ایسی تھی کہ مجھے زیادہ گھومنا پھرنا، ایک دوسرے کے گھروں میں وقت بے وقت آنا جانا، ٹوہ لینا، تجسس سے لوگوں کے حالات

جاننا...... محلے کی خبریں رکھنا اور پھر نمک مرچ لگا کر آگے بڑھا دینا...... یہ سب بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اپنے گھر میں، اپنے بچوں اور شوہر کی ذمے داریوں میں بھی سارا دن گزر جاتا...... اماں، ابا کے انتقال کے بعد تو اور زیادہ مصروف ہو گئی...... عمر کی جاب شروع سے ہی ٹف رہی...... اس لیے گھر کی مکمل ذمے داری مع بچوں میں مجھ پر ہی تھی...... کبھی محلے میں شادی ہوتی تب عمر کی تاکید ہوتی کہ جانا ہے...... تو ان کے ساتھ ہی جاتی...... یا پھر خدا نخواستہ کوئی موت ہوئی تو صرف تدفین سے پہلے پُرسے کے لیے اس گھر جاتی لواحقین سے تعزیت کر کے لوٹ آتی اور پھر...... سوئم، دسواں، بیسواں، چالیسواں اور برسی کے نام پر ہونے والی دعوتوں میں جانے کے بجائے گھر بیٹھے ہدیے کے طور پر سپارے ضرور دے دیتی۔ میرے خیال میں چند سپارے پڑھ کر ایک پلیٹ.. بریانی کھا کر جو ثواب ملنا ہے...... وہ گھر میں بنی دال کھا کر بھی مل جاتا ہے۔ ہاں ایسے گھرانوں کی ضروریات کا خیال ہم دونوں میاں، بیوی ضرور رکھتے۔ اللہ سے اپنی عبادت قبول کرنے کی دعا ضرور مانگتی کیونکہ وہی اجر دینے والا ہے۔ ہماری نیتوں کو جاننے والا، ہمارے دل میں پلنے والے اچھے برے، خیالات کا علم رکھنے والا۔

میں نے اٹھائیس سالہ شادی شدہ زندگی اس محلے میں گزاری تھی۔ سارے محلے میں مجھے صدیقہ خالہ اچھی لگتی تھیں جس وقت میری شادی ہوئی اس وقت بھی تقریباً چالیس، بیالیس سال کی ہوں گی۔ ان کی تین بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ میری شادی کے وقت ان کی دو بیٹیوں کی شادی اکٹھی ہوئی تھیں۔ محلے کی واحد خاتون تھیں۔ جنہوں نے کبھی کسی کی برائی نہیں کی۔ شفیق، حلیم اور محبت کرنے والی...... ہر ایک کے دکھ درد میں سب سے آگے، آگے پیش پیش ہونے والی...... حالانکہ شوہر کی موت کے بعد انہوں نے بہت نا مساعد حالات دیکھے تھے۔ اس کے باوجود ہمت، حوصلے اور شرافت سے انہوں نے نہ صرف بچوں کی اچھی تربیت کی بلکہ کسی سے مدد کے نام پر ایک دھیلا بھی لینا گوارا نہیں کیا۔ گھر ان کا ذاتی تھا اور صدیقہ خالہ کے نام پر بھی تھا۔ وہ تو اللہ نے ان پر ایسا کرم کیا کہ شوہر نے کچھ بڑے پرائز بونڈز رکھے تھے جو ایک کے بعد ایک نکلتے چلے گئے اور صدیقہ خالہ نے ان پیسوں سے گھر بنوا لیا۔ اور کچھ بچوں کے لیے بھی رکھ لیا۔ سستا زمانہ تھا اس لیے تھوڑا پیسہ بھی زیادہ محسوس ہوتا تھا...... پھر یہاں تو اللہ کے کرم سے اچھی خاصی معقول رقم ہاتھ آ گئی تھی۔ کچھ پیسہ بینک میں رکھوا دیا کہ آگے کام آئے گا۔

جب مجھے پتا چلا کہ میں بھی بہت خوش ہوئی...... مجھے ان سے بات کر کے ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔ خاص پڑھی لکھی خاتون نہیں تھیں مگر دینی معلومات غضب کی تھیں...... اکثر میں ان سے باتیں کر کے اپنے علم میں بھی اضافہ کرتی...... دن ماہ و سال میں بدلتے چلے گئے۔ میں اپنے بچوں اور گھر والوں میں مصروف...... صدیقہ خالہ اپنی ذمے داریاں پوری کرنی میں جت گئیں۔ ان کے سارے بچے شادی شدہ ہو گئے۔ بڑی بیٹیوں کے تو بچے میرے بچوں جیسے تھے۔ باقی بچوں کی اولادیں بھی جوان ہو گئی تھیں...... کچھ شادی شدہ بھی ہو گئے۔ اب ان کے حالات بھی خاصے بہتر تھے۔ دونوں بیٹے اچھی جگہ جاب کرتے، بہوئیں بھی اچھی اور خدمت گزار تھیں۔ پوتے، پوتیاں، بہوئیں، بیٹے، نواسے، نواسیاں، بیٹیاں داماد۔

”ماشاء اللہ خالہ آپ کے گھر میں تو خوب رونق لگی رہتی ہے۔ بڑی خوش نصیب ہیں آپ تو...... کتنا اچھا ماحول ہے آپ کے گھر کا...... ماشاء اللہ بہت اچھی تربیت دی ہے آپ نے اپنے بچوں کو......“ کبھی، کبھی میں رشک سے بے ساختہ کہہ اٹھتی تو صدیقہ خالہ زیرِلب مسکراتیں، ان کے چہرے پر اطمینان اور آسودگی پھیل جاتی...... تشکر کے جذبات ابھر آتے۔

”الحمد للہ، الحمد للہ...... سچ کہہ رہی ہو بیٹی! مجھے پوری امید ہے میں سکون سے مروں گی......“

”اللہ نہ کرے خالہ۔“ بے ساختہ ہول کر ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی۔

”ارے پگلی......! اس میں گھبرانے کی کون سی بات ہے میں نے کون سا آبِ حیات پی رکھا ہے کہ مرنا ہی نہیں ہے۔ آج نہیں تو کل سب کو ہی یہ ذائقہ چکھنا ہے۔ کسی کو

جلد کسی کو دیر...... مگر سب کو لوٹ کر اس کے حضور پیش ہونا ہے...... بہتر یہ ہے کہ انسان وہاں کے لیے سودا خرید لے...... دنیاوی سودا سلف یہیں رہ جانا ہے...... اصل تو وہاں کی تیاری کرنا ہے جہاں ہمیں ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے رہنا ہے...... اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم کیسی تیاری کریں، اچھی یا بری، صاف ستھرا، کھرا اور سچا مال خریدیں یا گلا سڑا، خراب، گندا مال اعمال کی صورت اپنی ان پوٹلیوں میں باندھ دیں کہ جن پوٹلیوں کو اٹھا کر آخری سفر پر روانہ ہونا ہے۔'' ان کی اتنی گہری بات پر میں ان کا منہ تکنے لگی۔ واقعی خالہ نے کتنی گہری بات کی تھی۔ معقول اور مدلل۔

''جی خالہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ......'' بس میں نے سر ہلا کر اُن کی ہاں میں ہاں ملائی۔ آج بھی وہ میرے پاس پچھلے آدھے گھنٹے سے آ بیٹھی تھیں۔

''اچھا بٹی......! اب چلتی ہوں، آج نبیلہ نے آنا ہے، رات کے کھانے پر۔ کہہ رہی تھی اماں سوجی کا حلوا آپ کے ہاتھوں کا کھاؤں گی...... ابرار گیا تھا سوجی اور میوہ جات لینے...... آ گیا ہوگا...... حلوا بنا کر تمہیں بھی بھیجوں گی......'' انہوں نے اٹھتے ہوئے پُرمحبت لہجے میں کہا اور میرا ہاتھ تھام کر مسکرائیں۔

''جی، جی خالہ ضرور......'' میں بھی انہیں خدا حافظ کہنے دروازے تک آئی۔ رات کو پلیٹ بھر کر خشک میوے اور اصلی گھی سے بنا گرما گرم سوجی کا حلوا آ گیا۔

''بھئی مزہ آ گیا بیگم...... سچ ہے کہ بوڑھے ہاتھوں میں جو لذت ہوتی ہے کیا کہنے۔'' ایک چمچ لیتے ہی عمر نے سر دھنتے ہوئے تعریف کر ڈالی۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ...... آپ مجھے بھی بوڑھوں میں شامل کرنے لگے۔'' میں نے مسکرا کر مزاحیہ انداز میں ان کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاہاہا...... لو بھئی! تم تو چور کی داڑھی میں تنکا والی بات کر رہی ہو......''

''نہیں بھئی بالکل بھی نہیں...... کس نے کہا کہ مما بوڑھی ہیں۔'' فارحہ نے پشت سے آ کر مجھے کاندھوں سے تھام کر میرے سر پر اپنی ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے لاڈ سے کہا۔

''واہ جی واہ! بڑی تو بڑی بی چھوٹی بھی سبحان اللہ......'' عمر نے حلوے کی پلیٹ میری جانب بڑھاتے ہوئے پھر سے قہقہہ لگایا۔

''آج تو بڑے محاورے سوجھ رہے ہیں پاپا۔'' اسی وقت عثمان بھی آ گیا اور مسکراتے ہوئے میرے برابر میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''یہ پوچھ لو...... یہ سا ہی بہو سے ہی۔'' عمر مسکرائے۔

تین دن تک صدیقہ خالہ نہیں آئیں...... نہ آتے جاتے گلی میں نظر آئیں...... پتا چلا کہ موسم کی تبدیلی کی وجہ سے فلو میں مبتلا ہیں۔

''چلو...... شام کو دیکھ کر آؤں گی صدیقہ خالہ کو میں......'' دوپہر کے کھانے پر مجھے عثمان نے بتایا کہ مسجد میں صدیقہ خالہ کے پوتے نے بتایا تھا کہ دادو کی طبیعت ٹھیک نہیں...... تب ہی میں نے سوچا کہ شام کو مزاج پرسی کر آؤں گی۔ لیکن...... ابھی...... ہمارا کھانا ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ...... صدیقہ خالہ کی موت کی خبر آ گئی۔

''اُف خدایا...... یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے...... اچھی بھلی تو تھیں وہ......'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ اللہ کے فیصلوں میں ''کیسے'' ''کیوں'' کیا کا تو ذکر ہی نہیں ہے۔ کُن تو کُن بس...... کوئی بات، حیل و حجت کی کوئی گنجائش بھی باقی نہیں رہ جاتی...... مگر میرا دل یہ ماننے پر تیار نہیں ہو رہا تھا۔ کبھی کوئی بیماری نہیں ہوئی۔ آج بھی سارے کام کرتیں، مارکیٹ جاتیں...... بچوں کو سنبھالتیں...... اتنی ایکٹو خاتون تھیں...... انا للہ وانا الیہ راجعون......'' میں کہتے ہوئے بے ساختہ رو پڑی۔ ایک انسیت...... ایک لگاؤ اور محبت ہو گئی تھی مجھے ان کی ذات سے...... ان کی نصیحتیں پلو میں باندھ لیتی تھی۔ ان کی ہر بات اچھی لگتی تھی۔ آخر وہ دعا دینے والے ہاتھ، وہ ہر وقت میرے لیے اچھی، اچھی باتیں کرنے والے لب جامد تھے...... وہ ہاتھ، بے جان پڑے تھے...... میں فوراً ہی صدیقہ خالہ کے گھر کی طرف بھاگی۔ سارا محلہ تقریباً جمع ہو گیا تھا۔ ان کے اپنے بچے اور ان کے بچے...... تھوڑی ہی دیر میں گھر میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ محلے والوں کے ساتھ مل کر عثمان نے ان کے گھر کے باہر شامیانہ لگوایا تا کہ لوگ آ کر بیٹھ سکیں۔ شام تک لوگوں کا تانتا بندھ گیا ہر

کوئی ان کی تعریف کر رہا تھا، ان کے لیے دعا گو تھا۔ وہ ہر دل عزیز تھیں، محلے کے ہر گھر میں آنا جانا تھا۔ اس لیے ہر آنکھ اشکبار تھی۔ انسان یونہی خاموشی سے چلا جاتا ہے۔ اس کا عمل ، ہی اس کے کام آتا ہے۔ آج ہر زبان پر ان کی مغفرت کی دعائیں تھیں۔ عمر آئے وہ بھی گلی میں رش دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ ان کو بھی صدیقہ خالہ کی موت کا بہت صدمہ تھا، وہ جانتے تھے محلے کی واحد شخصیت تھیں جو مجھے دل سے پسند تھیں۔

بہر حال صدیقہ خالہ کی آخری رسومات ادا ہو گئیں...... ان کی بیٹیاں تو بیٹیاں ان کی بہوؤں کا صدمے سے حال برا تھا۔ دامادوں اور بیٹوں کی آنکھیں بھی مسلسل برس رہی تھیں۔ صدیقہ خالہ کی نمازِ جنازہ مغرب میں ادا کی گئی۔ کسی سمدھن کی جانب سے بریانی کی دیگیں آئی تھیں جو تدفین کے بعد لوگوں کو کھلانے کے لیے تھیں۔ میرا دل ویسے بھی بہت برا ہو رہا تھا۔ کھانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری بیٹیاں اور بہویں بھی میرے ساتھ ہی تھیں۔ ادھر جنازے کو لے کر مرد حضرات مسجد کی جانب نکلے اُدھر میرا دل ایک بار پھر بھر آیا۔ اب ایک باب بند ہو چکا تھا۔ برسا برس ان گلیوں میں چلتی پھرتی اور سب کے کام آنے والی صدیقہ خالہ چار کاندھوں پر سوار ہو کر ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے سب سے دور، بہت دور جا رہی تھیں۔ میں اٹھ گئی، مجھے دیکھ کر میری بہو بھی کھڑی ہو گئی۔

''نہیں فارحہ......! تم لوگ گھر والوں کو کھانا کھلا کر آنا...... دیکھو، ذرا بیٹیوں کی حالت کو۔ انہیں زبردستی کچھ کھلا دو اور ہو سکے تو پین کلر بھی دے دینا کچھ سکون آئے گا۔ مجھ میں ہمت نہیں ہے اب میں گھر جا رہی ہوں۔'' میرے پپوٹے بھاری ہو رہے تھے۔ آنکھوں میں رونے کی وجہ سے شدید جلن محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے گھر جا کر چائے پینا چاہ رہی تھی۔ گھر آ کر بھی مضمحل رہی، بے کلی اور بے چینی سوار تھی۔ ایک لمحے کے لیے بھی صدیقہ خالہ کا چہرہ میری نظروں کے سامنے سے ہٹ نہیں رہا تھا۔ چائے کا کپ لے کر میں اپنے کمرے میں آئی تو کچھ دیر میں عمر اور عثمان بھی قبرستان سے واپس آ گئے تھے۔

دو دن تک میری حالت ایسی ہی رہی۔ صدیقہ خالہ بھی حواسوں پر سوار تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی اور ان سے خاص انسیت وابستگی تھی سو آج رسم قل میں بھی شریک ہونے آ گئی تھی۔ ان کا گھر کارنر کا تھا۔ اس لیے روڈ کی طرف بڑا سا شامیانہ لگایا گیا تھا۔ مرد اور عورتوں کا انتظام الگ، الگ تھا۔ برائے نام خواتین پنڈال میں بیٹھی قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔ میری توقع کے عین مطابق...... خواتین فاتحہ خوانی کے وقت ہی آتی ہیں، پڑھنے کے لیے تو گنتی کی خواتین ہی آتی ہیں۔ میں بھی ایک طرف بیٹھ گئی۔ حالانکہ پہلے سے تین قرآن پاک ہمارے گھر کے تمام افراد کی طرف سے بطور ہدیہ دے چکی تھی۔ صدیقہ خالہ کی بیٹیاں، نواسیاں، بہویں اور پوتیاں بھی آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ سب قرآن پاک پڑھ رہے تھے۔ عجیب سی اداسی پھیلی ہوئی تھی پھر ایک خاتون آئیں، انہوں نے کچھ دعائیں کیں۔ صدیقہ خالہ کی مغفرت کے لیے سب کچھ پڑھا۔

مغرب کی اذان ہوئی تو میں نماز کے لیے اندر گھر میں آ گئی۔ مغرب کی نماز اور پھر مجھے کچھ وظائف بھی پڑھنے تھے سوچا تھا کہ اپنے گھر ہی جاؤں تاکہ آرام سے نماز ادا کر لوں مگر ان لوگوں کی زبردستی سے صدیقہ خالہ کے گھر ہی میں آ گئی۔ جائے نماز بچھا کر نماز شروع ہی کی تھی کہ برآمدے سے آتی ہوئی آوازوں کی جانب نہ چاہتے ہوئے بھی توجہ مرکوز ہوئی۔ وہاں کسی معاملے پر بحث چل رہی تھی، میں ڈسٹرب ہونے لگی۔ صدیقہ خالہ کے گھر کے تمام افراد شاید اندر ہی تھے۔ گویا باہر ہونے والی یہ بات یقیناً نہیں تھی تب ہی سارے اندر جمع ہو چکے تھے۔

''یار اماں نے بھی حد کر دی ایسی بھی کیا...... بے اعتباری...... کم از کم گھر کے کسی فرد کو تو بتا دیتیں۔ ہمیشہ یہی کہا کہ پوتوں کے لیے سونا رکھا ہے، نواسیوں کے لیے چوڑیاں بنا رکھی ہیں مگر شادیوں پر اپنے ہاتھ سے دوں گی۔ کہاں رکھا، کس کے پاس، کس کو انہوں نے بتایا......؟ اس بات سے ہر کوئی بے خبر ہے۔ یہ بات ہضم ہونے والی نہیں ہے...... کسی کو تو پتا ہو گا ناں......'' یہ آواز صدیقہ خالہ کے بڑے بیٹے کی تھی۔

''ویسے بڑی بھابی ہی سب سے قریب تھیں اماں کے......'' یہ آواز چھوٹی بہو کی تھی۔

"ماریہ! تمہارا مطلب کہ مجھے علم ہے اماں نے اپنے خزانے کہاں رکھے ہوئے ہیں۔" بڑی بہو تنک کر بولیں۔

"بیٹیوں سے زیادہ بھروسا بہوؤں پر تو نہیں ہو سکتا ناں۔" بیٹیاں، نبیلہ آپا، بجیلہ اور شبینہ بڑی بہو کی بات پر جز بز ہو گئیں۔

"توبہ، توبہ بھابی لاحول ولا قوۃ...... کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ اماں اس کے جاتے ہی دو دن میں ہی بیٹیوں کو الزام دینے لگیں۔" نبیلہ جل کر بولی۔

"توبہ، توبہ! بھئی کیسی، کیسی قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں یہاں پر حیرت ہے۔ آپ سب کی سوچ پر۔" بجیلہ غصے سے بولی۔

"جو چلا گیا اس کا ماتم کرنا چھوڑو جو چیزیں اماں اپنے ہاتھ سے دینے والی تھیں...... اس کی خبر صرف اماں کو ہی تھی۔ اس طرح کی قیاس آرائیوں یا شکوک و شبہات سے بہتر ہے کہ جو اماں کا موجود ہے اس کی بات کرلیں۔" شبینہ کی بات پر سب نے اس کی طرف دیکھا۔

"ایسے کیسے چھوڑ دوں یار...... آج کل کے دور میں تو ہے سونا کس بھاؤ پر ہے۔" صدیقہ خالہ کا چھوٹا بیٹا انور جھلایا۔

"ارے بھیا...... وہ کیا صرف تمہارے لیے تھا، ہماری بچیوں کا بھی تھا بقول اماں کے...... ہمیں بھی اتنی ہی فکر ہے مگر اب کیا کر سکتے ہیں۔ جب سارے ہی انجان بنے ہوئے ہیں۔" نبیلہ تنک کر بولیں۔ ان سب باتوں کے درمیان میری مغرب اور نوافل بمشکل ادا ہوئے۔ یہی سوچتی رہی کہ گھر ہی چلی جاتی۔ میرے ساتھ دو تین بزرگ خواتین بھی نماز ادا کر رہی تھیں۔ وہ بھی جز بز ہو رہی تھیں۔

"ارے اماں کے ہاتھوں میں سونے کی دو چوڑیاں تھیں...... کانوں میں زرقون کے بڑے ٹاپس اور گلے میں چین اور ایک انگوٹھی بھی تھی۔ وہ ساری چیزیں کہاں چلی گئیں؟ جبکہ اماں کے کپڑے، چاندی کے کچھ زیورات، پرانی جڑاؤ کنگن، ان کی چاندی کی پرات اور چاندی کا پاندان...... ان ساری چیزوں کا بھی حساب کتاب کرلو...... اب ہم روز، روز سسرالوں سے نہیں آسکتے۔" بجیلہ نے کہا۔

"اُف......!" میں نے سر پکڑ لیا۔

"ارے واہ، بجیلہ، کچھ خیال تو کرو، اتنی جلدی بھی کیا ہے...... ذرا دیگر چیزوں کا بھی پتا چل جائے۔ تم تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے چلی ہو......" بڑی بہو نے ترش لہجے میں کہا۔ "ویسے اماں نے مجھ سے کہا تھا کہ چاندی کا پاندان میری نیہاں کے لیے دیں گی اور کانوں والے ٹاپس میری مونا کے لیے...... وعدہ کیا تھا مجھ سے انہوں نے۔ ہائے بیچاری اپنے ہاتھوں سے دے جاتیں۔" نبیلہ نے سینے پر ہاتھ مار کر زور، زور سے رونا شروع کر دیا۔

"واہ بھئی! اب اماں کی وصیتیں بھی سامنے آنے لگیں......" چھوٹی بہو نے طنز سے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"کہنے کی تو بات نہیں آپا مگر اماں نے اپنا بڑا والا چاندی کا تھال تو وریشہ کی پیدائش کے وقت ہی اس کے نام پر رکھ دیا تھا۔" چھوٹی بہو نے اپنی بات کو ٹکڑا لگایا۔

"اور اماں کے بینک میں جو کچھ پیسے ہیں ناں وہ...... وہ اماں نے کہا تھا کہ تدفین پر خرچ کر دینا۔" یقیناً یہ چھوٹے بیٹے کی ذہنی پیداوار تھی۔

"اچھا تو بھیا جب حساب کرو تو کفن اور آج کے چنوں کے پیسے بھی الگ کر دینا، تمہارے بہنوئی لے کر آئے تھے۔" بجیلہ نے یاد دلایا۔

"اور اماں کا جوڑا، جائے نماز اور تسبیح میں نے منگوائی تھی۔" بڑی بہو نے اپنا احسان یاد دلایا۔

"ویسے دیکھا جائے تو اصل خدمت تو بہوئیں ہی کرتی ہیں۔ اس لیے سارا حق تو بہوؤں کا ہی ہونا چاہیے۔" چھوٹی بہو زیادہ ہی بول رہی تھی، بیٹے بھی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔

"توبہ، توبہ استغفار...... بھلا ہماری اماں نے کب خدمتیں کروائی ہیں۔ بیچاری چلتی پھرتی گئی ہیں۔ الٹا تم لوگوں کی بھی خدمتیں کی ہیں۔ تم لوگ ان کا کام کرو تو احسان نہیں فرض ہے تمہارا۔" نبیلہ نے ہاتھ نچا، نچا کر کہا۔

"جب فرض کی بات کر رہی ہیں آپا تو لینے کے حق کی بھی بات کریں ناں......" بڑی بہو نے کہا۔

"ارے بھئی۔ چپ کرو سب...... دماغ کی دہی

مت بتاؤ۔ میں تو پہلے ہی اماں کی دور اندیشی اور عجیب و غریب فلسفے کی وجہ سے پریشان ہوں۔ اپنے ہاتھ سے دینے کی خواہش میں اچھا خاصا اپنے ہاتھوں سے گنوا کر چلی گئیں وہ......'' ابرار نے جھنجلا کر سب کو چپ کروادیا۔

''واقعی یہ بات تو ٹھیک ہے، تمہاری اماں کی اتنی عمر ہوگئی تھی، ان کا کام تھا کہ کسی کو بتا دیتیں کہ بچا کھچا مال کہاں پر رکھا ہے یا کسی قابلِ بھروسا شخصیت کے حوالے بھی کر دیتیں۔ بیماری، موت کا کوئی بھروسا ہے کیا۔ یہاں تو جوان جہان پلک جھپکتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی تو خیر سے اتنی عمر ہو چکی تھی۔ جو کچھ دینا دلانا تھا اپنی زندگی میں ہی دے دیتیں تو آج گھر میں یوں فساد تو نہ ہوتا......'' یہ صدیقہ خالہ کی رشتے کی بہن تھیں جو میرے ساتھ ہی نماز ختم کر کے اپنی ماہرانہ رائے دے رہی تھیں۔ میں وہیں اندر کمرے میں ہی بیٹھی تسبیحات میں مشغول، عجیب و غریب کیفیت کا شکار تھی۔ شاید لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر تھی۔ ابھی تو......ابھی تو تین دن مکمل بھی نہیں ہوئے تھے۔ صدیقہ خالہ کی موت کو اور......ان کی زندگی میں ان پر جان نچھاور کرنے والی اولاد، ان کی موت پر غش پر غش کھانے والی اولاد......کس طرح سے کتنے کٹھور انداز میں ان سے وابستہ مادی اشیا، روپے پیسے اور زیور کو لے کر باقاعدہ ایک دوسرے پر الزام تراشیاں کر رہی تھی۔ ایک دوسرے کو مشکوک نظروں سے دیکھا جارہا تھا۔ ماں کے نام کو استعمال کر کے محض چند ٹکوں کی چیزوں کے لیے جھوٹ بولا جارہا تھا۔ یہ بھی دنیا۔

''اُف اللہ......!'' میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا......شاید ان لوگوں کو علم نہیں تھا کہ میں اندر کمرے میں نماز پڑھنے کے لیے آئی تھی مگر باہر ہونے والی بحث اور باتوں کی وجہ سے مجھے اب کمرے سے نکلتے بھی عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ اتنی اہم باتوں کے درمیان......لوگوں کے درمیان سے نکل کر جانا معیوب سا محسوس ہو رہا تھا مگر اب مزید وہاں بیٹھنا میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ میرا بلڈ پریشر ہائی ہونے لگا تھا۔ اب بے تحاشا رونا بھی آرہا تھا۔ اس عورت کی بے بسی پر اور شاید کچھ، کچھ نادانی بھی تھی، غیب کے علم سے تو کوئی بھی واقف نہیں ہوتا......

بس...... صدیقہ خالہ بیچاری، پتا نہیں کیا سوچتی ہوں گی......کیا، کیا پلان بنا رکھے ہوں گے، میں بمشکل زمین سے، اٹھی۔ اپنا آپ گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی......بغیر اِدھر اُدھر دیکھے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ باہر کے دروازے کی جانب لپکی......اور سیدھا چلتی چلی گئی اپنے گھر کی جانب۔ عجیب و غریب سوچیں مجھے مسلسل پریشان کر رہی تھیں......اندر نماز ختم کر کے بیٹھے ہوئے دس پندرہ منٹ اور اس کے دوران سنی گئی گفتگو، وہ باتیں، وہ لہجے، وہ انداز میں......نے ان دس منٹ میں بہت کچھ پا لیا تھا۔ بہت کچھ سوچ لیا تھا۔ گھر آتے، آتے وہ سارے خدشات اپنے ہاتھوں ختم کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

''ارے مما، کھانا نہیں کھایا وہاں......؟'' فارحہ نے مجھے اتنی جلدی واپس آتا دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں، دل نہیں کر رہا تھا کھانے کو......'' میں نے اپنے کمرے میں جاتے ہوئے کہا۔

''یہ لیں مما! گرم گرم چائے پی لیں......شام سے قرآن پاک پڑھ رہی ہوں گی آپ۔'' دو منٹ بعد فارحہ پھر میرے لیے گرما گرم چائے کا کپ لے کر آگئی۔ میری بہو! بہت نیک، بہت اچھی اور خیال رکھنے والی تھی۔

''شکریہ بٹیا......!'' میں نے چائے کا کپ تھام لیا جس کی اس وقت شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆

آج ویک اینڈ تھا۔ کل اتوار تھا سب کی چھٹی......میں نے ملیحہ اور منال کو کال کی کہ کل لنچ وہ ہمارے ساتھ ہی کریں اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ مریم تو آئی ہوئی تھی۔ کل اس کی واپسی تھی اس کا شوہر بھی آنے والا تھا۔ میں نے سوچا تینوں بیٹیاں اکٹھی ہو جائیں گی۔ رات میں ہلکا سا کھانا کھا کر جلد ہی سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ کچھ دیر میں عمر بھی آ کر خاموشی سے لیٹ گئے، میں لیٹی رہی وہ سمجھے شاید میری آنکھ لگ گئی۔ لیکن نیند تو میری آنکھوں سے کوسوں دور بلکہ میں دل ہی دل میں پلان بنا رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں عمر کی نیند پکی ہوگئی تو میں آہستگی سے اٹھی اور اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے لگی تھی پھر تمام کاموں سے خاموشی سے فارغ ہو کر دوبارہ آ کر لیٹ گئی۔

رات کو دیر تک جاگنے سے صبح نماز پڑھ کر دوبارہ آنکھ لگی تو ملیحہ اور منال کے آنے پر ہی آنکھ کھلی ماشاء اللہ ننھے منے بچے شور کرتے بھاگے چلے آئے۔ جب چاروں بچوں کے بچے اکٹھے ہوتے تو گھر میں خوب، خوب رونق لگ جاتی۔ الحمد اللہ مجھے یہ سب بہت اچھا لگتا، اللہ پاک کا شکر ادا کرتی۔ نند اور بھاوج میں بھی مثالی محبت تھی ایک دوسرے کا دل سے خیال کرنے والے تھے۔ وہیں عثمان اور دونوں تینوں داماد میں بے حد انڈر اسٹینڈنگ ایسے میں عمر بھی ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو جاتے اور میں اپنی جنت کو دیکھ، دیکھ کر اللہ پاک کا شکر ادا کرتی۔

''ارے واہ بھئی مما......! یہ خوب رہی ہمیں دعوت دے کر خود ابھی تک سو رہی ہیں......'' منال نے میرے سینے سے لگتے ہوئے مزاحیہ انداز میں کہا۔

''ارے بچوں آج کل تمہارے مما کی طبیعت بھی کچھ مضمحل ہے، صبح نماز پڑھ کر سوئیں تو میں نے جلدی جگانا مناسب نہیں سمجھا۔'' عمر نے کہا۔

''جی، جی بابا...... میں تو مذاق کر رہی ہوں۔''

''بھئی بھاوج! ہم لوگ بنا ناشتا کیے آگے ہیں اچھا سا ناشتا چاہتے ہیں۔'' ملیحہ نے لاڈ سے فارحہ کو آواز لگائی۔

''ہاں بھئی پتا ہے ہمیں پیٹ پکڑ کر بھی آتے ہو تم لوگ۔'' عثمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔'' جا رہا ہوں ناشتا لانے...... فرمائشیں نوٹ کرواؤ اپنی، اپنی۔'' وہ کاغذ پنسل لے کر آ گیا۔

''ماموں میں بھی چلوں گا...... میں بھی۔'' بھانجوں نے آواز لگائی۔

''ہاں بھئی سارے چلو گاڑی بھر کے۔''

''بھائی زیادہ لمبے چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں نکڑ والے تنورے سے گرما گرم پراٹھے پکڑ لے...... سامنے والی دکان ہے، سبزی اور چھولے...... حلیم اور کچوریاں لے لے بس اور ہاں حلوا ضرور لانا......'' ملیحہ کے شوہر نے مسئلہ حل کرتے ہوئے کھڑے، کھڑے لمبی لسٹ لکھوا دی......

''او کے باس......'' عثمان نے سر ہلایا...... میں واش روم کی طرف بڑھ گئی...... ساتھ ہی سب کو اس طرح سے باتیں کرتے دیکھ کر آج خوشی کے ساتھ، ساتھ عجیب قسم کا وہم بھی...... اور...... خدشہ بھی تھا...... دل میں جیسے شک سا ابھر گیا تھا۔ سر جھٹک کر میں واش روم چلی گئی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر سب لوگوں نے چائے ختم کی، میں اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ بچے اِدھر اُدھر ہو کر مختلف کھیلوں میں مگن ہو گئے۔ میں کمرے سے نکلی۔ پہلے اسٹور روم میں جا کر وہ پرانا سا کوٹ نکالا جو برسا برس سے الماری میں سب سے کونے میں پیچھے کی طرف لگا تھا کور چڑھا کر عمر نے یہ کہہ کر سنبھال کر رکھا تھا کہ وہ ان کے بابا کی نشانی ہے۔ اس کوٹ کو اٹھایا۔ اپنے روم میں آئی الماری کھول کر لا کر کھولا، زیورات کی چھوٹی سی پوٹلی کچھ پرائز بانڈز...... اور پھر الماری کے دراز میں لکھ کر رکھی گئی پرچیاں جو میں نے رات کے ایک بجے کے بعد لکھی تھیں۔ وہ نکالیں اور سارا ساز و سامان لے کر دوبارہ سٹنگ روم میں آئی تو سارے مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔ جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔

''کیا ہوا بیگم......؟ خیریت تو ہے...... کہاں تفریح کرنے جا رہی ہو وہ بھی اکیلے، اکیلے...... یار! ہمیں تو ساتھ لے کر چلو کم از کم۔'' عمر نے مجھے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے پہلے حیرت اور پھر مزاحیہ انداز میں کہا۔

''عمر آج نہیں تو کل سب نے ہی سفر پر جانا ہے۔ باری، باری سب کا نمبر آنے والا ہے۔ بہتر ہے کہ آخرت کی تیاری کے ساتھ یہ تیاری بھی کر لی جائے۔ تاکہ بعد کی پریشانی سے بچا جا سکے۔'' میری ذو معنی بات...... سن کر سب ہی منہ پھاڑے حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ جیسے میں پاگل ہوں۔ میں عمر کے برابر والے صوفے پر جا بیٹھی۔ سارے میری جانب متوجہ ہو گئے۔

''آج تم سب کو یہاں جمع کرنے کا مقصد یہ بھی تھا کہ میں اپنے سامنے اپنے ہاتھوں سے تم سب کو اپنی تھوڑی بہت جیولری، کپڑے پیسے اور دیگر چیزیں تم سب میں برابر تقسیم کرنے کی کوشش کروں کہ اگر مجھے کل کو اچانک سے کچھ ہو جاتا ہے تو......''

''مما...... پلیز؟ ہائے مما......؟ ارے مما......؟

مما...... کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں......؟ اللہ نہ کرے؟ اللہ نہ کرے مما آپ تا قیامت ہمارے سر پر سلامت رہیں۔''

''ارے بیگم کیا ہو گیا ہے، لگتا ہے صدیقہ خالہ کی اچانک ہونے والی موت کا تم نے کچھ زیادہ ہی اثر لے لیا ہے۔ کیا فضولیات ہیں......'' باری باری سارے بچوں اور پھر عمر نے حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے تھوڑے تیکھے لہجے میں کہا تو میں پھیکی ہنسی ہنس دی۔

''سچ کہا آپ نے عمر...... واقعی صدیقہ خالہ کی موت نے صحیح معنوں میں میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ مجھے بظاہر چھوٹی سی مگر بے حد بڑی اور ضروری اہم بات کا پتا چلا۔'' تینوں بیٹیاں اور بہو تو میرے نزدیک آ گئی تھیں اور تقریباً رونے والی تھیں۔

''دیکھو بچو! میں نے، تم نے، ہمارے بچوں نے...... سب کو ایک نہ ایک دن واپس اپنے رب کے پاس لوٹ جانا ہے...... میں نے کوئی آب حیات تو نہیں پی رکھا۔ جلد یا بدیر مجھے بھی آخرت کے سفر پر روانہ ہونا ہے، ہم دنیاوی دھندوں رشتوں اور مصروفیات میں اس قدر مگن ہو جاتے ہیں اپنی موت اور پھر...... موت کے بعد کے حالات کو یکسر فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ بظاہر یہ...... بہت معمولی بات ہے اور شاید تم لوگوں کو اس طرح کی فیلنگز آ رہی ہیں...... لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے کل صدیقہ خالہ کے گھر جو دیکھا اپنے کانوں سے جو بھی سنا سچ کہوں تو ان سب کی باتوں نے میری آنکھیں کھول دیں...... اچھا ایک منٹ کوئی کچھ نہیں بولے گا۔'' درمیان میں، میں نے ایک لمحے کو رک کر بات بدلی۔ سارے آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہے تھے...... میں نے سب سے پہلے ابا جی کا کالا کوٹ کور سے نکالا۔ اس کی اندرونی جیب سے ایک لفافہ نکالا۔

''عمر......'' وہ لفافہ عمر کو دکھایا...... میری عادت تھی کہ شادی کے پہلے ماہ سے ہی میں عمر کے دیے گئے پیسوں سے کچھ نہ کچھ پس انداز ضرور کرتی آئی۔ یہ عادت میری اماں کی تھی ایسی رقم اچانک ضرورت کے وقت بہت کام آتی ہے۔ اس جمع شدہ پیسوں کی نہ بچوں کو خبر ہوتی نہ شوہر کو اس وقت حالات بھی کچھ خاص اچھے نہ تھے۔ مگر تنکا تنکا آشیانہ اور قطرہ، قطرہ دریا کے مصداق میں اپنی اس عادت کو آج تک اپنائے ہوئے تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار...... عمر کی بائیک کا انجن اچانک خراب ہو گیا تھا۔ آفس کافی دور تھا بائیک بند ہو کر گھر میں پڑی تھی اور وہ بیچارے بسوں کی خواری اٹھانے پر مجبور تھے۔ سیلری ملنے میں بھی ٹائم تھا اور سیلری سے اچانک پچیس ہزار فوراً نکل جائیں تو اخراجات کی پریشانی ہو جاتی۔ وہ کافی پریشان تھے تب...... میں نے بیس ہزار کی رقم جب ان کے سامنے رکھی تو ان کی آنکھیں حیرت اور خوشی سے پھیل گئی تھیں۔ ان کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ محدود آمدنی سے بھی میں بچا سکتی ہوں۔ اس وقت عمر کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔ ان کے چہرے پر پھیلنے والی خوشی ان کی آنکھوں میں میرے لیے وہ جذبات تھے جو آج تک ہیں...... وہ آنکھیں نہیں بھولی۔ انہوں نے محبت سے میرا ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے لگایا تھا۔ مجھے عزت، محبت کی جس معراج پر پہنچایا تھا اپنے ہاتھوں کی پشت پر ابھی تک مجھے اس کا لمس محسوس ہوتا ہے۔ ایک بار عثمان کی ایم بی اے کی فیس کا مسئلہ پڑا تھا۔ عثمان سے کسی نے گن پوائنٹ پر فیس اور موبائل چھین لیا تھا۔ عثمان بھی گھر کے حالات جانتا تھا۔ وہ میرے سامنے باقاعدہ رو رہا تھا۔ تب میں نے اسی کوٹ کے لفافے سے نکال کر اس کے ہاتھ پر کچھ پیسے رکھے تھے...... وہ بچہ مجھ سے لپٹ کر رونے لگا تھا۔ اس کی حالت بچوں جیسی ہو رہی تھی جیسے غیر متوقع اس کا من پسند مہنگا ترین کھلونا مل جائے...... اس کی بانہوں کی گرمی آج تک مجھے اپنے کاندھوں پر محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح مریم کی شادی کے وقت میں نے اچھی خاصی بڑی رقم عمر کو دی تھی۔ گزشتہ اٹھائیس، انتیس برسوں میں بھی میں نے تین بار اس پرانے کوٹ سے خزانہ نکال کر دیا تھا جو کسی کے علم میں بھی نہیں تھا۔

''عمر تیس ہزار روپے ہیں، بینک میں تو میں رکھتی نہیں تھی بس یہی کوٹ میرا بینک تھا۔ جو میں نے خرچے سے بچائے ہیں۔ آپ کو اور سب بچوں کو بتا رہی ہوں کہ

اگر کبھی بھی ضرورت پڑے تو عثمان یا آپ بے دھڑک اس میں سے لے سکتے ہیں......'' پھر میں نے پرانا چھوٹا سا پرس نکالا جو الماری میں رہتا تھا۔ اس میں بیس ہزار کے پرائز بونڈز تھے جو کسی ضرورت مند سے میں نے لیے تھے......وہ بھی سب کے سامنے شو کیے۔

''عمر یہ پرائز بانڈ میری الماری کی ڈراز میں پیچھے کی طرف اس پرس میں ہوتے ہیں۔'' عمر خاموشی سے ہمہ تن گوش تھے......پھر میں نے اپنی سونے کی جیولری کا باکس کھولا۔

''جب تک میری زندگی ہے یہ چیزیں میری ملکیت ہیں میرے استعمال میں رہیں گی۔ اور میرے بعد کس کو کیا ملے گا میں نے الگ، الگ لکھ کر رکھ دیا ہے۔ عمر......آپ کے لیے......پرائز بانڈز اور جب تک جمع کی جانے والی ساری رقم میرا قرآن پاک اور کچھ وظائف کتابیں ہیں۔'' میں ان کی طرف پلٹی اور جیولری بکس میں سے کاغذات کا پلندا نکالا۔ سب سے پہلے عمر کی جانب بڑھا پھر باری، باری تینوں دامادوں اور بیٹے کو تھمایا......سارے حیرت سے وہ کاغذ دیکھ رہے تھے ''یہ ساری تفصیل ہے جو کہ میں اپنے ہاتھوں سے لکھ دی ہے کہ میرے بعد کس کو کیا ملے گا......؟''

''مما پلیز! آپ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں۔'' عثمان میرے پاس آ کر میرے ہاتھ تھام کر بولا۔

''عثمان تم لوگوں کو اس بات کا علم نہیں ہے جو میں نے کل دیکھی اور سنی ہیں......صدیقہ خالہ کے مرتے ہی ابھی تو ان کا کفن بھی میلا نہیں ہوا ہوگا یہاں ان کی چیزوں کو لے کر آپس میں منہ ماری شروع ہو گئی۔ باقاعدہ الزام تراشیاں ہو رہی ہیں۔''

''اوہ مما......اللہ نہ کرے کہ ہم لوگوں کے درمیان کسی بھی بات پر کوئی منہ ماری ہو......کوئی اختلاف ہو......بدمزگی ہو آپ کو تو پتا ہے ناں......'' منال پہلی بار بولی تھی۔

''ہاں بیٹی الحمدللہ جانتی ہوں کہ تم لوگ مثالی بہن، بھائی ہو......الحمدللہ باہر سے آنے والے تینوں داماد اور بہو بھی ہمارے لیے عطیۂ خداوندی ہیں......میں اور عمر بہت لکی ہیں کہ تم سارے کے سارے اتنے کیئرنگ آپس میں محبت کرنے والے، خیال کرنے والے اور سب سے بڑی بات یہ کہ تم لوگوں میں جو انڈر اسٹینڈنگ ہے وہ ایسے رشتوں میں کہیں بھی نظر نہیں آتی......ہمیں اپنی تربیت پر پورا، پورا بھروسا ہے، یقین ہے لیکن......صدیقہ خالہ کی اولادیں بھی بظاہر آپس میں مل جل کر رہتی تھیں۔ ان کی موت پر نڈھال تھے سارے کے سارے لیکن آج چند روپوں اور کچھ سونے کے زیورات، چند چاندی کے ٹکڑوں پر وہاں گھمسان کا رن تھا۔ سب ایک دوسرے پر شک کر رہے تھے کہ یقیناً ان میں سے کسی کو صدیقہ خالہ کی جیولری کا پتا ہوگا اور اگر ایسے میں ان کے چاروں بچوں میں سے کوئی بھی کوئی بڑا کام کرتا ہے مطلب انویسٹمنٹ والا، کوئی پراپرٹی خریدتا ہے تو ان تمام لوگوں کا شک' یقین میں بدل جائے گا کہ صدیقہ خالہ کا خزانہ اس نے ہی دبایا ہوگا اور اب اسی پیسے سے یہ چیزیں خریدی ہیں، دیکھا جائے تو بات معمولی سی ہے لیکن بے حد گہری بہت سنجیدہ اور غور طلب ہے......''

میں خاموش ہو گئی تھی بلکہ سب ہی خاموش ہو گئے تھے۔

واقعی ہم لوگ یہ نادانی کرتے ہیں کہ اپنی چیزیں اپنے گھر والوں سے بھی چھپا کر رکھتے ہیں......اور اگر اچانک اس قسم کا حادثہ پیش آ جائے تو یا تو وہ پیسہ بینک لے لیتا ہے......یا پھر برسا برس تک ہی مل ہی نہیں پاتے۔ کبھی، کبھی چوہوں کی خوراک بھی بن جاتا ہے۔ بیچاری صدیقہ خالہ تو سرپرائز دینے کے چکر میں دنیا سے چلی گئیں۔ انہیں کیا خبر تھی کہ وہ وقت ہی نہیں آئے گا کہ اپنے ہاتھ سے دے سکیں......یہ انہوں نے لاعلمی میں کیا......اور آج......آج ان کی اولاد ہی بجائے یہ کہ ماں کے لیے کچھ پڑھے، ان کے ایصال کے لیے کچھ کرے......آپس میں کپڑوں اور چیزوں کے لیے جھگڑ رہے ہیں۔

''بیٹا کل کا دن میرے لیے مقام عبرت تھا۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا کہ وہاں ایک پل بھی ٹھہروں......تب ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ تم سب کو اکٹھا کر کے ایک بھاری بوجھ سے آزاد ہو جاؤں۔ ویسے بھی ہر مسلمان پر

فرض ہے کہ اپنی نصیحت، وصیت اپنے سرہانے رکھے نہ صرف مادی چیزوں کی بلکہ عبادات جو چھوٹ گئی ہیں ان کا بھی ذکر کرے۔ بھاری بوجھ سے آزاد ہو جاؤں...... اس بات کو تم لوگ منفی انداز سے لے رہے ہو لیکن میری نظر سے دیکھو اور میرے دماغ سے سوچو تب تمہیں تم سب کو میری بات ٹھیک لگے گی۔ میرے فیصلے سے متفق ہو جاؤ گے۔ میں ابھی نہیں مر رہی لیکن کچھ خبر بھی نہیں کہ اگلی سانس بھی نہ لے سکوں۔ اس بات سے تو میں، تم اور ہم سب اتفاق کرتے ہیں بلکہ مکمل یقین اور بھروسا ہے کہ ہماری ایک، ایک سانس کا چلانے والا ہمارا، کسی بھی لمحے، کسی بھی وقت اور کسی بھی حال میں ہماری سانس روک سکتا ہے، اس کے لیے وقت کی قید ہے نہ عمر اور بیماری کا تعلق۔ اس لیے ٹھنڈے دل و دماغ سے میری بات پر غور کرو۔ کہتے، کہتے میں عمر کی جانب پلٹی۔ عمر ایک ٹک مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر طمانیت تھی، سکون تھا...... ان کی آنکھوں میں میرے لیے عقیدت تھی، محبت تھی۔ خلوص اور تشکر تھا۔ میری بات ختم ہوئی تو بے ساختہ ان کے ہاتھ اٹھے اور وہ تالی بجانے لگے۔ ان کے اس عمل کو دیکھ کر میری بیٹیاں، داماد، بیٹا اور بہو بھی میرے پاس آگئے اور سب لوگ تالیاں بجانے لگے ان سب کے چہروں پر میرے لیے فخر تھا...... بیٹیاں اور بہو تو لپٹ کر باقاعدہ رونے لگی تھیں۔

''آئی ایم پراؤڈ آف یو بیگم...... آج تک میں تم سے محبت کرتا تھا، آج تو تم سے عقیدت ہو گئی ہے، واقعی جس بات کا تم نے احساس دلا دیا ہے۔ اس بات کی باریکی کو ہم میں سے کوئی بھی نہیں سمجھتا۔ ہم لوگ اس نکتے کی طرف دیکھتے ہی نہیں۔ جیسے اس بات کا یقین ہو کہ ہم نے سارا کچھ اپنے ہی ہاتھوں سے کرنا ہے۔ تم نے آج بہت بڑا کام کر دیا ہے بیگم...... میری بھی آنکھیں کھول دی ہیں...... بلکہ یہ بچوں کو باتیں بتانی چاہئیں۔''

''سچ بات ہے کہ پیسہ، روپیہ، اور سونا چاندی دیکھ کر اپنوں کے رنگ بھی بدل جاتے ہیں۔ میں نے خود ایسے کئی واقعات دیکھے اور سنے ہیں مگر صرف افسوس کی حد تک...... سنا اور پھر افسوس کر کے رشتوں کو پامال کرنے والوں پر لعنت بھیج کر اگلے لمحے ہی وہ واقعے کو بھول بھی گیا۔ کبھی بھی گہرائی میں جا کر یہ نہیں سوچا کہ ایسا ہوا کیوں......؟ صدیقہ خالہ بیچاری زندگی بھر ہر اک کے کام آتی رہیں...... سب کا خیال رکھا، دین کی پوری سمجھ بوجھ بھی تھی، دوسروں کو سکھاتی تھیں مگر کاش...... کاش وہ اس جانب بھی ایک بار سوچ لیتیں تو آج ان کے پیچھے گھر میں یوں فساد نہ ہوتا...... تم قابلِ فخر ہو اور قابلِ فخر ماں ہو بیگم ہمارے لیے، اللہ پاک میرا فخر، میرا کل اثاثہ، میری مضبوط اور محفوظ پناہ گاہ...... میرے بچوں کے لیے میرا سب سے قیمتی تحفہ......'' میں جذبات بھرے لہجے میں بولی تو عمر نے میرے ہاتھ تھام لیے۔

''یہ تو رب جانے کہ تم مجھے یا میں تمہیں...... چھوڑ کر جاتا ہوں، بہر حال تم نے آج حقیقت میں بہت بڑا کام کر دیا ہے۔'' ایک بار پھر ان کے لہجے میں تشکر تھا۔ میں مسکرائی۔ دفعتاً میری نگاہ دروازے میں سے ہوتی ہوئی کچن تک جا پڑی۔ یہاں سے کچن کا سامنے والا سلیب بخوبی نظر آتا تھا۔ عین پلیٹوں والی اسٹینڈ کے سامنے...... ابھی تک وہ فائن پلاسٹک کی پلیٹ دھلی رکھی تھی جس میں مجھے صدیقہ خالہ نے مجھے سوجی کا حلوا بھیجا تھا۔ وہ پلیٹ واپس لینے بھی نہ آسکیں اور ابدی سفر پر روانہ ہو گئیں۔ صدیقہ خالہ، آپ نے زندگی بھر مجھے اچھی، اچھی باتیں بتائیں، مجھے بہت سی باتوں کی آگہی دی جن سے میں اچھی طرح سے واقف نہیں تھی۔ ان باتوں کی طرف توجہ دلائی اور آج...... آج...... آپ نے جانے کے بعد بھی مجھے یاد رکھا مجھے اس سبق کی آگہی دینے کا بہت، بہت شکریہ خالہ میں، میں اس سبق کو شاید کبھی نہ بھول پاؤں گی۔ میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتی...... ہاں آپ کے لیے جب تک پڑھ سکی قرآن پاک پڑھتی رہوں گی، ان شاء اللہ...... نہ جانے کیوں میری آنکھوں سے دو آنسو نکل کر میرے گالوں پر بہہ گئے۔ مجھے لگا ہمیشہ کی طرح میری بات پر صدیقہ خالہ ہلکے سے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا رہی ہوں۔

سلسلے وار ناول

میں عشق ہوں

نایاب جیلانی

عشق، محبت، الفت، چاہت، انسیت، لگاؤ، پیار، اپنائیت ۔ ۔ ۔ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ حسین جذبے ۔ ۔ ۔ کہیں یہ پھول برساتے ہیں، زندگی مہکاتے ہیں، سانسوں کو معطر کرتے ہیں، لبوں کو ترنم بخشتے ہیں، تاریک راہوں کو منور کرتے ہیں اور کبھی، کبھی یہ مردہ ہوتے وجود میں زندگی کی نئی لہر بھی دوڑاتے ہیں ۔ ۔ ۔ غرضیکہ انسانی حیات انہی جذبوں کی مرہونِ منت ہے ۔ ۔ ۔ لیکن یہی جذبے کبھی عمر بھر کی تلاش کا حاصل ہوتے ہیں اور کبھی ریت کے ذروں کی طرح ہاتھ سے پھسلتے چلے جاتے ہیں اور انسان تہی داماں رہ جاتا ہے ۔ ۔ ۔ اسی حاصل اور لاحاصل کے گرد گھومتی حساس جذبوں کی آئینہ دار ایک دلکش و دل پزیر تحریر

ابھی تو عشق میں ایسا بھی حال ہونا ہے — کہ اشک روکنا تم سے محال ہونا ہے

ملیں گی ہم کو بھی اپنے نصیب کی خوشیاں — بس انتظار ہے کب یہ کمال ہونا ہے

ہر ایک شخص چلے گا ہماری راہوں پر — محبتوں میں ہمیں وہ مثال ہونا ہے

وصی یقین ہے مجھ کو وہ لوٹ آئے گا — اسے بھی اپنے کیے کا ملال ہونا ہے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

عمائم عالمہ بن رہی تھی، وہ اور عالی جامعہ میں ایک ساتھ پڑھتی تھیں۔ عمائم کو آج کل کچھ کال اور ایس ایم ایس آرہے تھے جو اس کی زندگی میں آنے والے ہر حادثے کی پیشگی اطلاع دے دیتے تھے، عمائم بچپن سے دیکھتی آئی تھی اُسے دو لوگوں سے چھپایا جاتا تھا۔ بابا صاحب اور امو جان اور تیسری شخصیت دادی پھپھو۔ وہ بچپن سے اپنے ساتھ ایسا سلوک ہوتے دیکھ رہی تھی مگر اس بات کی وجہ سے ناواقف تھی۔ بابا صاحب کا گھرانا مشترکہ خاندانی نظام کے تحت چل رہا تھا۔ ثریم، عمائم کو اپنی بہن کی شادی پر بلاتی ہے، نورس، عمائم کے ذمّے نمائش کا کام کرتی ہے اس کی کامیابی سے ملنے والے پیسے سے یتیم لڑکیوں کی شادی ہوگی۔ امو، عمائم سے کہتی ہیں کہ ایمان کبھی اس کا نہیں ہوگا۔ امی، احتشام اور اذان میں دوریاں چاہتی تھیں لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ وہ چاہتی ہیں کہ ماہم کا رشتہ احتشام کے لیے مانگ لیں لیکن وہ کہتا ہے کہ ضرور مانگیں مگر اذان کے لیے۔ بسمہ چاچی، عمائم کو کہتی ہیں کہ تمہیں دیکھ کر اپنے خسارے یاد آتے ہیں۔ بسمہ چاچی بعد میں عمائم سے معافی مانگتی ہیں کہ یہ دن ہی ایسا ہے شاید تو وہ پوچھتی ہے آج کیا دن ہے تو بسمہ چاچی کہتی ہیں جیل والوں کی ملاقات کا دن۔ جس پر عمائم دنگ رہ جاتی ہے کیونکہ وہ نہیں جانتی تھی کہ جیل میں کون ہے۔ عمائم، نورس کے ساتھ ثریم کے گھر تقریب میں جاتی ہے تو نورس اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے ایک لڑکی عمائم کو ایک پارسل دیتی ہے کہ یہ نوٹس ہیں تم نورس کو دے دینا۔ پولیس راستے میں گاڑی روکتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ میں ایس پی اذان کی کزن ہوں تو آفیسر اس سے معذرت کر لیتے ہیں۔ گھر واپس آتی ہے تو اس کے پاس میسج آتا ہے کہ منع کیا تھا ناں جانے سے۔ صبح عمائم کے کمرے سے وہ پیکٹ غائب تھا۔ صبح وہ امی کو بتاتی ہے کہ میرے ڈاکومنٹس چوری ہوئے ہیں جو امانت تھے۔ ثریم، عمائم کو بتاتی ہے کہ پیکٹ میں نوٹس نہیں تھے کچھ اور تھا اور اگر وہ نہ ملا تو تمہارے اور میرے لیے تباہی ہے۔ نورس کہتی ہے وہ پیکٹ تمہارے گھر سے غائب ہوا ہے تم کو وہ پیکٹ گم ہونے کی سزا بھگتنی ہوگی۔ اس نے عمائم کے گھر فون کر دیا تھا کہ وہ آج جامعہ میں رہے گی۔ عمائم سے اصلی بات جاننے کے لیے نورس، ثریم کو عمائم کے پاس بھیجتی ہے۔ انتظامیہ کی ہیڈ اسے کھانے کی ٹرے میں چھپا کر ایک پرچہ بھی دیتی ہے جس پر محمد غوری کا تاریخی واقعہ لکھا تھا۔ عمائم کو اس کی کچھ سمجھ نہیں آئی۔ کرن، عمائم کو بتاتی ہے کہ جب وہ مہندی کی رات عمائم کو پیکٹ دے کر واپس آئی تو میرس پر اس نے نورس کو دیکھا تھا وہ کسی ضروری کام سے نہیں گئی تھی۔ اذان کی کسی غلطی سے ان کے کوڈ ڈی کوڈ ہو جاتے ہیں تو احتشام اس پر بہت غصہ کرتا ہے۔ امو، حریم کو بتاتی ہیں کہ عمائم کی وجہ سے ایمان ان سے بات نہیں کر رہا، ان کی یہ بات ماہم سن لیتی ہے اور کہتی ہے کہ آج ایمان تو کل کوئی اور بھی عمائم کے لیے کھڑا ہوگا۔ ثریم بتاتی ہے کہ کرن اغوا ہو گئی ہے، عمائم، نورس سے کہتی ہے کہ کرن اغوا ہو گئی۔ وہ بے قصور تھی تو نورس کہتی ہے کہ تمہیں کیا پتا کہ وہ بے قصور تھی یا گناہ گار...... عمائم، اُم رومان کو جو اسے کھانا دینے آتی ہے باتھ روم میں بند کر کے باہر نکلتی ہے اور ایک لڑکی سے بات کر کے اپنا گاؤن اور کارڈ چینج کر کے جامعہ سے باہر نکل آتی ہے۔ عمائم کے پاس میسج آتا ہے تو وہ اپنی الماری میں دیکھتی ہے تو کپڑوں کے نیچے سے وہ پیکٹ مل جاتا ہے۔ عمائم اس پیکٹ کو کھول کر دیکھتی ہے لیکن ان عجیب سی چیزوں کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ عمائم، نورس سے ملنے جاتی ہے تو نورس اس کی بہت تعریف کرتی ہے اور اسے آفر کرتی ہے کہ اگر وہ نورس کے ساتھ کام کرے گی تو وہ اسے جامعہ کی ایڈمنسٹریٹر بنا دے گی اور اس کو وہ کلپ دکھاتی ہے کہ کس طرح وہ جامعہ سے بھاگ نکلی تھی۔ عمائم کہتی ہے میں اتنی بھاری ذمّے داری نہیں اٹھا سکتی...... عمائم، نورس کو بتاتی ہے کہ وہ پیکٹ مل گیا ہے لیکن پیکٹ سے برآمد چیزیں دیکھ کر وہ کہتی ہے کہ یہ سامان بدل گیا ہے۔ عمائم کہتی ہے کہ میں نے نہیں کیا تو وہ اسے خبردار رہنے کو کہتی ہے اور کہتی ہے کہ راشن ڈپو میں جا کر راشن اتروائے۔ اسٹور کا ہیڈ عمائم کو کہتا ہے کہ ڈیلر نے نیا ڈرائیور بھیجا تھا جس نے ایکسیڈنٹ کر کے سارے انڈے توڑ دیے ہیں۔ عمائم، ڈرائیور کو دیکھ کر الجھن کا شکار ہوتی ہے اور اسے چھپ کر نورس کی تصویریں لیتے دیکھ کر ساکت رہ جاتی ہے۔ عالی، عمائم کو بتاتی ہے کہ حریم کی کزن کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ روشان کوڈورڈ میں احتشام کو بتاتا ہے کہ مرغی کی تصویریں لیتے ہوئے اسے دیکھ لیا گیا ہے۔ احتشام کہتا ہے کہ چوزی نے دیکھا ہے تو کوئی پریشانی نہیں۔ عمائم جامعہ سے واپس جانے کے لیے نکلتی ہے تو احتشام اسے لفٹ دیتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ برطانوی نژاد کرن کی لاش ان کی جامعہ کے بیک سائڈ گٹر سے ملی ہے۔ عالی، کرن کی والدہ سے سوالات کرتی ہے اس رات کے بارے میں تو پتا چلتا ہے کہ کرن نے شاید راستے میں کسی کو لفٹ دی تھی۔ نورس، کرن کے گھر تعزیت کرنے آتی ہے تو عمائم کے ساتھ نورس اور عالی بھی حیران رہ جاتی ہیں۔ پھر وہ تائی امی کو گھر ڈراپ .... کر کے جامعہ آتی ہیں تو فٹ پاتھ پر ایک بظاہر بزرگ بیٹھا تھا جسے عالی کوئی رقعہ دیتی ہے تو وہ اپنی وگ اتار کر سامنے کی بلڈنگ میں چلا جاتا ہے، عمائم جب عالی سے پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ اسے اس نے دس روپے کا نوٹ دیا تھا۔ عمائم واپس وہاں

جاتی ہے تو اسے وہ نوٹ ملتا ہے جس پر لکھا تھا کہ میدان خالی ہے۔ جامعہ میں الیکٹریشن آتا ہے تو عمائم اس کے پیچھے جاتی ہے اور اس کو ایک آلہ دیوار میں نصب کرتے دیکھ کر سوچتی ہے کہ نورس کی جان کو خطرہ ہے۔ عمائم، احتشام کو کہتی ہے کہ اس کے دوست نے جامعہ میں گھس کر تصویریں لی ہیں تو وہ عمائم کی توجہ ہٹانے کے لیے کہتا ہے کہ روشان، عالی میں انٹرسٹڈ ہے، عمائم اور شام کو دیکھ کر دادی کچھ سوچنے لگتی ہیں۔ روشان کے گھر میں اذان اور احتشام تھے وہاں عالی آتی ہے تو احتشام انہیں بتاتا ہے کہ عمائم ان کی باتوں پر چونک رہی ہے۔ آج جامعہ میں دو لڑکیوں کا نکاح تھا اور یہ دن عمائم کے لیے بہت روح پرور ہوتا تھا۔ تائی امی بتاتی ہیں کہ ایمان نے کہا کہ میں اموجان کی نفرت کی وجہ جانے بغیر پیچھے نہیں ہٹوں گا اور بابا صاحب نے کہا ہے کہ ہمیں عمائم کی خوشی مقدم ہے۔ عمائم کے دل کو بابا صاحب کی باتیں لگی تھیں۔ ایمان، عمائم سے اس کا جواب جاننا چاہتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ میری رائے تائی امی کے پاس محفوظ ہے۔ ایمان، عمائم کو بتاتا ہے کہ امو نے اس فیصلے پر خاموشی اختیار کی ہے اور خاموشی نیم رضامندی ہوتی ہے۔ لہٰذا اب جلد ہی منگنی ہوگی۔ حریم، عمائم پر منگنی کو لے کر غصہ کرتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ اور کوئی آپشن ہی نہیں تھا۔ بسمہ، عمائم کو بتاتی ہے کہ امو کو جیل میں سے کسی نے فون کیا تھا اس لیے وہ تیار ہوئی ہیں۔ احتشام، عمائم کو کہتا ہے کہ یہ منگنی زیادہ دیر چلتی نظر نہیں آتی۔ دادی، عمائم کو کہتی ہیں کہ مجھے دادی نہ کہا کرو...... میں تمہاری ماں کی ماں ہوں اور عمائم یہ حوالہ جان کر بہت خوش ہوتی ہے لیکن دادی اسے کہتی ہیں کہ ابھی یہ بات کسی کو پتا نہیں چلنی چاہیے اور بابا صاحب اس کے لیے وہی فیصلہ کریں گے جو اس کے لیے بہتر ہوگا۔ عمائم کو میسج آتا ہے کہ ایمان دور اندیش نہیں ہے اور اسے ایسے شخص کا ہاتھ تھامنا چاہیے جو دور رس ہو۔ عمائم سب باتوں کو پس پشت ڈال کر قرآن کی تلاوت کرتی ہے تاکہ سکون حاصل کر سکے۔ ثریم کا عمائم کے پاس فون آتا ہے وہ بتاتی ہے کہ میں جانتی تھی کہ کرن نے نورس کو لفٹ دی تھی۔ وہ نورس کو چھوڑ گئی اور واپس نہ آ سکی اور میں یہ بات پھپھو کو نہ بتا سکی، عمائم سوچتی ہے کہ وہ یہ بات احتشام کو ضرور بتائے گی۔ امو کی طبیعت خراب ہوتی ہے احتشام ان کو اسپتال لے کر جاتا ہے، احتشام سے امو کہتی ہیں کہ ان کا ضمیر انہیں سکون نہیں لینے دیتا۔ احتشام، عمائم سے کہتا ہے کہ تمہاری جامعہ کی ایڈمنسٹریٹر کی جان کو خطرہ ہے لیکن وہ سیکیورٹی کی آفر ٹھکرا چکی ہے اگر وہ اسے راضی کر لے تو ان کی آفر برقرار ہے۔ عمائم، احتشام کو ثریم کی کال کے بارے میں بتاتی ہے۔ احتشام، عمائم سے کہتا ہے کہ رشتے اور سوچ میں فرق ہوتا ہے اور ایک محبِ وطن کمانڈو تمہاری مخبری کے لیے الرٹ رہے گا۔ امو، عمائم سے کہتی ہیں کہ تم ہو بہو ویسی ہی ہو، تم جانتی ہو تمہاری ماں نے کسے قتل کیا تھا۔ صوفی صالح کے چھ بیٹے اور ایک بیٹی تھی جس میں سے دو بیٹے اور ایک بیٹی حافظ قرآن تھی۔ عمامہ، شام سے ملنے آتی ہے تو وہ اسے واپس جانے کو کہتا ہے صوفی صاحب اسے دیکھ کر سوچتے ہیں کہ کہیں جانے کے لیے شام کو کہنے گئی ہوگی۔ طاہرہ، ساس کے پوچھنے پر کہتی ہیں کہ وہ چاہتی ہیں کہ عمامہ ان کی نظروں کے سامنے رہے جس پر وہ کہتی ہیں کہ شام کا رشتہ ان کی بہن نے فیقہ کے لیے دیا تھا۔ لیکن عمامہ اپنی پسند سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔ شام کی غیر موجودگی میں اس کا رشتہ فیقہ سے طے پا کر کارڈ بھی چھپوا کر بانٹ دیے اس پر عمامہ، شام کو طیش دلانے کی کوشش کرتی ہے مگر وہ کہتا ہے کہ مجھے تمہارے باپ کے سر پر رکھے عمامے اور اپنی عزت پیاری ہے۔ تم واپس لوٹ جاؤ۔ فیقہ اور عمامہ کی رخصتی ایک ساتھ طے کر دی تھی۔ طابہ (بھاوج) عمامہ کو کہتی ہے کہ شام بھی تمہیں بہت چاہتا ہے، تم اسے مجبور کرو گی تو وہ ضرور بولے گا۔ عمامہ، طابہ کے ذریعے شام کو بلاتی ہے اور اس کو سول میرج کے لیے راضی کرتی ہے ساری بات فیقہ سن لیتی ہے۔ عمامہ آنے والے فون پر کہتی ہے صوفی صالح کی بیٹی عمامہ حادثاتی موت کا شکار ہو گئی ہے۔ آپ بارات مت لائیے گا۔ عمامہ کو یہ بات کرتے طاہرہ سن لیتی ہیں، وہ اس پر غصہ کرتی ہیں وہ صوفی صالح سے کہتی ہیں ہم نے جلد بازی کر لی۔ فرخ (منگیتر عمامہ) اور اس کے بہنوئی کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے جس میں بہنوئی کی ڈیتھ ہو جاتی ہے، دونوں شادیاں نامعلوم مدت کے لیے کینسل ہو گئیں۔ شمسہ بھابی، عمامہ کو کہتی ہیں کہ طابہ سے دور رہو وہ تمہیں نقصان پہنچائے گی۔ عمامہ کا کالج میں ایڈمیشن ہوتا ہے تو دادی کہتی ہیں کہ وہ کوئی چاند چڑھائے گی۔ طابہ اپنے شوہر تقی سے کہتی ہے کہ فیقہ کو شام اور عمامہ کے حوالے سے کچھ شبہات ہیں تو تقی کہتا ہے کہ شام جس سے بھی بات کرے وہ اسے شک کی نگاہ سے دیکھیں گی۔ عمامہ کو کالج چھوڑنے شام جاتا ہے تو گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو جاتا ہے اور ایک آدمی ملتا ہے جو عمامہ کے لیے گھٹیا الفاظ استعمال کرتا ہے اور شام کے پوچھنے پر خود کو اس کا باپ بتاتا ہے۔ منصور سیال پھر فیکٹری جاتا ہے اور منیجر سے شام کی تنخواہ مانگتا ہے تو وہ اسے منع کر دیتا ہے۔ لیکن وہ شام سے دس ہزار لے کر ہی جاتا ہے۔ کالج میں جانے سے عمامہ گھبراتی ہے تو وہاں اسے سونیا ملتی ہے۔ سونیا کے ساتھ عمامہ کالج میں جلد ایڈجسٹ ہو جاتی ہے۔ سونیا جب عمامہ کے ساتھ گھر آتی ہے تو دادی کو وہ بالکل پسند نہیں آتی۔ عمامہ، سونیا کو بتاتی ہے کہ فیقہ کا یہ حشر کیسے ہوا وہ پہلے ایسی نہیں تھی۔ دادی، شام کو عمامہ کی ذمے داری اٹھانے سے منع کرتی ہیں تو وہ کہتا ہے مجھے صالح بھیا نے کہا تھا وہ منع کریں گے تو میں اسے لے کر

نہیں جاؤں گا۔ عمامہ، سونیا کو بتاتی ہے کہ فیقہ پھپو بہت پیاری تھی ان کی دوست نے ان کے منہ پر کوئی کریم لگادی جس سے ری ایکشن ہوااور گھر والوں نے اس کا صحیح علاج نہیں کرایا جس کی وجہ سے ان کی یہ حالت تھی کہ چہرہ عجیب سیاہی مائل ہو گیا تھا...... سونیا، عمامہ سے کہتی ہے کہ وہ فیقہ کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہے کہ وہ نارمل ہو جائے۔ منصور سیال کا فون آتا ہے تو عمامہ، شام کو بلانے جاتی ہے تو وہ اسے ڈانٹتا ہے کہ تم نے یہ کال کیوں سنی۔ تقی، شام کو بتاتے ہیں کہ فیکٹری کے سامنے پلاٹ کا جو کیس تھا وہ ہار گئے ہیں اور وہ پلاٹ منصور سیال نے لیا ہے اور اب وہ ان کے مقابل آکر بدلہ لینا چاہتا ہے کیونکہ صوفی صالح نے رابعہ (شام کی ماں) کے ساتھ منصور سیال کے سلوک کی وجہ سے اسے جیل کی شکل دکھائی تھی۔ اور شام کو خود لے آئے تھے۔ تاج بیگم (دادی) شام سے کہتی ہیں کہ وہ تین مہینے کے بعد فیقہ سے اس کی شادی کر دیں گی وہ تیار رہے۔ طاہر وکیل کے پاس جا کر پوچھتا ہے کہ اس نے یہ کیس کیوں ہارا تو وہ بتاتی ہے کہ آج تک وہ کوئی کیس جیتی ہی نہیں۔ فیقہ سوچتی ہے کہ اماں اور بھیا نے اس کے لیے شام کا انتخاب کیا ہے تو عمامہ اس کے رستے سے ہٹ کیوں نہیں جاتی۔ سونیا، عمامہ کو فون کر کے کہتی ہے وہ فیقہ کی برین واشنگ کر کے اس کو صحیح اور غلط فیصلے کی پہچان کروا کر اس کی دوسری جگہ شادی کروا دے گی۔ وہ ابھی بات کر رہی ہوتی ہے کہ فون کٹ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد فون پھر بجتا ہے تو فون پر سونیا کے دھوکے میں شام کے باپ منصور سے کہہ بیٹھتی ہے کہ وہ شام کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ سونیا، عمامہ کو کہتی ہے کہ وہ فیقہ کو بدلنے کے لیے کچھ بھی کرے گی۔ طابہ، عمامہ کو بتاتی ہے کہ اس نے منصور اور اس کی باتیں سن لی تھیں۔ سونیا، عمامہ کے گھر ایک جوکر کے روپ میں آتی ہے اور پھر کچھ کرتب دکھا کر سب کو خوش کرتی ہے اور پھر اپنا آپ ظاہر کر کے فیقہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے۔ اماں، فیقہ سے سونیا کی دی ہوئی گڑیا یہ کہہ کر لیتی ہیں کہ اس پر کوئی جادو ٹونا بھی ہو سکتا ہے تاکہ اس کی شادی نہ ہو اور طابہ ان کی باتیں سن کر فیقہ کے خدشات کو اور بھی ہوا دیتی ہے اور کہتی ہے کہ تم ان دونوں پر ظاہر کر دو کہ تم ان کی سازش سے واقف ہو۔ طاہر اور بسمہ ہمدانی کو منصور ہوٹل میں چائے پیتے دیکھ لیتا ہے۔ عمامہ، سونیا سے کہتی ہے کہ فیقہ نے اسے بلایا ہے، فرخ فون کر کے عمامہ سے بات کرتا ہے اور اسے شرمندہ کرتا ہے کہ اس کو فرخ کی عیادت تو کرنی چاہیے تھی۔ سونیا کے آنے پر جب فیقہ اس کی بے عزتی کرتی ہے کہ اس نے فیقہ پر عمامہ کے ساتھ مل کر جادو کیا ہے تو سونیا اسے کہتی ہے کہ وہ بدگمانی ہٹا کر دیکھے گی تو اسے خلوص کی پہچان ہوگی۔ منصور سیال، شام سے دوبارہ بیس ہزار روپے لیتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ صالح کی بہن سے شادی کر کے اپنے جذبات اور زندگی کے ساتھ کیوں کھیل رہے ہو پھر وہ صوفی صالح کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ عمامہ اور شام کی شادی کر دیں۔ طاہر اپنی پسند کو لے کر پھر سکتا ہے تو میرا بیٹا کیا گناہ کر رہا ہے۔ شام کے پوچھنے پر عمامہ بتاتی ہے کہ منصور نے اسے آفر کی تھی کہ وہ کورٹ میرج کرلے اس کی رضامندی کے ساتھ تو اس نے انکار کر دیا تھا۔ شام طاہر کے کسی پلان کے بارے میں عمامہ سے پوچھتا ہے تو وہ لاعلمی کا اظہار کرتی ہے۔ سونیا کالج نہیں آرہی تھی تو عمامہ فون کر کے اس کی خیریت دریافت کرتی ہے اور اپنے آنے کا کہتی ہے پھر بڑی مشکل سے وہ اجازت لیتی ہے تو دادی کہتی ہیں کہ اپنے بھائیوں کے ساتھ جاؤ لیکن طاہرہ، شام کو فون کر کے بلالیتی ہیں۔ سونیا اس کے آنے سے بہت خوش ہوتی ہے۔ سونیا، عمامہ کو بتاتی ہے کہ اس کی بہن کو محبت ہو گئی ہے۔ عمامہ کہتی ہے تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے...... پھر وہ چونکتی ہے کیا تم دونوں کو ایک ہی بندے سے محبت ہو گئی ہے۔

اب آگے پڑھیے

قسط نمبر: 14

آتش فشاں پہاڑ اس کے اوپر گر جاتا تو وہ اس قدر حیران نہ ہوتی۔ وہ خط جہاں پر زمین و آسمان یا سمندر و آسمان، زمین کی گولائی کی وجہ سے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جنہیں ''افق'' کہا جاتا ہے اگر نیلا افق اسے زندہ نگل جاتا تو بھی وہ اس قدر متحیر کبھی نہ ہوتی۔

زمین کے ایک طرف جھک کر اپنے مدار میں چلنے کی وجہ سے قطبین کے نزدیک سال کے کچھ دن سورج دن اور رات دونوں وقتوں میں نظر آتا رہتا ہے۔ ستر ڈگری عرض بلد شمالی سے کچھ پرے ناروے میں سورج بارہ مئی سے انتیس جولائی تک نظر آتا ہے اور غروب نہیں ہوتا۔ آدھی رات کے وقت بھی دکھائی دیتا ہے۔

قطب شمالی سے پرے اگر ناروے کی وہ رات عمائم خوش نصیبی سے دیکھ لیتی جس میں رات کے وقت بھی سورج آسمان پر نظر آتا تو عمائم تب بھی ایسے دم بخود ہرگز نہ ہوتی جس قدر ابھی برف کے مجسمے میں ڈھلی ساکت

اور جامد بیٹھی تھی۔ گویا اس میں سانس تک بھی باقی نہ ہو۔ اس کے اردگرد طوفانی ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے۔
عمائم اس وقت تیز طوفانی بگولوں کی زد میں تھی کیونکہ امو نے طوفان کے سارے رخ عمائم کی طرف موڑ دیے تھے۔ وہ ابھی تک بھونچکا کھڑی تھی۔ حیران، پریشان، متحیر، متعجب! یہ امو نے آخر کیا کہا تھا؟ اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک رہی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے سنبھل کر دھونکنی کے مانند چلتی سانسوں کے دوران تڑختے ہوئے پوچھا۔
''میری ماں نے کسی کو قتل کیا تھا؟ کسے؟ وہ کون تھا؟'' اس نے پھٹی، پھٹی آواز میں چیخ کر کہا۔ امو سابقہ انداز میں اسے دیکھتی رہیں۔ نرمی، ملائمت اور سکون کے ساتھ جیسے اسے بے سکون کر کے وہ بڑی مطمئن کھڑی تھیں۔
''بتایئے ناں..... اب خاموش کیوں ہیں؟ آپ کے پاس کوئی جواب نہیں کیا؟'' وہ بڑی بے اختیار تھی ورنہ امو کو پکڑ کر جھنجوڑ ڈالتی۔ انہیں بولنے پر مجبور کر دیتی، چلّا چلّا کر سارے زمانے کو اکٹھا کر لیتی۔ آخر یہ الزام کوئی معمولی نہیں تھا۔ اس کی ماں کو قاتلہ کہا جا رہا تھا۔ وہ کیسے خاموش رہتی؟ اس کی آواز تڑتڑاتی ہوئی دور، دور تک گئی اور تائی امی کی سماعتوں میں بھی اتری تھی۔ وہ دوسرے ہی لمحے بھاگتی ہوئی اسٹور روم سے باہر نکل آئیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ عمائم کے مقابل تھیں۔ انہیں صورتِ حال سمجھنے میں لمحہ بھی نہیں لگا تھا اور امو بھی تائی امی کو دیکھ کر خوفزدہ سہمی، سہمی سیڑھیاں چڑھ کر اپنے پورشن میں غائب ہو گئی تھیں۔ تائی امی نے تڑپتی عمائم کو سینے میں بھینچ لیا۔ وہ ابھی تک سسک، سسک کر رو رہی تھی۔
''سنا..... آپ نے امی! امو کیا کہہ رہی تھیں۔ میری ماں نے قتل کیا؟ کسے قتل کیا؟ میری ماں کہاں ہے؟'' وہ نانی کی ساری احتیاط بھلا کر تڑپ، تڑپ کر سوال کر رہی تھی۔ یہ سوال جو اس کی زخمی آنکھوں میں کرلا رہے تھے اُن کے جواب تائی امی کہاں سے لاتیں۔ وہ عمائم کی زخمی نگاہوں پر مرہم کے پھاہے اور امرت کے قطرے کیسے انڈیلتیں۔ ان کے پاس عمائم کی کسی بات کا جواب نہیں تھا۔ انہوں نے بمشکل اسے سنبھالا دیا۔ اس کے آنسو پونچھے، اس کا چہرہ چوما..... اسے صبر کرنے اور خاموش رہنے کا سبق دیا۔ برسوں سے یہ سبق وہ عمائم کو لوری کی طرح دے رہی تھیں۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔
''امو نے یہ کیوں کہا امی! کیا ان کی بھی کسی بات میں سچائی ہو سکتی ہے؟'' اس نے تڑپتے ہوئے اپنا سوال پھر سے دُہرایا تھا۔ تائی امی نے کچھ دیر کے لیے سوچا۔ بہت غور کیا۔ پھر نرمی سے اسے سمجھایا۔ وہ اس کے ذہن سے ہر جالا ہٹا دینا چاہتی تھی۔
''وہ ایک ذہنی مریضہ ہے۔ کسی بھی وقت اس کی دماغی رو الٹ سکتی ہے۔ وہ کچھ بھی کہے، خاموشی سے سن لو..... اس کی کسی بات میں سچائی نہیں ہے۔ اس نے جو بھی کہا، غلط کہا۔'' تائی امی کے ملائم لہجے میں بڑی سنجیدگی تھی۔ انہوں نے عمائم کی بے یقین آنکھوں میں دیکھ کر مزید کہا۔
''اس کو نفسیاتی بیماری ہے بیٹا! اول فول بول کر اپنی بھڑاس نکالتی ہے۔ پھر کرے بھی کیا؟ اندر کی گھٹن کسی بھی طرح باہر تو دھکیلنی ہوتی ہے ناں، اس کا کوئی قصور نہیں..... بیچاری بڑے پرانے روگ میں جھلس رہی ہے۔'' ان کی آواز دھیمی ہو رہی تھی۔ عمائم کے آنسو رک گئے تھے۔ اس کا بے چین دل ٹھہر سا گیا۔
''لیکن میری ماں.....؟'' ایک کراہتا نوحہ عمائم کے لبوں پر آ کر دم توڑ گیا تھا۔ اسے نانی کی تنبیہ اچانک یاد آ گئی تھی۔ وہ اپنی ماں کے بارے میں کوئی سوال نہیں کر سکتی تھی۔ وہ نانی کے حکم کی پابند تھی۔ اس نے ایک عہد کیا تھا۔ اب وہ بدعہد کیونکر کہلاتی؟ ہر سوال دل کے اندر گھٹ، گھٹ کر دم توڑ گیا تھا۔

☆☆☆

لان بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ رنگ، رنگ کی روشنیوں سے دمک رہا تھا۔ مصنوعی آرائشی سامان اور تازہ گلابوں سے اسٹیج

کی سجاوٹ کی گئی تھی۔ پورے لان میں رنگ و بُو کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ تائی امی نے سارے خاندان کی کریم اکٹھی کر رکھی تھی۔ لہراتے آنچل، اپ ٹو ڈیٹ جوان، بزرگ اور خواتین کی قہقہوں میں بھیگتی شام عمائم کو کسی اور کا نصیب بنا گئی تھی۔

تالیوں کی گونج میں عمائم کے داہنے ہاتھ میں ایمان کے نام کی انگوٹھی سج گئی تھی۔ آج تو ایمان کی ترنگ کچھ اور ہی تھی۔ وہ تائی امی کا کب سے سر کھا رہا تھا۔ عمائم کو خود انگوٹھی پہنانے کے لیے اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا تاہم تائی امی نے اس کی پہلی ڈیمانڈ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے انگوٹھی خود پہنائی تھی۔ اس فنکشن میں امو بھی موجود تھیں اور بابا صاحب کے علاوہ تایا ابا، بڑے ابو، پاپا اور چاچو وغیرہ سب اسٹیج پر باری، باری آئے تھے۔ عمائم کو اس وقت اپنے نصیب پر رشک آیا تھا جب بابا صاحب نے بھیگی آواز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”اپنے نصیب پر شاکر رہنے والوں کے لیے کامیابی ہے، مجھے فخر ہے کہ تم نے میرا جھکا سر اٹھا دیا۔ میں اس جہان اور اُس جہان میں تم سے راضی ہوں عمائم...... ! ہو سکے تو معاف کرنا۔“ بابا صاحب کی آواز کپکپا رہی تھی۔ ان کے ہاتھ رعشہ زدہ مریض کی طرح کپکپا رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ عمائم اس وقت دم بخود رہ گئی تھی۔ جب بابا صاحب نے اس سے معافی مانگی، آخر انہوں نے عمائم سے معافی کیوں مانگی تھی؟ وہ تو لرز کر رہ گئی تھی۔ اتنے بزرگ نانا کے منہ سے معافی کے الفاظ نے اسے تھرّا کر رکھ دیا تھا۔ اسے پچھلے سارے زیاں بھول گئے تھے۔ سارے خسارے بھول گئے تھے۔ سارے نقصان بھول گئے تھے۔ یاد رہا تو بس اتنا اگر ایمان سے منگنی نہ ہوتی تو اتنا دلفریب لمحہ کہاں سے ہوتا جب بابا صاحب اسٹیج پر آ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بھیگی آواز میں کہہ رہے تھے۔ ”تم نے میرا جھکا سر اٹھا دیا۔“ عمائم اندر تک سرشار ہو گئی تھی۔ اب دل میں دور، دور تک کسی دکھ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ کسی کو کھو دینے کا درد نہیں تھا۔ محبت ملنے سے پہلے بچھڑنے کا غم نہیں تھا۔ احتشام کو کھو دینے کی کسک نہیں تھی۔

اس نے اِک عجیب سی ترنگ کی لہر اپنے دل میں اٹھتی محسوس کی تھی۔ اب وہ اعصابی دباؤ کی زد سے نکل آئی تھی۔ کچھ پانے کے لیے کچھ ہارنا تو پڑتا ہے۔ اس نے بابا صاحب کا اعتماد جیت کر اگر محبت ہار دی تھی تو یہ خسارہ گوارا تھا اسے۔ وہ اپنی فرینڈز کو دیکھ رہی تھی۔ عالی جو احتشام کے ساتھ محوِ گفتگو تھی اور ثریم، تائی امی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ روشان اور اذان خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

ایک خوب صورت شام کا بڑا دلفریب اختتام ہو گیا تھا۔ وہ آج عام دنوں سے ہٹ کر تیار ہوئی تھی اس لیے بڑی خوب صورت لگ رہی تھی۔ جب مہمان چلے گئے تو ینگ پارٹی نے روشان سے فوٹو شوٹ کروایا تھا۔ سب لوگ باری، باری اسٹیج پر جا کر کبھی عمائم تو کبھی ایمان کے ساتھ فوٹوز بنوا رہے تھے۔ ثریم اور عالی نے بھی پکچرز اور مووی بنوائی تھی۔ پھر عالی نے جھک کر عمائم کے کان میں کچھ کہا تھا۔ یوں کہ وہ سرسوں کے پھول کی طرح زرد ہو گئی۔

”یہ تو نے کیا کر دیا؟ یہ تو نے کیا کر دیا؟“ وہ اس کے کان میں سیسہ انڈیل کر اسٹیج سے اتر گئی تھی۔ عمائم سے اسے روکنا بھی محال ہو گیا تھا۔ وہ دور سے بھی عالی کے چہرے پر پھیلی ناگواری اور عجیب سے تاثر کو دیکھ سکتی تھی۔ اسے عالی کا انداز غیر معمولی لگا تھا۔ اکھڑا، اکھڑا، افسردہ، افسردہ جیسے وہ اس ڈرامے کے ”رنگین سین“ کو مس فٹ سمجھ رہی تھی۔ عمائم کا دل جیسے اتھاہ میں اتر گیا۔ اس کی ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ رہی تھیں۔ پھر جب روشان اور اذان نے بھی نیو کپل کے ساتھ مووی بنوالی تب کسی نے احتشام کو آواز لگا کر کہا۔

”تو نے مووی نہیں بنوائی! ارے اسی بہانے دلہن، دولھا کے ساتھ کھڑا ہو جا۔ کیا خبر، قسمت کی یاوری سے ایمان کی منگنی کا تجھ پر بھی اثر ہو جائے۔ اور کل تیری منگنی کا کھانا کھانے ہم پھر چلے آئیں۔“ وہ احتشام کا کوئی.... بے تکلف دوست تھا جو اسے چھیڑ رہا تھا۔ عمائم کی ساری حسیات بیدار ہو گئی تھیں۔ اس کے کان احتشام کی آواز سننا چاہتے تھے۔ اس نے پلکوں کی چلمن اٹھا کر دیکھا۔ احتشام کچھ ہی فاصلے پر کھڑا تھا۔

''میں پرائی منگیتر کے ساتھ کیوں فوٹو بنواؤں؟ اپنی منگیتر ہوگی تو مووی بھی چلے گی اور فوٹو سیشن بھی ہوگا۔ میں پرائی چیزوں کو دیکھتا بھی نہیں۔'' اس کا انداز شوخ سا تھا لیکن عمائم کے دل میں اس کے الفاظ ترازو کر گئے تھے۔ عجیب سی چبھن نے دل میں چٹکی سی بھری تھی۔ وہ خود سے بھی جیسے ناراض ہوگئی۔

''او...... دیکھو تو، کوئی ''تاڑ'' کر رکھی ہے کیا؟ ابھی بتادو، ایمان کے ساتھ ہی نپٹا دیتے ہیں۔'' اذان نے اسے آڑے ہاتھوں پکڑا تھا۔ احتشام نے مسکرا کر جتایا۔

''ایمان کے ساتھ کیسے نپٹ سکتا ہوں؟'' اس کا معنی خیز انداز روشان اور اذان سمجھ گئے تھے تاہم ایمان نے حظ اٹھاتے ہوئے لطیف سا طنز کیا تھا۔

''جس کی طرف انگلی اٹھاؤ، لمحوں میں حاضر ہوجائے گی۔'' وہ احتشام کو چڑا رہا تھا۔ اس نے ایمان کے کندھے پر ایک دھپ لگائی...... اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ گویا ہوا تھا۔

''وہ انگلی اٹھانے سے حاضر ہونے والی نہیں...... اس کے لیے آگ کا دریا پار کرنا ہوگا۔'' احتشام کی سنجیدہ آواز پر بڑی زوردار قسم کی ہوٹنگ ہوئی تھی۔ طرح، طرح کی ہر کونے سے آوازیں ابھریں۔

''کون ہے وہ؟''

''کدھر ہے وہ؟''

''کب آئے گی وہ۔'' اتنا شور اٹھا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ احتشام کان دبا کر اسٹیج سے اتر گیا تھا۔ اس کے اترتے ہی عمائم نے سکھ کی سانس لی۔ حالانکہ اندر کہیں ویرانی سی اتر رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی دل میں سناٹا چھا رہا تھا۔ اس کے کانوں میں اِک نوحہ سا کرلانے لگا۔

عشق تھا کہ وحشتیں
جنون تھا کہ جستجو
جہان بے حیات میں چارسو
سفرنصیب خواہشیں
سفرنصیب خواہشوں کی بے اماں مسافتیں
وہ بے قرار راستے
جو منزلوں کے خواب تھے
ہم پہ یہ دیر سے کھلا
کہ یہ تو بس سراب تھے
حاصلِ سفر ہے وہی
سفر کی جو اساس تھا
لکھا تھا جو نصیب میں
سو مل گیا وہی ہمیں

زندگی ہمیں وہ کچھ کرنے پر مجبور کردیتی ہے جس کا ہم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوتا۔
اور زندگی میں دو باتیں انتہائی تکلیف دہ ہوتی ہیں ایک جس کی خواہش کی ہو اس کا نہ ملنا اور دوسرا جس کی خواہش نہ کی ہو، اس کا مل جانا...... یہ اذیت کا بڑا پُرکیف مرحلہ تھا۔ جس میں لذت درد تکلیف دینے کے بجائے اپنے ہونے کا احساس دلاتی تھی۔ درد بڑھاتی تھی۔ ٹھیس لگنے سے ہی احساس ہوتا ہے۔ اپنا درد کسی اور کے درد سے

کم نہیں...... اگر میزان میں تولا جائے تو دونوں درد متوازن ہوں گے۔ عمائم پر اسی اسٹیج پر بیٹھے، بیٹھے انکشاف ہوا تھا۔ وہ اپنے درد میں ماہم کی اذیت کو فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ اسے ابھی، ابھی الہام ہوا تھا۔ محبت ایک زخم ہے، جو کسی فصد سے نہیں کھلتا، نہ کسی مرہم سے سل جاتا ہے۔ سو عمائم کا زخم سل سکتا تھا نہ ماہم کا درد کم ہو سکتا تھا۔ اسے آج اندازہ ہو گیا تھا محبت حاصل کرنا ہر کسی کے لیے ممکن نہیں، لیکن محبت پھیلانا ہر ایک کے لیے ممکن ضرور ہے۔ اگر کوئی سمجھ لے تو...... وہ عالی اور ثریم کے ہمراہ اسٹیج سے اترتے یہی سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

''تمہاری نزدیک کی نظر کمزور تھی عمائم!'' اس کے بالوں سے پنیں، رولر، دوپٹا وغیرہ احتیاط سے اتارتے ہوئے ثریم نے کوئی دسویں مرتبہ حسرت آمیز لہجے میں پوچھا تھا۔ عالی جو اس کے کپڑے تہ کر رہی تھی تیکھے چتونوں سے دیکھ کر رہ گئی۔ کیونکہ ثریم جواب لیے بغیر ٹلنے والی نہیں تھی۔ حالانکہ عمائم نے کوئی ایک سو چالیس مرتبہ اسے بتایا تھا۔

''میری دور نزدیک کی نگاہ اللہ کے فضل سے ٹھیک ہے۔'' وہ قدرے جھنجلا کر بولی تھی پھر آئینے میں اپنے سندر روپ کو دیکھ کر نظر چرا گئی۔ اسے اپنا سجا بنا سراپا الجھا رہا تھا۔

''لگتا تو نہیں......'' ثریم نے چڑ کر کہا۔

''کیوں؟'' وہ حیران ہوئی تھی۔ عالی گہری سانس کھینچ کر رہ گئی کیونکہ وہ ثریم کی بات کا پس منظر جانتی تھی۔

''وہ احتشام تھا ناں...... ہیرو سا، کیا وہ تمہیں دکھائی نہیں دیا؟'' ثریم نے بالآخر دل کی بات کو زبان دے دی تھی۔ عمائم نے گھور کر اسے دیکھا...... اور قدرے تلخی سے بولی تھی۔

''ایمان بھی کسی ہیرو سے کم نہیں......'' اس کا انداز روکھا سا تھا۔ ثریم نے سر ہلایا۔ جیسے تائید کی ہو۔

''میں نے کب کہا، ایمان کسی سے کم ہے یا زیادہ...... میں تو کچھ اور بتانا چاہ رہی تھی۔'' ثریم متذبذب سی بول رہی تھی۔ جیسے کہنے یا نہ کہنے کے درمیان چکرا رہی ہو پھر اس نے کہہ دینا ہی مناسب سمجھا۔

''سنو عمائم!'' ثریم نے اس کا بازو دبوچ لیا۔ عالی بھی ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ عمائم بھی چونکی۔

''پورے فنکشن کے دوران میں نے ایک چیز بڑی شدت سے نوٹ کی تھی۔ جانتی ہو کیا؟'' ثریم نے کہا۔ اس کے لہجے میں۔ کچھ غیر معمولی پن ضرور تھا۔

''کیا؟'' عمائم کی جگہ عالی نے پوچھا۔ اس کے انداز میں بھی تجسس تھا۔

''احتشام ہے ناں...... وہ پورے فنکشن میں صرف تمہیں دیکھتا رہا۔ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر...... میں نے بہت دفعہ اس کی محویت نوٹ کی تھی۔ بہت دفعہ میں چوکنا ہوئی۔ بہت دفعہ میں نے ایسی باتیں سوچی تھیں جو اس وقت سوچنا مناسب نہیں تھا۔'' ثریم نے اپنی الجھن کی وضاحت کر دی تھی۔ عمائم لحوں میں نگاہ چرا گئی۔ دل کی دھڑکنیں بہت بے ترتیب ہوئی تھیں۔ اتنی ٹھنڈ میں اس کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔

''اور میں نے بھی......'' عالی نے سر جھکا کر کہا۔ ''ثریم ٹھیک کہہ رہی ہے، کیا تمہیں نہیں لگا عمائم کہ احتشام کی ان نگاہوں میں مقناطیسی کشش تھی۔ جو انجان لوگوں کو بھی محسوس ہو گئی۔ پھر تم کیسے بے نیاز رہیں؟'' اس کے سوال نے عمائم کو گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ حواس باختہ ہو گئی...... وہ ان دونوں کو جھٹلا دینا چاہتی تھی۔ لیکن یہ اتنا بھی آسان کام نہیں تھا۔ مقناطیس کی وہ کشش عمائم کی نگاہوں کو کئی مرتبہ بے لگام کرنا چاہ رہی تھی لیکن اس نے خود پر صبر اور ''ضبط'' کے پہرے بٹھا لیے تھے۔ اپنی نگاہ کی خیانت سے بچ رہی تھی وہ۔

''تم کیا کہتی ہو......؟'' ثریم اس کی رائے لینا چاہ رہی تھی۔ اس کے انداز میں بڑا تجسس تھا۔ عمائم نے جھنجلا

کر وضاحت کی تھی۔
''غلط فہمی کے سوا کچھ بھی نہیں...... وہ پرائی چیزوں کو دیکھتا نہیں...... میں کیسے مان لوں......؟'' اس کے انداز میں ناگواری تھی۔ جیسے یہ بیکار بحث اس کی طبیعت پر گراں گزر رہی تھی۔ وہ اس گفتگو کو سمیٹ دینا چاہتی تھی۔ لیکن عالی نے ایسے نہیں کیا...... بلکہ وہ بڑے سکون سے مسکرا کر کہہ رہی تھی۔
''کیا خبر، وہ اپنی ''چیز'' کو دیکھ رہا ہو۔'' عالی کے انداز میں زبردستی کی چلبلاہٹ تھی۔ اس نے عالی کو گھور کر دیکھا۔
''بکو نہیں...... میں ایسا مذاق برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ بھی اس صورت میں جب میری منگنی نے مجھے ایمان کا پابند کر دیا ہے۔'' وہ تلخی سے بڑبڑائی تھی۔ ثریم اس کا موڈ بدلنے کے لیے بولی تھی تاکہ اس کا برہم مزاج بہتر ہو سکے کیونکہ اچانک اسے بھی خیال آ گیا تھا کہ عمائم کسی اور کی پابند ہو چکی ہے۔
''ایمان تو خوش لگ رہا تھا۔'' ثریم نے جلدی سے گفتگو کا رخ بدل دیا تھا۔ مبادا ان تینوں کے درمیان تلخ کلامی ہو جاتی۔ ویسے بھی آج کے دن عمائم کا دل برا کرنا ان دونوں کو زیب نہیں دیتا تھا۔
''واقعی...... خواہشیں پوری ہوں تو چہرے خوشی کا اعلان کرتے ہیں۔'' عالی نے تائید کی پھر ثریم کو چھیڑتے ہوئے بولی۔
''تم بھی ثریم! کسی کو پھانس لیتیں...... عمائم کی فیملی میں سارے خوب صورت جوان ہیں۔'' عالی نے ثریم کے گرد دائرہ تنگ کیا تو وہ چلا اٹھی تھی۔ جیسے دل پر ہاتھ پڑا ہو۔
''ظالم......! سوئے ہوئے ارمان جگا ڈالے ہیں۔'' وہ خوشی سے سرشار چہک کر مسکرائی تھی۔ عالی نے اس کا ریکارڈ لگایا تھا۔ عمائم بھی ہنسنے لگی۔
''تو پھر میری بات چلا دو ناں......'' ثریم نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔
''کس سے......؟'' اس نے عمائم کو دیکھتے ہوئے ثریم سے پوچھا تھا۔ وہ بھی دلچسپی سے ثریم کو دیکھ رہی تھی۔
''وہ احتشام ہے ناں؟'' ثریم نے زبردستی شرمانے کی ایکٹنگ کرنے کی کوشش میں مضحکہ خیز شکل بنائی تو عالی اور عمائم دونوں چیخ پڑی تھیں۔
''کیا کہا؟'' ان دونوں نے چلا کر پوچھا۔ جیسے سننے میں مغالطہ ہوا ہو۔ انہیں احتشام کے نام پر دھچکا لگا تھا۔
''پوری بات سن لو......'' ثریم تنک کر بولی۔ ان کی چیخوں کو بریک لگے تھے۔ جیسے کہہ رہی ہوں، جلدی بکو۔
''وہ احتشام کا بھائی اذان ہے ناں......؟ یقین کرو، مجھ سے فون نمبر مانگ رہا تھا۔'' ثریم نے شرما کر راز اگل دیا تھا۔ عالی اور عمائم دھک سے رہ گئیں۔ پھر اُن دونوں نے ثریم کی درگت بنا دی تھی اور اذان کو بھی غائبانہ کوسا۔
''چھچھورا کہیں کا......'' عمائم نے بے ساختہ کہا۔
''پہلی ملاقات میں نمبر بھی مانگ لیا۔'' عالی نے بھی ٹکڑا لگایا۔ ثریم بری طرح پھنس گئی تھی پھر بھنا کر ان دونوں کو کوستی ہوئی اٹھی اور دھپ، دھپ کرتی باہر نکل گئی۔ جبکہ عالی اور عمائم کی ہنسی نے اس کا دور تک تعاقب کے ساتھ۔ دوستوں کی ہمراہی میں عمائم بھی وقتی طور پر بہل گئی تھی۔

☆☆☆

سب گھر والے غالباً سو چکے تھے عمائم جاگ رہی تھی، وہ کچن کی طرف چلی گئی اسے چائے پینا تھی۔ چائے لے کر اپنے کمرے میں جانے کے بجائے گیلری کا دروازہ کھول کر ٹھنڈے ٹھار برآمدے میں آ گئی تھی۔ یہاں سے املی کا سوکھا ٹنڈ پیڑ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ عمائم نے کچھ غور کیا تو دھک سے رہ گئی۔ وہاں ایک ہیولا نظر آیا۔ اتنی شدید ٹھنڈ میں ایک لرزتا وجود املی کے ٹنڈ پیڑ کے نیچے کیا کر رہا تھا۔ عمائم کچھ آگے بڑھی تو اسے ہلکی سی آواز سنائی دی۔ اس

کا دل لمحہ بھر کے لیے سکڑ گیا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں، لرزتی کانپتی، بھیگی آواز میں نوحہ کناں ماہم تھی۔ اس کی آواز کے ''کرب......'' نے عمائم کو ساکت کر دیا تھا۔ وہ ہونٹ بھینچے املی کے ٹنڈ تنے سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے نہ جانے کس درد اور اذیت کی رہ گزر سے گزر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر لرزتے موتی گواہ تھے کہ ماہم بے آواز رو رہی ہے۔ عمائم نے کبھی اسے اس حال میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ ہنستی مسکراتی اپ ٹو ڈیٹ رہا کرتی تھی۔ وہ تو بڑی شوخ و چنچل ہوا کرتی تھی پھر اس کے غرور کو کس نے ٹھیس پہنچادی تھی؟ اس ''بت'' کے اندر دراڑ کہاں سے آئی؟ کسی غم کی دھار نے کیونکر اسے بھگوڈالا تھا؟ عمائم متوحش سی اس کی بھیگی آواز سنتی رہی۔ وہ منہ ہی منہ میں کوئی اداس گیت گنگنا رہی تھی۔

آواز تھم گئی تو عمائم کو لگا ساری کائنات لمحہ بھر کے لیے تھم گئی ہے۔ ہر چیز پر جیسے سکوت طاری ہو گیا۔ بس ماہم کی آواز کا درد بول رہا تھا۔ جس نے عمائم کی روح میں ہلچل مچادی تھی۔ اس نے مضطرب انداز میں ماہم کے کندھے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈالا تھا۔ وہ بے ساختہ چونک کر پلٹی۔ پھر ایسی آگ بھری نگاہ اٹھائی جس نے عمائم کو لمحوں میں جھلسا دیا تھا۔ اس نے ان نگاہوں سے نظر چرا کر بمشکل کہا۔

''ماہم! کیا کر رہی ہو اس وقت......؟'' اسے اپنی ہی آواز اجنبی لگی تھی۔ شاید وہ دبے قدموں واپس پلٹ جاتی لیکن ایسی خود غرضی کا مظاہرہ عمائم نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ماہم کو سسکتا دیکھ کر بھی پلٹ نہیں سکتی تھی۔ اس کی آواز پر ماہم بے ساختہ چونکی۔

''کچھ سیکھ رہی تھی۔'' ماہم کی آواز اب بھی پُر نم تھی۔ لہجہ اداس، ویران اور بھرایا ہوا تھا۔ اس کے دل کو کچھ ہوا۔

''کیا سیکھ رہی تھیں تم...... اس تنہائی میں؟ اتنی شدید ٹھنڈ میں......'' وہ گھبرا کر بولی۔ ماہم اسے خالی، خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں اتنا خالی پن تھا کہ عمائم تھرا اٹھی۔ یہ محبت اتنا خوار کرتی ہے؟ عمائم کا دل لرز اٹھا۔ ماہم سر جھکا کر گھاس نوچتی اپنے دھیان میں بڑبڑائی تھی۔

''میں ''صبر'' کرنے کا سلیقہ سیکھ رہی تھی۔ لیکن صبر ہے کہ آتا ہی نہیں، لاکھ چاہوں بھی تو نہیں...... ہزار کوششوں کے بعد بھی نہیں...... میں نے تو سنا تھا یہ صبر کسی امرت کے مشابہ ہے۔ لیکن مجھے تو یہ صبر سم قاتل کے سوا کچھ نہیں لگتا۔ رگوں کو کاٹ رہا ہے۔ دل کو پگھلا رہا ہے، سانسوں کو بھنبوڑ رہا ہے۔'' وہ بے انتہا مضطرب تھی۔ عمائم دم بخود رہ گئی تھی۔ یہ بے پروا سی مغرور ماہم نہیں تھی۔ یہ تو کوئی اور ماہم تھی۔ محبت کے سفر پر رواں دواں اس سے بھی کچھ اور آگے عشق کے پہلے قدمچے پر کھڑی۔ اس ہجر پر آنسو بہاتی جو اس کے نصیب میں لکھ دیا گیا تھا۔ آخر یہ قلانچیں بھرتی ماہم کب سے ایمان کے لیے اتنی آگے تک چلی گئی تھی؟ یہ سانحہ اس کے دل پر کب گزرا۔

''مجھے تو خبر نہیں تھی۔ وہ تو سانسوں میں بستا ہے۔ روح میں بستا ہے اس کا بسیرا تو میری ذات کی عمارت کے ہر کونے میں تھا۔ میں تو سمجھ ہی نہیں سکی۔ ایک گھر میں، ایک ساتھ رہتے ہوئے، ایک ہی ڈگر پر چلتے ہوئے وہ سیدھی سڑک سے ٹرن لے کر رستہ بدل جائے گا اور میرے اندر آگ ہی آگ بھر دے گا۔ جدائی کی آگ، بے وفائی کی آگ...... حالانکہ کسی عہد کا کوئی چراغ میری ہتھیلی پر نہیں رکھا گیا تھا۔ یہ تو میں ہی بس......'' وہ ابھی تک املی کے تنے سے سر پٹخ رہی تھی۔ وہ سسک رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی۔ عمائم بے دم سی ہو گئی۔

''دیکھو عمائم! میرے ہاتھ خالی رہے...... اور میں کس منزل کی طرف سفر کروں؟ میری منزلیں گم ہوئیں۔ میرے رستے کھو گئے، میں کہاں جاؤں عمائم......!'' اس نے بے خیالی میں اپنا ماتھا رگڑا تھا۔ جیسے کوئی نادیدہ چیز کھرچ رہی ہو۔

''یہ دیکھو، میرا نصیب جو میری پیشانی پر کھدا ہے۔ اس پر ہجر کے عذاب لکھے ہیں۔ میں ان کو کھرچ ڈالنا

چاہتی ہوں۔'' ماہم زیر لب بڑبڑاتی اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔ عمائم نے گھبرا کر اسے جھنجوڑ دیا۔ پھر زبردستی اسے کھینچ کر اندر تک لے آئی تھی۔ ورنہ تو وہ برف میں جم کر خودکشی کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ عمائم اسے زبردستی گرم لحاف میں گھسا کر، پانی پلا کر اس پر آیت الکرسی پھونک کر باہر آ گئی۔

☆☆☆

وہ دروازہ احتیاط سے بند کر کے جیسے ہی پلٹی سامنے احتشام کو کھڑا پایا۔ وہ لحہ بھر کے لیے گھبرا سی گئی تھی۔ کیونکہ احتشام کا اس وقت یہاں ہونا ناممکن سی بات تھی۔ خیر، وہ ہر ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے ہر جگہ موجود ہو سکتا تھا۔ ویسے بھی اسے دوسروں کی ''ٹوہ'' میں رہنے کی عادت تھی۔ مہذب لفظوں میں اسے جاسوسی کہتے ہیں۔ وہ جو ماہم کی بگڑتی ذہنی کنڈیشن پر سخت تشویش کا شکار تھی۔ احتشام کو دیکھ کر کچھ اور ہراساں ہو گئی۔ وہ اسے ماہم کے روم سے نکلتا دیکھ چکا تھا۔ چونکہ ماہم کے ساتھ تو عمائم کے تعلقات کبھی مثالی نہیں رہے تھے۔ سو احتشام کا چونکنا فطری امر تھا۔ ایسا تو دونوں کے درمیان بہناپا نہیں تھا جو وہ وقتاً فوقتاً ایک دوسرے کے کمروں سے دریافت کی جاتیں۔ اب عمائم کو احتشام کی تفتیش بھی کھٹکتی تھی۔ حالانکہ کم از کم آج کی رات وہ احتشام کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ آج کی شام ہی اس کے داہنے ہاتھ میں ایمان کے نام کی انگوٹھی سجائی گئی تھی۔ اسے متذبذب کھڑا دیکھ کر احتشام ذرا سا مسکرا دیا۔

''یقینی طور پر نیند نہیں آ رہی؟ آج آئے گی بھی کیوں...... ؟ آخر سپنے تمہارے بڑوی بُنیں گے۔'' وہ اس کے چہرے پر پھیلی پریشانی کو سمجھتے ہوئے بھی منگنی کو جتانے سے خود کو روک نہیں پایا تھا۔ عمائم نے سلگتی نگاہ سے اسے دیکھا۔

''سپنوں کے لیے عمر پڑی ہے۔ اور بھی غم ہیں زمانے میں سپنے دیکھنے کے سوا۔'' وہ چڑ کر بولتی چلی گئی۔

''منگنی نے تمہارے مزاج پر کوئی خوشگوار اثر نہیں ڈالا۔ تم پہلے سے بھی زیادہ چڑچڑی نظر آ رہی ہو۔'' احتشام نے اپنی نظروں سے اس کا ایکسرے کیا تھا وہ اور بھی بھنا گئی۔ اس کی دوربین نگاہوں سے عمائم کو شدید الجھن ہوا کرتی تھی۔

''آپ نے میرے مزاج پر تھیسس لکھنا ہے؟'' اس نے تیور بگاڑ کر پوچھا۔

''تھیسس نہیں، پوری کتاب۔'' احتشام نے اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ وہ اسے جان کر زچ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور عمائم سمجھ کر بھی زبردستی زچ ہو رہی تھی۔

''ویسے تم نے بتایا نہیں؟ نیند کیوں نہیں آ رہی تمہیں؟'' اس نے بڑی ہمدردی سے پوچھا تھا۔ گویا اس پریشانی سے بڑا احتشام کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ سو یہ مسئلہ آج ہی حل کرنے کا ارادہ تھا۔

''کیا منگنی کی خوشی میں......'' اس کی خاموشی دیکھ کر احتشام نے پھر سے ہمدردی کے ساتھ پوچھا۔ ''یا منگنی کے غم میں......؟'' اس نے بڑی معصومیت کا مظاہرہ کیا تھا۔ عمائم سلگ کر رہ گئی تھی۔ اسے احتشام سے ہر قسم کی بکواس اور فضول گوئی کی توقع تھی۔

''مجھے کیوں غم ہونے لگا...... ؟ یہ منگنی زبردستی کا نتیجہ تھوڑی ہے۔'' عمائم نے اپنے تئیں اسے لاجواب کرنا چاہا تھا۔ لیکن احتشام کی مسکراہٹ نے اسے سلگا ڈالا تھا۔ وہ بھنا کر اسے دیکھتی رہ گئی۔

''پھر بدروح بنی کیوں چکرا رہی ہو؟'' احتشام نے نچلا ہونٹ دبا کر مسکراہٹ سمیٹ کر پوچھا۔ اسے اچانک اپنے اب تک جاگنے کی وجہ کا خیال آ گیا تھا۔ وجہ جو کمرے میں بند تھی۔ اسے ماہم کی ژولیدگی پر گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ شدید ذہنی بدحالی کا شکار تھی۔ ماہم کے حال نے اسے بے حال کر دیا تھا۔ احتشام اس کا ایک، ایک تاثر پڑھتا رہا، سمجھتا رہا۔

''ماہم ٹھیک نہیں ہے۔'' عمائم نے دھیمی آواز میں بتا دیا۔ وہ اسے مزید اپنے بارے میں گفتگو کا موقع نہیں دینا

چاہتی تھی۔
''ٹھیک ہو بھی نہیں سکتی......'' احتشام نے ایک طویل سانس کھینچ کر کہا۔ اس نے سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا۔ عمائم بے ساختہ چونکی تھی۔
''کیوں......؟'' عمائم نے ہونق پن کی انتہا کر دی تھی۔
''کیوں کا کیا سوال؟ بیچ میں تم جو کھڑی ہو......'' وہ بلا کا منہ پھٹ تھا۔ ہر بات منہ پر دے مارتا تھا۔ عمائم جانتے بوجھتے اس کے ساتھ بحث میں پڑ گئی تھی...... اور اب حسبِ معمول پچھتا رہی تھی۔
''میں بیچ میں نہیں کھڑی۔'' عمائم احتجاجاً چیخی۔
''کھڑی تو ہو...... اس حقیقت کو جھٹلانا آسان نہیں......'' وہ اپنی بات پر قائم تھا۔ عمائم کو دکھ سا ہوا۔ لیکن فی الوقت وہ ماہم کے موضوع سے ہٹنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ عجیب سی کشمکش کا شکار تھی۔ وہ ماہم کی تکلیف کو کم کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اسے فی الحال کوئی راہ سجھائی دے رہی تھی۔
''ماہم بہت تکلیف میں ہے۔'' اس نے مضطرب انداز میں کہا۔
''ضرب گہری ہو تو چوٹ کے درد کا اثر بھی طویل تر ہوتا ہے۔'' احتشام نے نرمی سے جتایا۔
''میں نے ماہم کو زندگی میں پہلی مرتبہ ایسے حالوں میں دیکھا ہے، مجھے یقین نہیں آتا۔'' وہ بے قراری سے انگلیاں مسلتی رہ گئی تھی۔ احتشام نے اس کی بات غور سے سنی۔ وہ عمائم کی نرم دلی سے واقف تھا کیونکہ عمائم، ماہم کے لیے بے چین تھی۔
''ہر درد کی ایک دوا ہوتی ہے۔ اور وقت سے بڑا مرہم کوئی نہیں...... وہ ٹھیک ہو جائے گی۔'' احتشام نے اسے تسلی دی۔
''میں حیران ہوں...... وہ ایمان کے لیے اتنا آگے تک کیسے چلی گئی؟'' وہ بے خیالی میں احتشام سے بہت کچھ شیئر کرتی چلی گئی۔ شاید احتشام کو بھی اسے باتوں میں لگا کر بہت کچھ اگلوانے کا فن آتا تھا۔
''وہ تو خود بھی حیران ہے۔ جس ''مرحلے'' سے وہ گزر رہی ہے ایکچوئیلی وہ خود بھی ناواقف تھی۔ تمہاری منگنی نے اس کی خوابیدہ حسوں، جذبوں اور سوئی ہوئی محبت کو جگا ڈالا ہے۔ جب وہ آگہی کے عذاب سے گزری تو خود بخود دم بخود رہ گئی۔ وہ اس آگ کی تپش سے انجان تھی۔ جسے عرفِ عام میں محبت کہتے ہیں۔'' احتشام کی سنجیدگی نے اس کے اندر سوچ کے بہت سے در وا کر دیے تھے۔
''تو پھر میں کیا کروں؟'' عمائم لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد بولی۔
''انتظار کرو......'' وہ سمجھ کر نرمی سے بولا۔ اس کی ساری الجھنیں اور کیفیات وہ بن کہے سمجھ لیتا تھا۔
''اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ ماہم نارمل کیسے ہوگی؟'' عمائم نے بے قراری سے کہا۔
''وقت کی سُبک چال دیکھو، ذرا سی ''جنبش'' حالات بدل دیتی ہے۔'' وہ مطمئن تھا پھر جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر عمائم کا چہرہ غور سے دیکھنے لگا۔ وہاں تزلزل تھا، تشویش تھی، تردد تھا، گھبراہٹ تھی، فکر تھی، اضطراب تھا۔ وہ اپنی زندگی کے انتہائی اہم موڑ پہ ہراساں کھڑی تھی یعنی زندگی کا سفر تھا لیکن اندیشوں، خدشوں اور وسوسوں میں ڈوبا ہوا۔ کسی کی آہوں، سسکیوں اور اذیتوں سے لبریز...... وہ اتنی کٹھور نہیں تھی جو کسی کے ٹوٹے دل کے ٹکڑے اٹھا، اٹھا کر اپنے لیے محبتوں کا تاج محل بنا لیتی۔ اس کی صلہ رحمی، نرمی اور ایثار کو یہ گوارا نہیں تھا۔
اس نے ایک مرتبہ پھر اللہ سے مدد لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ پُرسکون ہو کر وضو کیا اور قرآن کھول کر پڑھنے لگی۔ قرآن میں ہر اضطراب، ہر تفکر، ہر غم، ہر تکلیف کا جامع حل موجود ہے۔
''قلم خشک ہو گئے ہیں، صحیفے لپیٹ دیے گئے ہیں، لوحِ محفوظ میں سب کچھ محفوظ ہے، ہر اچھائی، ہر برائی پر

پہنچنے والا صدمہ، ہر ملنے والی خوشی۔ سو اللہ کے فیصلے کا انتظار کرو۔'' کسی نے عمائم کے بجھے دل کو ڈھارس پہنچائی تھی۔ اسے ایک دم تسلی سی ہوئی۔ عجلت اور شتابی شیطانی عمل ہے، وہ تعجیل میں پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ بس انتظار کرنا چاہتی تھی کیونکہ ڈھارس پہنچانے والا اسے انتظار کرنے کا مشورہ دے رہا تھا۔ جب وہ پُرسکون ہو کر لائٹ آف کرنے کے لیے اٹھی تب تائی امی نے کمرے میں جھانکا۔

''عمائم......! ابھی تک جاگ رہی ہو؟'' وہ اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر خفگی سے بولیں۔

''سونے لگی تھی، تھکاوٹ کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ آپ آئیں ناں، مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' انہیں چوکھٹ میں کھڑا دیکھ کر عمائم نے عجلت میں کہا۔ کچھ سوچ کر وہ اندر آ گئی تھیں۔

''خیریت تو ہے؟'' انہوں نے پریشانی سے پوچھا۔ وہ بیڈ کی پائنتی سے کمبل ہٹا کر بیٹھ گئیں۔ عمائم نے کچھ دیر کے لیے سوچا پھر قدرے حیرانی سے کہنے لگی۔

''امی! آپ نے امو کو نہیں دیکھا۔ کتنی پُرسکون بیٹھی تھیں۔ جیسے سب کچھ ان کی مرضی کے مطابق ہو رہا تھا۔ کہاں تو طبل بجا کر اعلانِ جنگ کیا جا رہا تھا۔ اور کہاں اتنی خاموشی......؟'' اس نے اپنی پریشانی کی وجہ شیئر کر ہی لی تھی۔ کیونکہ فنکشن سے لے کر اب تک وہ دو سو مرتبہ امو کا رویہ سوچ چکی تھی۔

''اولاد سارے ''کس بل'' نکال دیتی ہے بیٹا؟'' تائی امی نے مختصر کہا۔

''ایمان نے انہیں مجبور کر لیا، ہے ناں......؟'' اس نے سرعت سے پوچھا۔ انہوں نے بے ساختہ اثبات میں سر ہلایا۔

''لگتا تو یہی ہے۔'' وہ کچھ دیر کے لیے سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔ کیونکہ امو کا رویہ ان کے لیے بھی حیران کُن تھا۔ عمائم نے قدرے بے چینی سے ان کا بازو ہلا کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔ عمائم نے ذرا جھجک کر کہا۔

''آپ کو اس منگنی میں کامیابی کے چانسز کتنے لگتے ہیں؟'' اس کے عجیب سوال نے تائی امی کو متحیر کر دیا تھا۔ وہ خفگی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات سے اسے دیکھنے لگیں۔ جیسے اس کی بات کو سمجھنا چاہتی تھیں۔ انہیں عمائم پہلے سے نسبتاً زیادہ متفکر، سنجیدہ اور خاموش لگی تھی۔ ان کا دل پریشان ہو گیا۔ نہ جانے کیا مسئلہ تھا؟ عمائم نے ایسا سوال کیوں کیا؟

''یہ تم نے کیسی بات کہی......؟'' انہوں نے خفگی سے بے ساختہ اسے ٹوکا۔

''پتا نہیں کیوں؟ مجھے یہ سب کچھ ایب نارمل لگ رہا ہے۔'' عمائم نے بے بسی سے کہا۔ وہ اپنی کیفیات لفظوں میں بتانے سے قاصر تھی۔ ان کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

''وہم ہے تمہارا......'' وہ ناراضی سے گویا ہوئیں۔ ''بدشگونی کی باتیں مت سوچو، آج تم نے دیکھا نہیں...... بابا صاحب ایک طویل مدت کے بعد اس قدر خوش دکھائی دیے ہیں۔'' تائی امی نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ بتایا تھا۔ عمائم ایک گہری سانس کھینچ کر رہ گئی۔ اسے بھیگتی گلابی شام یاد آئی۔ بابا صاحب کا وہ پُرشفقت ہاتھ یاد آیا جو زندگی میں پہلی مرتبہ عمائم کے سر پر کسی سائبان کی طرح سایہ فگن ہوا تھا۔ اسے بابا صاحب کی وہ بات یاد آئی۔ جسے سننے کو عمر بھر سے سماعتیں ترس رہی تھیں۔ حالانکہ وہ بھولی نہیں تھی کچھ بھی بھولی نہیں تھی۔ اسے وہ الفاظ بھی یاد تھے جب تائی امی اس کا مقدمہ لڑ رہی تھیں اور بابا صاحب نے کہا تھا۔ ''بدترین سوداگری عزت کی سوداگری ہوتی ہے۔'' عمائم کو وہ وقت بھولا تھا نہ یہ وقت بھول سکتا تھا۔ جب تائی امی اس کے لیے جامعہ جانے کی اجازت لے رہی تھیں۔ وہ بابا صاحب کے سامنے اس کی وکالت کر رہی تھیں۔ اس کا مقدمہ لڑ رہی تھیں۔ اور بابا صاحب نے بھیگی آواز میں کہا تھا۔ ''گندے خون کا اثر نسلاً بعد نسلاً، پیڑھی در پیڑھی، پشت در پشت اثر دکھاتا ہے۔ منتقل ہوتا ہے۔''

ان کی آواز کا درد آج بھی عمائم کے کانوں میں سیسہ گراتا تھا۔ پھر اس شام کی بھیگتی ساعتوں میں بابا صاحب کے وہ الفاظ...... ''تم نے میرا جھکا سر اٹھا دیا۔'' عمائم کو لگا وہ آج کی شام عمر بھر کے لیے سرخرو ہو گئی ہے...... اب وہ کبھی سر گرا کر نہیں چلے گی بلکہ سر اٹھا کر چلے گی۔ بابا صاحب کے ان الفاظ کے ''صدقے'' عمائم ایک زندگی نہیں کئی زندگیاں قربان کر دیتی۔ بابا صاحب کے ان الفاظ کے صدقے عمائم ایک محبت نہیں، ہزار محبتیں قربان کر دیتی۔

☆☆☆

کائنات کی ہر شے کسی نہ کسی مقصد کے لیے مصروفِ عمل ہے جب تک منزل متعین نہ ہو سفر نہیں ہو سکتا۔ سفر کوشش کا نام ہے اور منزل، مقصد کو کہتے ہیں۔ منزل اور مقصد دلکش ہوگا تو انسان سفر کی صعوبتیں بھی ہنسی خوشی برداشت کرتا چلا جائے گا۔ خوب صورت منزل خود مسافر پیدا کرتی ہے۔ اور سچے مسافروں کا استقبال خود منزلیں کیا کرتی ہیں گویا چلنے والے ہی منزل پاتے ہیں اور منزل پر پہنچنے والوں کے استقبال کے لیے خوشیاں ان کی منتظر ہوتی ہیں۔ گو کہ کہنے والے نے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا لیکن یہ الفاظ کم از کم عمائم کے لیے نہیں تھے۔ نہ سفر من پسند تھا نہ منزل خواہش کے مطابق ملنے والی تھی۔ اور نہ ہی منزل کے ہر گام پر اس کے لیے خوشیوں کے گلدستے منتظر تھے۔ وہ خطرناک حد تک حقیقت پسند واقع ہوئی تھی۔ وہ سائنسی یا رومانوی دونوں طرح کے سرابوں کی طرف مائل ہونے والی نہیں تھی۔

وہ اپنی زندگی کے ایک، ایک موڑ کو حقیقت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ جہاں خوابوں اور سرابوں کا کوئی گزر نہیں تھا۔ کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ ایک خواب جو انجانے میں ''دبِ اکبر'' (ستاروں کے جھرمٹ) کی طرح اس کی آنکھوں میں آن بسا تھا۔ عمائم نے ایک، ایک کر کے احتیاطاً اسے سمیٹا اور دل کے نہاں خانوں میں عمر بھر کے لیے محفوظ کر دیا۔ وہ رشتوں میں ایمان کی حد تک شفاف تھی۔ اور جذبوں میں ایمان داری کی حد تک بے کھوٹ تھی۔ اسے اپنے نصیب پر صبر کرنا اور شکر کرنا سکھایا گیا تھا۔ سو دھیرے، دھیرے ہی سہی، وہ پُرچین ہوتی چلی گئی تھی۔ اگلی صبح روشن اور چمک دار تھی۔

اس نے دل لگا کر جامعہ جانے کی تیاری کی۔ منگنی کے بعد پہلی مرتبہ وہ جامعہ جا رہی تھی۔ اسے نور اور باقی فیلوز کو ٹریٹ بھی دینی تھی۔ تریم اور عالی بھی ''دعوتِ شیراز'' کھا چکنے کے بعد ٹریٹ کی بھی آس لگائے بیٹھی تھیں۔ سو عمائم نے پرس میں کچھ اضافی پیسے بھی رکھ لیے تھے۔ اپنی سہیلیوں کے چھچھورے پن سے وہ واقف تھی۔ جب وہ تیار ہو کر باہر نکلی تب ایمان یونیفارم میں بنا ٹھنا زینہ اترتا دکھائی دیا تھا۔ سر پر پی کیپ رکھی تھی۔ اس کی بے حد سفید چمکتی رنگت یونیفارم میں دہک رہی تھی۔ عمائم کو دیکھ کر وہ سراپا گلاب بن گیا تھا۔

''زہے نصیب، دیدارِ یار سے صبح، صبح سیراب ہو گیا میں۔ آج تو ناشتے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' وہ ہمیشہ کی طرح چہک کر بولا تھا۔ عمائم جز بز سی ہو گی۔

''جا رہے ہو؟'' اسے کچھ تو کہنا ہی تھا۔ ایمان کی پُرشوق نظروں سے بچنے کے لیے وہ اپنی نظر چرا گئی تھی۔

''ہاں، لمبی اڑان پر......'' ایمان نے آہ بھری۔

''کتنی لمبی؟'' اس نے بے ارادہ ہی پوچھ لیا تھا۔

''کراچی تک......'' ایمان نے کراچی کا نام یوں لیا جیسے فرینکفرٹ کی بات کر رہا تھا۔ عمائم نے گھور کر اسے دیکھا۔

''شام تک واپس بھی آ جاؤ گے۔'' وہ اس کی ٹھنڈی آہوں کے جواب میں بولی تھی۔

''تو کیا نہ آؤں......؟'' ایمان کو صدمہ پہنچا۔

''خیری صلا! کیوں نہ آؤ...... جگ، جگ آؤ......'' عمائم نے بے ساختہ کہا۔ وہ مسکرانے لگا۔ عمائم کی...... بے ساختگی نے اسے مسرور کیا تھا۔ پھر وہ مسکراہٹ سمیٹ کر بولا۔

نیم ...... عجیب و غریب کمالات ...... ماہ نور خان، بہارہ کہو

انسان ہمیشہ سے درخت دوست رہا ہے۔ جب انسان نے کرۂ ارض پر اولین قدم رکھا تو اس کے استقبال کے لیے نباتات میں درخت بھی شامل تھے۔ یہی درخت اور ان کے پھل اس کی غذا بنے، ان درختوں کی چھال اور پتے جسم ڈھانپنے کا کام دیتے۔ بیماری کی صورت میں یہی درخت پھل اور پتے مداوا کرتے۔ ایسے ہی درختوں میں نیم بھی شامل ہے۔ یونانی ادویہ مفردہ میں نیم کو خون صاف کرنے والا قرار دیا ہے۔ خرابیٔ خون فساد خون کے عوارض، خارش، پھوڑے، پھنسیوں میں اطبا اسے زمانہ قدیم ہی سے استعمال کررہے ہیں۔ فساد خون اور سودائی امراض میں مفید وشافی ہونے کے باعث سرطان کا مقابلہ بھی ممکن ہوسکتا ہے۔ نیم دانتوں اور مسوڑھوں کا محافظ ہے۔ اس کے استعمال سے مسوڑھوں کا ورم نہیں ہوتا۔ نیم کے پتے کپڑوں، بستروں، صندوقوں اور کتابوں کو محفوظ رکھنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں اگر ان کو ابال کر بھپارا دیا جائے تو کان کا درد جاتا رہتا ہے۔ اس کے پتوں کو جوش دے کر اس کے پانی سے زخموں کو دھویا جائے تو ہر قسم کے تعفن سے محفوظ رکھتا ہے۔ نیم کے پتوں کی پلٹس بنا کر زخموں پر باندھنا، اس میں موجود مواد کو زائل کرکے زخم جلد بھر لاتا ہے۔ اگر نیم کے پتوں کو جوش دے کر اس پانی سے آنکھوں کو دھویا جائے تو آنکھ کئی ایک امراض سے محفوظ رہتی ہے اور خاص کر آشوب چشم کی تکلیف جاتی رہتی ہے۔ نیم کی ٹہنیاں بطور مسواک استعمال ہوتی ہیں۔ جن سے دانتوں کا درد، ورم جاتا رہتا ہے، تیز وافر بلغم نکل کر سینہ صاف ہوجاتا ہے اور آواز صاف ہوجاتی ہے۔ اس کی لکڑی اور چھال کی راکھ دانتوں اور مسوڑھوں کے لیے مفید ہے۔ نیم کا بطور دوا استعمال اس وقت شروع ہوجاتا ہے جب کونپلیں پھوٹتی اور پتے نکلتے ہیں، پکی، پکی نمولیات گرتی ہیں۔ نمولی کا مغز فلین (قبض کشا) قاتل کرم شکم اور بواسیر میں مفید ہے۔ سر کی جوؤں کو مارنے کے لیے پانی میں پیس کر سر میں لگاتے ہیں۔ نیم کے پتوں سے روغن مرہم بنا کر جلدی امراض میں بیرونی طور پر استعمال کرایا جاتا ہے۔ پتوں کا جوشاندہ دافع عفونت (انٹی سپٹک) ہے۔ نیم کی چھال بخار کے لیے مفید ہے اور پیٹ کے کیڑے مارنے میں فائدہ ہوتا ہے۔ غرضیکہ اس کے فائدے بے شمار ہیں۔

''رات کو ڈنر میری طرف سے......'' وہ اپنا پروگرام بتا رہا تھا۔ عمائم بھک سے اڑ گئی۔ آنکھوں میں تحیر ابھر آیا تھا۔ اس نے قدرے برہمی سے پوچھا۔

''کس خوشی میں......؟''

''منگنی کی خوشی میں......'' ایمان نے یوں بتایا جیسے اسے تو منگنی کی خبر نہیں تھی۔ وہ اور بھی برہم ہوگئی۔ پھر ذرا سنجیدگی سے بولی تھی۔

''ڈنر ضروری نہیں......'' وہ اپنی ناگواری کا برملا اظہار نہیں کرپائی تھی۔ مبادا ایمان کو برا لگ جائے۔ وہ خاصا گلیمر لائف گزارنے والا تھا۔ ایسی چیزوں کو پسند کرتا تھا لیکن عمائم پسند نہیں کرتی تھی۔

''کیوں ضروری نہیں......؟'' ایمان نے ایک بھوں اچکا کر پوچھا۔ اسے فلائٹ کے ساتھ جانا تھا۔ اور دیر بھی خاصی ہورہی تھی۔ نئی، نئی منگیتر کو منگنی کے بعد ڈنر کی افادیت پر لیکچر دینا ضروری تھا۔

''ہمارے گھر میں ایسی باتوں کو پسند نہیں کیا جاتا ایمان......'' اس نے جز بز ہوکر اپنی روایات اور اقدار کے بارے میں ایمان کو یاددہانی کرانی چاہی تھی۔ جنہیں وہ خاطر میں نہیں لایا تھا۔

''پہلے نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔'' ایمان نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ ''تمہیں عائشہ کی منگنی اور شادی کا پیریڈ بھول گیا ہے کیا......؟'' اس نے دلیل خاصی مضبوط دی تھی۔ عمائم کو بھی بہت کچھ یاد آگیا تھا۔ ماما اپنی بیٹیوں کے لیے ہمیشہ آزاد خیال تھیں۔ لیکن عمائم کی ذرا سی لغزش پر کوئی کمپرومائز نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ ہمیشہ سے یہ بات جانتی تھی سو عمر بھر سے محتاط رہا کرتی تھی۔

''... ماما کی بیٹی ہے، اس کے لیے بہت کچھ ناجائز بھی جائز ہے جبکہ یہاں صورت حال قطعاً الگ اور مختلف

ہے۔میری کسی بھی کمزوری کو ماما سب سے پہلے اچھالیں گی۔'' عمائم نے ٹھوس انداز میں اپنا نقطہ نظر واضح کیا تھا۔وہ جھنجلا گیا۔

''میں کچھ نہیں جانتا۔تمہیں بھی بہادر ہونا پڑے گا۔کب تک ماما کی شر انگیزی سے ڈرو گی۔اب تمہاری حیثیت بدل گئی ہے۔تم میری پابند ہونا کہ ماما کی۔'' اس نے ناگواری کا برملا اظہار کر دیا تھا۔بحث طویل ہوتی دیکھ کر عمائم کو کچھ سوچنا ہی پڑا۔کیونکہ ایمان تو ٹلنے والا نہیں تھا۔

''تائی امی سے پوچھ لینا...... اگر وہ اجازت دیں تو......'' عمائم کو سمجھوتے کی یہی ایک مناسب راہ دکھائی دی تھی کیونکہ وہ منگنی کے اگلے ہی روز کوئی اختلاف نہیں چاہتی تھی۔

''وہ میرا ہیڈک ہے...... تم تیار رہنا......'' ایمان بے ساختہ خوش ہوا۔

''لیکن یہ پہلی اور آخری ڈیمانڈ ہوگی۔'' عمائم نے اسے جتلا دیا تھا۔وہ جاتے، جاتے پھر سے پلٹا، رکا اور حیرت سے عمائم کی پھیلی کشادہ آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

''ہرگز نہیں......'' ایمان نے سنجیدگی سے کہا۔''تم اس گمان میں نہیں رہنا۔میں نے تمہارے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ بنانی ہے، اس کے لیے بار، بار ہوٹلنگ ضروری ہے۔تاکہ تم میرے معدے سے گزر کر دل میں جگہ بنالو......'' وہ آخر میں تھوڑا شرارتی ہو گیا تھا۔عمائم کو مزید بحث میں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں لگا۔وہ دل میں اٹھتی ناگواری کی لہروں کو دبا کر باہر نکل آئی۔لان میں اسی املی کے پیڑ کی دائیں جانب ماہم کھڑی تھی۔رات کی طرح ہی اداس، ویران، پریشان، عمائم کے دل کو کچھ ہوا...... اب بھلا وہ ماہم کے لیے کیا کر سکتی تھی۔

جامعہ پہنچ کر بھی اس کا دھیان بھٹک، بھٹک کر ماہم کی ویرانی سے بغل گیر ہو جاتا۔وہ ماہم کی آنکھوں میں ستارے بھرنے کے لیے کیا کر سکتی تھی؟ شاید کچھ بھی نہیں یا شاید بہت کچھ...... ابھی وہ کسی بھی حتمی نتیجے تک ہی پہنچ سکی تھی۔وہ کاریڈور سے گزر رہی تھی جب پیپر ہال سے کاغذوں کی گانٹھ لیے نور اچانک نکل آئی۔عمائم کو دیکھ کر نور کے قدم رک گئے تھے۔عمائم خیر سگالی کے طور پر مسکرائی تھی۔نور مروتاً بھی مسکرا نہ سکی۔عمائم کو اس کا انداز عجیب سا لگا جیسے نور اس سے ناراض تھی۔کھنچی، کھنچی سی رنجیدہ تھی۔عمائم کو نورس سے ملنے کی جلدی تو تھی پھر بھی نور کی خفگی کے بارے میں جانے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔عمائم زندگی کے کسی بھی موڑ پر اپنے اوپر احسان کرنے والوں کو بھلا نہیں سکتی تھی۔وہ احتشام اور اذان کے نام سے لینے والی فیور ہو یا پھر نور کے کارڈ اور گاؤن میں خود کو چھپا کر جامعہ سے باہر نکلنے کے لیے ننھی سی ہیلپ ہو...... وہ احسان فراموش نہیں تھی۔اور نور سے تو اس نے خاصا دوستانہ بھی جوڑ لیا تھا۔یہ تنہا، دکھی اور افسردہ لڑکی عمائم کو دل سے قریب لگتی تھی۔اور اس وقت عمائم سے خفا بھی لگ رہی تھی۔کچھ دیر بعد نور زیر لب بڑبڑائی۔اس کی بڑبڑاہٹ نے عمائم کو ساکت کر دیا۔

''محبت چند ہفتے، چند مہینے، شاید برس رہتی ہو۔لیکن دوستی زندگی کا ایک ابدی معاہدہ ہے۔جوں، جوں وقت گزرتا ہے، اس کا جوش افسردہ نہیں پڑتا بلکہ اور زیادہ بڑھتا ہے۔دوست، دوستی سے نہیں، تکمل اور یادگیری سے پہچانا جاتا ہے۔میں تمہاری کس کٹیگری کی دوست ہوں، کل شام کو ہی سمجھ گئی تھی۔پھر بھی ایک آس سی رہی...... عالی اور ثریم کے ساتھ تمہیں میں بھی یاد آ جاؤں۔لیکن میرے ایسے نصیب کہاں؟ تم نے اپنی خوشی میں مجھے شامل نہیں کیا۔'' نور کی طویل تمہید کا اصل متن ظاہر ہوا تو عمائم پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔اس اچانک ہونے والی منگنی نے عمائم کی سدھ بدھ بھلا دی تھی۔عالی اور ثریم کو بھی تائی امی نے بلایا تھا۔نورس بیمار تھی اس نے معذرت کر لی تھی۔اور نور کو بلانا اسے یاد نہیں رہا بلکہ وہ تو عالی اور ثریم کو بھی نہ بلاتی۔یہ تو تائی امی نے انہیں اطلاع کر دی تھی۔ورنہ اس وقت ثریم اور عالی کی طرف سے بھی پیشی بھگتنی پڑتی۔عمائم نے فوراً معذرت کر لی۔اسے غلطی تسلیم کرتے ہوئے جھجک نہیں ہوتی تھی۔پھر اس نے بے حد شرمندگی کے عالم میں نور سے معافی مانگی تھی۔نور اس ردِعمل پر کانپ گئی۔

''میرا مقصد تمہیں شرمندہ کرنا نہیں تھا۔'' نور نے نرمی سے اس کی معذرت قبول کرتے ہوئے کہا۔''اب شادی پر مجھے ضرور بلانا...... میں تمہاری شادی میں گیت گانا چاہتی ہوں، ڈھولک بجانا چاہتی ہوں، میرا اپنا تو کوئی نہیں رہا...... میں تمہی میں اپنے رشتے دیکھتی ہوں۔'' اس کی آواز بھرّا گئی تھی۔ عمائم نے اسے ساتھ لگالیا۔ پھر نور دو بارہ ملنے کی یاددہانی کرواکر کاغذوں کا بنڈل لیے آگے بڑھ گئی تھی۔ عمائم شرمساری کاریڈور میں چلنے لگی۔ اسے نور کو نہ بلانے پر بڑی شرمندگی ہورہی تھی۔

کانفرنس ہال کے قریب سے گزرتے ہوئے عمائم کو نورس کی آواز آئی۔ اس کے آگے بڑھتے قدم رک گئے تھے۔ ہال کے داخلی منقش سلائڈ ہٹے تھے۔ اسے سیکڑوں لڑکیوں کی قطاریں دکھائی دی تھیں جو سر جھکائے نورس کا ''بیان'' سن رہی تھیں۔ عمائم کو روسٹرم پر نورس کھڑی دکھائی دی تھی، اس کے سر پر اسکارف تھا۔ اور آنکھیں بند تھیں...... اتنی دور سے بھی عمائم، نورس کے چہرے پر بکھرتے ستارے دیکھ سکتی تھی۔ نورس بیان کے دوران ہمیشہ بہت گریہ کرتی تھی، بہت روتی تھی۔ اس کے دل کا گداز اور آنسو پورے ہال پر سکوت طاری کردیتے تھے۔ وہ اب بھی سامنے ایک فائل کھولے آنکھیں موندے روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''تنہائی روح کی گہرائی تک آ پہنچی ہے۔ ہماری روحیں ایک دوسرے کے قرب سے محروم ہیں۔ روحیں محبت کی پیاسی ہیں۔ انسان، انسانی اقدار سے بے حس ہے۔ احساس مرچکا ہے۔ کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں چاہتا۔ ہم ایک دوسرے کو برداشت کررہے ہیں، تسلیم نہیں کرتے، ہم اذیت میں ہیں، ہمیں اپنے علاوہ کوئی چہرہ پسند نہیں۔ ہم مفادات کے پجاری بھول گئے ہیں ...کہ زندگی حاصل ہی نہیں ''ایثار'' بھی ہے۔ ہم اپنی فکر کو ''فکرِ بلند'' سمجھتے ہیں۔ اور اپنے عمل کو عمل صالح سمجھتے ہیں جبکہ ہم نہیں جانتے ہم کتنے کمزور ہیں، ہم اس چراغ کی طرح ہیں جو آندھیوں کی زد میں ہے۔ ہم کئی چہرے رکھتے ہیں لیکن ہمارا اصل روپ تنہائیوں میں ہے، ہماری حقیقت تنہائی اور خاموشی ہے۔ رفاقتوں سے محروم انسان بیماریوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اور سب سے بڑی بیماری تنہائی بذات خود ہے۔ یہ بیماری بھی ہے اور عذاب بھی۔'' نورس بیان کے آخر میں کوئی نہ کوئی قول ضرور سناتی تھی یوں کہ پورے ہال میں ہچکیوں کی آوازیں اور سسکاریاں ابھرنے لگتی تھیں۔ اس وقت بھی سیکڑوں لڑکیاں رو رہی تھیں۔ کچھ بلند آواز میں کچھ دھیمی آواز میں...... اسی بیان کے آخر میں نورس نے نمائش کے لیے دن کا اعلان بھی کردیا تھا۔ روتی ہوئی لڑکیاں اچانک مسکرانے لگی تھیں، ان کی آنکھیں خشک ہونے لگیں۔ چہروں پر مسکراہٹ بکھرنے لگی، آخر وہ دن بھی قریب آنے والا تھا جس کا جامعہ کی ہر لڑکی کو انتظار تھا۔ نورس نے واضح اعلان کیا تھا۔ ہر لڑکی اپنا اسٹال خود لگائے گی۔ جتنے بھی ماڈل فروخت ہوئے جتنی بھی رقم کمائی گئی اس پر جامعہ کی لڑکیوں کا حق ہے۔ ہر لڑکی اپنے اسٹال کی بچت اپنے پاس محفوظ رکھ سکتی ہے۔ یہ روزی کمانے کا اچھا ذریعہ تھا۔ اس اعلان نے لڑکیوں میں جوش بھر دیا تھا۔ حالانکہ اخراجات نورس برداشت کررہی تھی۔ اور منافع کی رقم سے دستبردار بھی ہوچکی تھی۔ غریب لڑکیوں کی آنکھوں میں دیپ جلنے لگے۔ ہر ایک کی سوچ دوسری سے مختلف تھی۔ وہ حاصل ہونے والی رقم کے دل ہی دل میں تخمینے لگارہی تھیں۔

''میں اپنے بھائی کو نئے جوتے اور کپڑے لے دوں گی۔''

''میں اپنی ماں کو کسی پرائیویٹ اسپتال کے اچھے ڈاکٹر کو دکھادوں گی۔''

''میرا بھائی اخبار بیچتا ہے، اسے ریڑھی لگانے کے لیے سامان خرید دوں گی۔'' وغیرہ، وغیرہ......

خوابوں اور خواہشوں کا طویل اور لامحدود سلسلہ تھا جس کی کوئی حد نہیں تھی۔ عمائم ہر ایک چہرے پہ بکھری خوشی کھوج رہی تھی۔ خواب دیکھ رہی تھی، جگنو دیکھ رہی تھی۔ رنگ دیکھ رہی تھی۔ اس کے اندر کچھ کرلا رہا تھا۔ کوئی رو رہا تھا۔ کوئی بین کررہا تھا۔ وہ ایک دم خوفزدہ ہوگئی۔ وہ اپنے احساسات سے گھبرا کر تیزی سے نورس کے دفتر میں چلی آئی تھی۔ یہاں آکر بھی ایک خوف اس کا پیچھا کرتا رہا تھا۔ وہ اپنے احساسات پر متفکر تھی۔ آخر یہ دل میں کیسے

وسوسے چٹکیاں بھر رہے تھے کیسے خدشے سر ابھار رہے تھے؟
نورس کے آنے تک وہ بمشکل سنبھلی تھی۔
نورس نے اسے شائستگی سے منگنی کی مبارک باد دی۔ عمائم نے بمشکل مسکرا کر وصول کی۔ وہ پہلے ہی ذہنی دباؤ کا شکار تھی۔ اس وقت اچانک دماغ میں غبار بھرنے لگا۔ سر کی پچھلی طرف ٹیس سی اٹھی تھی۔ چونکہ آج وہ بے مقصد نہیں آئی تھی سو تکلیف برداشت کرتے ہوئے اپنی بات کے لیے تمہید سوچنے لگی۔ نورس کو بھی اندازہ تھا کہ عمائم کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اس سے پہلے نورس نے خود ہی بتانا شروع کیا۔
''ثانویہ عالیہ کی دو لڑکیاں ہارٹ پیشنٹ ہیں۔ ان کے بائی پاس کا انتظام کروایا ہے۔ گیٹ نمبر ٹو کے گارڈ کو بھی ٹیومر کا آپریشن کروانا ہے۔ چیئر مین حال بتا رہے تھے، دو خانساماں اپنی بیٹیوں کے جہیز کا بھی کہہ چکے ہیں.... عالمہ اور خاصہ کی ایک، ایک لڑکی اپنی بہنوں کی جابز کے لیے مجبور کر رہی تھیں۔ اگلے مہینے جامعہ کی دو اور لڑکیوں کو رخصت بھی کرنا ہے۔ نمائش کا چکر بھی ہے۔ اتنے کاموں میں چکرا کر رہ گئی ہوں۔'' نورس سر تھام کر بولتی چلی گئی۔
عمائم کے دل میں اس عورت کا احترام بڑھ گیا تھا۔ یہ عورت ان لوگوں میں سے تھی جو اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے جیتے ہیں۔ جو خدمتِ خلق کے لیے پیدا ہوتے ہیں جو انسانیت کے لیے زندہ رہتے ہیں۔
''تم کہو، کچھ کہنا چاہتی ہو؟'' نورس، مصروف انداز میں بولتی ہوئی عمائم سے بے خبر بھی نہیں تھی۔ اس نے گہری سانس کھینچ کر بالآخر اپنی الجھن کو شیئر کر لیا۔ وہ اسی مقصد کے لیے یہاں آئی تھی۔ کیونکہ ثریم کے انکشاف نے اسے حد درجہ متوحش کیا تھا۔ منگنی کی وجہ سے وہ آ نہیں سکی تھی۔ پھر فون پر بات کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔ سو عمائم کو خود ہی آنا پڑا۔
''نورس! مجھے ایک بات پتا چلی ہے۔'' اس نے انگلیاں مسلتے ہوئے مضطرب انداز میں کہا تھا۔ نورس نے چونک کر گہری نگاہ سے عمائم کو دیکھا...... اس کے چہرے پر کچھ غیر معمولی پن ضرور تھا۔ عمائم کے بولنے سے پہلے ہی نورس نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے انکشاف کیا۔
''یہی ناں کہ کرن کی موت سے کچھ دیر پہلے میں اس کے ہمراہ تھی۔'' نورس کی دھیمی، سنجیدہ اور پُرنم آواز نے عمائم کو حواس باختہ کر دیا۔ اس نے بے ساختہ سر اٹھا کر نورس کو دیکھا پھر اس کا اثبات میں سر ہلتا چلا گیا۔ حالانکہ وہ شدید متحیر تھی۔ بھلا نورس کو کیسے خبر ہوئی تھی کہ عمائم یہ سوال کرنا چاہتی ہے؟ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ کیا اس کا چہرہ کھلی کتاب تھا یا عمائم کو اپنے تاثرات چھپانے نہیں آتے تھے؟ وہ نورس سے کوئی بھی سوال پوچھنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ نورس اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے خود ہی بتانے لگی۔
''اس رات میں ایک عزیز کے گھر عیادت کے لیے گئی تھی۔ گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوا تو میں اتر کر کسی کنوینس کی تلاش میں کھڑی ہو گئی حالانکہ ڈرائیور نے کہا تھا وہ پنکچر لگوا کر واپس آ جاتا ہے۔ میں نے سوچا اتنی رات کو کہاں اکیلی کھڑی رہوں گی۔ معاً ایک کار کی ہیڈ لائٹس چمکنے لگیں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اشارہ کیا تو کار رک گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی اور نہیں، کرن براجمان تھی۔ اس نے میرا مسئلہ پوچھا اور لفٹ کی آفر کر دی۔ میں بھی کرن کی شکل میں ایک واقف کار کو دیکھ کر جامعہ واپس آ گئی۔ کرن مجھے گیٹ پر اتار کر واپس چلی گئی تھی۔ بعد میں اس کے ساتھ کیا ہوا؟ میں کچھ نہیں جانتی۔ لیکن جو بھی ہوا، بڑا بھیانک ہوا۔'' نورس نے بھیگی آنکھوں کو صاف کر کے تفصیل بتائی۔ عمائم سخت بے چین ہو گئی تھی۔ اس کے اندر سوال پھڑ پھڑانے لگے۔
''آپ نے یہ بات کیوں چھپائی......؟ تفتیش میں بتائی کیوں نہیں......؟''
''میں پوچھ گچھ کے لمبے چکروں سے بہت گھبرا رہی تھی۔ مجھے خوف ہوا کہ جامعہ کو نشانہ نہ بنا لیا جائے۔ مجھے ابھی تک انجان لوگوں کی دھمکیاں مل رہی ہیں۔ میری جان کو خطرہ لاحق ہے۔ میں بہت پریشان ہوں کیونکہ کرن کسی بڑے گینگ کا شکار ہو گئی ہے۔'' نورس اپنی پیشانی کو ٹھوکا دیتی سخت متوحش تھی۔ عمائم کو اچانک احتشام کی آفر کا خیال

آیا۔ اس نے نورس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تسلی دی تھی پھر ہمدردی سے بولی۔

''آپ سیکیورٹی کے لیے اپلائی کریں......آپ کی زندگی کو واقعی خطرہ ہے۔ میں آپ کو ہمیشہ زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔'' اس نے سہے انداز میں نورس کو مشورہ دیا تھا۔ جسے اس نے ریجیکٹ کر دیا۔ پھر وہ بڑی سنجیدگی سے مخاطب ہوئی تھی۔

''تمہیں کس نے کہا۔ میری زندگی کو خطرہ ہے؟''

☆☆☆

پروجیکٹر پر ایک فلم چل رہی تھی۔ نیلگوں روشنی میں ہر سین بڑا واضح اور شفاف تھا۔ اونچے اسٹولز پر تین ذہن آفیسرز اگلی رو میں بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے آٹھ اور آفیسرز بھی موجود تھے۔ چیف آف کنٹرولر ایک نقشہ ڈرائنگ بورڈ پر بچھا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد پروجیکٹر آف ہو گیا۔ اب نقشے کے اہم نکات ازبر کروائے جا رہے تھے۔

یہ ایک سفید ماربل کی عظیم الشان بلڈنگ کا نقشہ تھا۔ اس بلڈنگ میں بے شمار محراب تھے۔ کئی ایکڑ پر پھیلا گراؤنڈ تھا۔ کئی کینال پر مشتمل عمارت کے اٹھارہ مختلف ہال، پورشنز اور بلاک تھے۔ بلاشبہ کسی ذہین اور آرٹسٹک دماغ نے اس عمارت کا نقشہ تیار کیا تھا۔ کئی گلیاروں، راہداریوں، گیلریوں اور کاریڈور پر مشتمل اس عمارت کی بھول بھلیوں میں گم ہونے والا انجان بندہ بہت آرام سے واپس نہیں آ سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد نقشہ رول کیا گیا۔ اب چیف آف کنٹرولر روسٹرم پر کھڑے تھے۔ ایک ڈیمی آفیشل کارڈ کھول کر پڑھ رہے تھے۔ ہر مشن پر بھیجنے والے دستے کو ''ڈاکٹر برق'' کے اقوال پڑھ کر سنائے جاتے تھے۔ یہ ڈیمی آفیشل تب کھلتا تھا جب مشن اپنی نوعیت کا نہایت اہم، حساس اور خطرناک ہوتا۔ جوانوں میں برقی لہر دوڑ گئی تھی۔

''مسلمان وہ ہے جو اپنے اثاثوں کی حفاظت کرے۔ مجاہد وہ ہے جو اپنے مسلمان بھائیوں کی حفاظت کرے۔ تمہیں مادرِ وطن کی حفاظت کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ میرے کمانڈرز تمہیں ایک خاص مقصد کے لیے چن لیا گیا ہے۔'' چیف آف کنٹرولر کی آواز جسم میں گردش کرتے لہو کو بڑھکا رہی تھی۔ گرما رہی تھی، آگ لگا رہی تھی۔

''مسلمان جہاں بھی گئے۔ یہ اثاثہ ان کے ہمراہ تھا۔'' انہوں نے ڈیمی آفیشل کو کھول لیا۔

''ایک روشن اور سیدھا سادہ دین، جس کی ہر ہدایت کا لازمی نتیجہ فلاح، سعادت اور کامرانی تھا۔'' ان کی آواز لہروں کی شکل میں پورے ہال کے اندر گھوم رہی تھی۔

''ایک عادلانہ نظام حکومت جو شاہ و گدا میں کوئی امتیاز نہیں رکھتا اور جو ہر قسم کے استحصال سے پاک تھا۔'' وہ سر اٹھا کر جوانوں کی گرم ہوتی روشن پیشانیوں کو دیکھ رہے تھے۔

''ایک ایسا پیغام جو اُن کی اخلاقی اور روحانی زندگی کا ضامن تھا۔'' ان کی گرم آواز جذبات میں ابال لا رہی تھی۔

''ایک ایسا علم جس کی روشنی سے زندگی کی شاہراہ چمک اٹھی تھی اور اجالے حدِ امکان تک پھیل گئے تھے۔'' انہیں جوانوں کی آنکھوں میں روشنیاں پھوٹتی دکھائی دے رہی تھیں۔ انہوں نے اپنا وعظ جاری رکھا۔

''ایک ایسی تہذیب جس کی بنیاد طہارت و تقدس پر ڈالی گئی تھی۔'' وہ باور کروا رہے تھے۔

''ایک ایسا ''نظامِ عبادت'' جس نے بندوں میں ذوقِ خدائی پیدا کر دیا تھا اور ان کے دست بازو میں بجلی جیسی قوت بھر دی تھی۔'' انہوں نے جگمگاتی آنکھوں سے سب پر اک طائرانہ نگاہ ڈالی تھی۔

''میں ایسی ہی قوت تمہارے جذبوں میں اور تمہاری نیتوں میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم میری قوم کے سپاہی ہو، سرحدوں پر لڑو، برف پوش پہاڑوں پر لڑو یا دہشت گردوں کے خلاف جنگ کرو۔ تمہیں ہر حال میں جیت کر آنا ہے۔ تم پر میری قوم کا قرض ہے میرے بچو! جاؤ اور جا کر ان ماؤں کو تسلی دو۔ ان کے بچے کتابوں سے منہ موڑیں۔ میرے لاوارث اور یتیم بچوں کی آنکھوں میں ''امیدِ صبح'' بسا کر آؤ۔ جن کے وارث، جن کے لواحقین، جن کے ماں، باپ بم دھماکوں میں اڑ کر پاش، پاش ہو گئے۔ جاؤ اور جا کر میرے معصوم بچوں کا مستقبل ان ظالموں کے ہاتھوں سے چھین کر

لے آؤ۔ جن ہاتھوں سے کتابیں کھینچ کر بارود پکڑائے گئے ہیں۔ میرے ان بچوں کے ہاتھوں میں قلم دے کر آؤ، قرآن پاک دے کر آؤ۔ انہیں نویدِ صبح دے کر آؤ۔ مجھے میری قوم کا ہر بچہ خوشحال چاہیے۔ ہر خوف سے آزاد چاہیے۔ میری قوم کا ہر معصوم بچہ سکون کی میٹھی نیند سونا چاہتا ہے۔ یہ بارود، یہ بم یہ دھماکے اس کی نیند چرا لیتے ہیں۔ اسے سہما دیتے ہیں، ڈرا دیتے ہیں۔ وہ ماں کی آغوش ڈھونڈتا سہم رہا ہے۔ جاؤ، اس کی ماں کے لاشے کو اٹھا لاؤ...... جو گولی سے اڑ رہا ہے، بارود سے بکھر رہا ہے۔'' چیف آف کنٹرولر کی آواز نے جوانوں کے خون گرما دیے تھے۔ ایک سچے جذبے کی آگ تھی جو پھیل رہی تھی۔ بھڑک رہی تھی جھلسا رہی تھی۔ ان کی گرفت بندوقوں پر سخت ہوئی۔

اب وہ ہدایات لے رہے تھے۔ بریفنگ مل رہی تھی۔ جوان الرٹ تھے، پُرجوش تھے۔ مشن آفیسر نے کھڑے ہو کر بتایا۔

''ایک ''نجی نمائش'' میں تاریخ کی بدترین دہشت گردی کی باوثوق اطلاعات ہیں۔ سیکیورٹی کے لیے کیسی پلاننگ ہونی چاہیے۔ دہشت گردی کو کیسے روکا جائے......'' مشن آفیسر تفصیلات فراہم کر رہا تھا۔

احتشام اور روشان نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نعرۂ مستانہ بلند کیا۔

اے مردِ مجاہد جاگ ذرا...... اب وقت شہادت ہے آیا...... اللہ اکبر......

☆☆☆

میس کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل ایک نہیں، ایک ہزار تھیں...... ہر ٹیبل پر چار جوان تھے۔ ڈنر کا پیریڈ چل رہا تھا۔ پورے ہال پر مہیب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کانٹے اور چمچوں کا معمولی شور بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔

روشان بادلِ ناخواستہ کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے زندگی میں ایسی پتلی حلیم نہیں کھائی تھی۔ وہ بھی ہر دو منٹ کے بعد دانت کے نیچے ننھا سا کنکر ''کرنچ'' کر جاتا تھا۔ وہ شدید بدمزہ ہوا۔

''میں میس انچارج سے ضرور شکایت کروں گا۔'' اس نے شکایت نامے کا کارڈ اٹھایا، دو لائنیں گھسیٹیں اور ایک ویٹر کو اشارے سے بلا کر سلپ ہاتھ میں پکڑائی۔ احتشام اس کی تمام کارروائی غور سے دیکھ رہا تھا۔ تاہم اس نے روشان کو روکنے کی کوشش میں وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ کچھ دیر بعد میس انچارج آ گیا۔

''مسٹر روشان! تم نے حلیم میں کنکر اور مٹی پائی جانے کی شکایت بھیجی......؟'' وہ اِک بھوں اچکا کر سختی سے پوچھ رہا تھا۔ کیونکہ جب بھی روشان میس ہال کو رونق بخشتا تھا کوئی نہ کوئی شکایت ضرور ملتی۔ کبھی سوپ باسی ملتا، کبھی گوشت میں بُو آتی، کبھی نان کچے ملتے، کبھی چاول لئی ہوتے، کبھی سالن میں بھوسا ہوتا۔ یہ شکایت نامہ کوئی نیا نہیں تھا۔ روشان نے بے ساختہ اثبات میں سر ہلایا۔

''ایسی شکایت میرے علاوہ کون بھیجنے کی جرأت کر سکتا ہے۔'' اس نے اکڑ دکھائی۔

''تم فوج میں مادرِ وطن کی خدمت کے لیے شامل ہوئے ہو یا خراب غذا کی شکایت کرنے؟'' انچارج نے کاٹ دار انداز میں پوچھا تھا۔ روشان بغلیں جھانکتا سیدھا ہوا۔

''ظاہر ہے، میں فوج میں مادرِ وطن کی خدمت کرنے کے لیے ہی شامل ہوا ہوں......'' روشان نے ترنخ کر جواب دیا تھا۔ میس انچارج اسے گھورتا ہوا واپس چلا گیا۔ روشان اسے لاجواب کرنے پر بڑا مسرور تھا۔ اور خوب اکڑ، اکڑ کر احتشام کو دکھا رہا تھا۔ اس کی اکڑ اگلے ہفتے تک خود بخود جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی۔ کیونکہ ٹریننگ کا پورا ہفتہ اسے پتلی حلیم کھانے کو ملی تھی۔ وہ بھی ریت، مٹی اور کنکروں کے تڑکے والی...... روشان ٹریننگ کے بعد اتری صورت لیے اپنے فلیٹ میں پڑا انچارج کو گالیاں دے رہا تھا۔ اور احتشام ہنس، ہنس کر بے حال تھا۔

''زیادہ اسمارٹ بننے کا یہی انجام ہوتا ہے۔'' احتشام نے اسے چڑایا۔

''انچارج تھا ہی بڑا......'' روشان نے بھنا کر نازیبا سا لفظ کہا۔

''اور تم خود کیا کر رہے تھے؟'' احتشام نے اسے یاد دلایا۔ ''کیا اپنے الفاظ بھول گئے؟''

''کون سے؟'' اس نے تجاہل برتا تھا۔
احتشام نے اسے تسلی دی۔ پھر اٹھ کر کھڑکی سے پردے ہٹا دیے تھے۔ باہر شام اتر رہی تھی تاریکی کے سائے پھیل رہے تھے۔ سامنے عمارت کی لائٹس جگمگا رہی تھیں۔ معمول کی چہل پہل محسوس ہو رہی تھی۔ بے فکر لڑکیاں آجا رہی تھیں۔ شام کی کلاسز کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ گہری پُرسوچ نگاہوں سے سامنے دیکھتا رہا۔ اس کی کھوجتی آنکھوں میں ایک گرما دینے والا تاثر تھا۔ روشان اٹھ کر اس کے برابر آ کھڑا ہوا۔ پھر اس کے کندھے پر ہاتھ پھیلا کر معنی خیزی سے بولا۔
''ایک کہاوت سنانا چاہتا ہوں۔'' اس کا انداز اجازت لینے والا تھا۔ احتشام نے بن دیکھے اثبات میں سر ہلایا۔
''ضرور......'' وہ دونوں ہاتھ سلائڈ پہ جما کر سنجیدگی سے گویا ہوا۔ روشان نے گہری سانس کھینچ کر کہا۔
''اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں ایک دفعہ مشہور ہو گیا کہ آپ دکن پر حملہ کرنے والے ہیں اگرچہ آپ اس معاملے کا ارادہ کر چکے تھے مگر ابھی تک باقاعدہ اعلان نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ معتمدِ خاص سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا مگر لوگوں میں اس کی شہرت عام ہو چکی تھی۔ سلطان عالمگیر حیران تھے کہ لوگوں میں یہ خبر کیسے پھیل گئی؟ محکمۂ خاص کو حکم دیا گیا کہ سراغ لگائیں اس بات کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟ کھوج لگتے، لگتے پتا چلا کہ سب سے پہلے ملازمِ خاص کی زبان سے یہ بات سنی گئی۔ اس کو بلا کر پوچھا گیا۔
''بتاؤ! تم نے یہ بات کس سے سنی......؟''
ملازم نے عرض کیا۔
''جہاں پناہ! میری عمر اس خانوادے کے قدموں میں گزری ہے، غلام ''اداشناس'' تھا۔ ایک صبح حضور کو وضو کروا رہا تھا کہ آپ نے ایک لمحہ توقف فرمایا۔ دکن کی جانب نگاہ فرمائی اور دستِ مبارک مونچھوں پر پھیرا۔ میں سمجھ گیا کہ دکن پر حملہ کرنے کا ارادہ ہے۔'' روشان لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا پھر دوبارہ احتشام کو ٹہوکا دے کر بولا۔ وہ اپنی بات کا ردِعمل جانچ کر احتشام سے مخاطب تھا۔
''حضور! کیا ارادے ہیں......؟'' وہ اس کی نگاہوں کا تعاقب کر رہا تھا جو سفید ماربل کی عمارت پر برف کی طرح جم گئی تھیں۔ پلٹ رہی تھیں نہ وہاں سے ہٹ رہی تھیں۔ سلطان عالمگیر کے معتمد خاص کی طرح وہ بھی یارِ دلدار کا اداشناس تھا۔ لمحوں میں سمجھ گیا۔ اب جواب چاہ رہا تھا۔ احتشام نے گہری طویل سانس کھینچ کر اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔ پھر اپنا بازو روشان کے کندھے پر پھیلا دیا۔ اب وہ سامنے والی عمارت کو اسی انداز میں دیکھتا ہوا بتا رہا تھا۔ بہت سرد اور برفیلا انداز تھا۔ لمحوں میں جما دینے والا۔
''دکن پر حملہ کرنے کے ارادے ہیں۔'' اس نے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں روشان کو ہلا دیا۔

☆☆☆

''زندگی میں جو چاہو حاصل کر لو، بس اتنا خیال رکھنا کہ آپ کی منزل کا رستہ کبھی لوگوں کے دلوں کو توڑتے ہوئے نہ گزرے۔'' ان دنوں ہر عبارت میں اسے ماہم کے جذبات کی ترجمانی دکھائی دیتی تھی۔ یوں لگتا، لفظ اسے باور کروا رہے ہیں...... جتلا رہے ہیں، چوکے لگا رہے ہیں، مگر آکر وہ ضمیر کی چبھن کا شکار ہو جاتی تھی دل کا سکون درہم برہم ہو جاتا۔ ماہم کی آنکھوں کا درد دیکھنا محال تھا۔ حالانکہ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتی تھی۔ پہلے کی طرح لڑتی تھی نہ طنز کرتی تھی۔ اس میں غرور رہا تھا نہ پہلے سا نخرہ تھا۔ ایک ذرا سی دل پر ضرب کیا لگی ماہم سرتاپا بدل گئی۔ حالانکہ یہ ضرب اتنی معمولی نہیں تھی۔ معمولی ہوتی تو ماہم میں اتنا بدلاؤ کیسے آجاتا؟
وہ عمائم کی موجودہ حیثیت سمجھ کر نہ تو پہلے سی بدزبانی کرتی تھی، نہ بدتمیزی سے پیش آتی تھی۔ یہی حال ماما کا بھی تھا۔ وہ اندر باہر سے بجھ گئی تھیں۔ لیکن عمائم کی حیثیت کو چیلنج کرنے سے قاصر تھیں۔ حرم اور حریم نے بھی عمائم کی

منگنی سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ بسمہ بھی بظاہر خوش تھی۔ نانی امی کا رویہ پہلے کی طرح تھا۔ اندر سے مہربان، بظاہر لاتعلق۔
اس رات ایمان کی خواہش پر تائی امی نے باہر ڈنر کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن اس کے بعد ایمان کی ڈیمانڈز کا سلسلہ خاصا وسیع ہورہا تھا۔ وہ آئے دن فرمائشی پریڈ کرواتا، کبھی باہر تو...... کبھی گھر...... لیکن عمائم اس دن کے بعد اس کو دوٹوک انکار کرچکی تھی۔ نتیجتاً وہ ناراض ہوگیا۔ عمائم کو اب پتا چلا کہ اسے توبار، بار روٹھنے کی بیماری ہے۔ اور عمائم کو منانا نہیں آتا۔ پھر پورا ہفتہ یوں ہی گزر گیا۔ ایمان سے کئی مرتبہ ٹاکرا ہوا۔ لیکن وہ اسے نظر انداز کر کے رستہ بدل جاتا۔ پورا ہفتہ آنکھ مچولی کا یہ کھیل چلتا رہا۔ ایمان کو یقین تھا، عمائم اسے منالے گی۔ کیونکہ ماہم اسے منالیا کرتی تھی۔ ان دونوں کی مثالی دوستی تھی۔ جب بھی ناراضی ہوتی، ماہم اسے خود منالیتی، دراصل ایمان کی عادتیں بگاڑنے میں ماہم کا بڑا ہاتھ تھا۔ اور ایمان بھی ماہم کا عادی تھا۔ وہ روٹھے گا تو ماہم کی طرح عمائم بھی منالے گی...... لیکن ایسا نہیں ہوا...... ایمان کی توقعات زمین بوس ہوگئیں...... وہ اچھی بھلی نازک اندام انا رکھتا تھا۔ جسے پسِ پشت ڈال کر اس نے عمائم کو فون کر ہی لیا۔
یہ رات کا وقت تھا۔ عمائم اپنا مطالعہ کررہی تھی۔ مس ہوئے لیکچرز نوٹس کی شکل میں بنارہی تھی۔ جب ایمان کی کال آئی۔ اس نے کچھ سوچ کر کال ریسیو کرلی تھی۔ دوسری طرف ایمان خفا، خفا سا بولا۔
''تمہیں تو منانا بھی نہیں آتا۔'' اس نے باقاعدہ ناراضی جتائی تھی۔ عمائم گہری سانس کھینچ کررہ گئی۔
''سوتو ہے......'' اسے کچھ تو بولنا ہی تھا...... دوسری طرف وہ بھنا سا گیا۔
''سیکھ لوناں......'' ایمان نے کلس کر کہا۔
''جب وقت آیا تو سیکھ لوں گی۔'' اس نے آہستگی سے نوٹس سمیٹے اور نیم دراز ہوگئی۔ پڑھائی سے ایک دم جی اچاٹ ہوگیا تھا۔
''تو وقت کب آئے گا؟'' ایمان نے چبا، چبا کر جتلایا تھا۔ گویا اس کے نزدیک یہی مناسب وقت اور گولڈن پیریڈ تھا روٹھنے اور منانے کا۔ اس نے اپنے خیالات کا اظہار بھی برملا کردیا تھا۔ عمائم سلگ سی گئی تھی۔ کیونکہ ایمان کی خواہشات کا دائرہ بڑھتا ہی جارہا تھا۔
''ایمان! مجھے یہ سب پسند نہیں، کم از کم شادی سے پہلے۔'' اس نے دھیمی آواز میں اپنی ناگواری کی وجہ بتادی۔
''پسند نہیں تو انڈر اسٹینڈنگ کیسے ہوگی؟'' وہ صدمے سے چیخ پڑا۔
''انڈر اسٹینڈنگ بعد میں بھی ہوجاتی ہے۔'' عمائم نے بمشکل ناگواری دبائی تھی۔ اس کی کنپٹیاں سلگ کررہ گئیں۔ ایمان بھی دوسری طرف دانت کچکچا رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اوپر سے چھت پھاڑ کر نیچے اتر آتا۔ اور فیس ٹو فیس عمائم کی کلاس لیتا۔
''تمہیں اور کیا، کیا نہیں پسند؟ آج ہی بتادو......'' کچھ دیر بعد وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ انداز میں ناگواریت تھی بھی تو محسوس نہیں ہورہی تھی۔ عمائم نے موقع غنیمت جان کر جتلادیا۔ گویا دوبارہ یہ وقت ہاتھ میں آنے والا نہیں تھا۔
''مجھے ہوٹلنگ کرنا نہیں پسند......'' اس نے دھیمی آواز میں بتایا۔
''اور......؟'' ایمان نے سوال کیا۔
''مجھے فیانسی کے ساتھ گھومنا اور آزادانہ میل جول نہیں پسند......'' وہ بولتی رہی اور ایمان سنتا رہا تھا۔
''اوہ......؟'' اس کے لہجے میں سابقہ سنجیدگی تھی۔
''مجھے بے تکلفی بھی نہیں پسند......'' عمائم تیز گام پر سوار ہوگئی۔
''اور......؟'' اس نے مزید پوچھا۔

''مجھے ٹیلی فونک کانٹیکٹ بھی نہیں پسند......'' عمائم کی آخری بات پر وہ بے ساختہ چیخ پڑا تھا۔
''تم اسی زمانے کی ہو عمائم......'' ایمان کو گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ ''اس قدر دقیانوسی خیالات......اُف یہ بھی نہیں پسند......وہ بھی نہیں پسند......حد ہے یار، میں کوئی غیر تو نہیں......'' وہ نان اسٹاپ بولتا چلا گیا۔ عمائم تھک کر رہ گئی تھی۔ ابھی سے امتحان شروع تھا۔ وہ کہاں تک خود کو بدلتی......؟ کتنا خود کو بدلتی......کسی کو جاننے کے لیے سالوں کے ساتھ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جاننے کے لیے ایک لمحہ بھی کافی ہوتا ہے۔ پھر ایمان کو وہ بچپن سے جانتی تھی۔ یہ اس کی پرانی عادتیں تھیں۔ اپنی مرضی چلانا، اپنی خوشی کو اہمیت دینا۔ اپنی بات منوانا......اس نے گہری سانس کھینچ کر بالآخر سنجیدگی سے کہا۔
''ایمان! تم گلیمرس لائف اسٹائل کے عادی ہو......میں پرانے خیالات کی مالک ہوں، بقول تمہارے دقیانوسی بھی ہوں......بہتر یہی ہے تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرلو......کیونکہ میں نہیں چاہتی تمہیں بعد میں پچھتانا پڑے۔'' اس نے موبائل بند کیا۔ اور جواب سننے کی کوشش میں وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ فون رکھ...کر وہ سر تھامے بیٹھ چکی تھی۔ دماغ میں غبار سا جمع ہو رہا تھا۔ اچانک سر میں ٹیس اٹھنے لگی تھی۔ دل میں طرح، طرح کے وہم اٹھ رہے تھے۔ وہ کچھ گھبرا کر شال لپیٹ کر باہر آ گئی تھی۔ ایمان کی فون کال نے اسے خاصا ڈسٹرب کر دیا تھا۔ جو بھی تھا۔ وہ ایمان کے ساتھ رشتے کو نبھانا چاہتی تھی۔ اس رشتے کا خاتمہ نہیں چاہتی تھی۔
اس کا ارادہ تھا کہ چائے بنا کر کوئی پین کلر کھائے گی۔ لیکن کچن میں جانے سے پہلے بسمہ کے روم کی طرف سے عجیب سی آواز آئی تھی۔ عمائم کو پہلے تو وہم ہی لگا پھر کچھ سوچ کر دروازے تک آ گئی۔ دروازہ کھلا تھا۔ عمائم نے جھانک کر دیکھا اور دھک سے رہ گئی۔ وہ بسمہ چاچی ہی تھی۔ گھٹنوں میں سر دیے سسکتی ہوئی۔ وہ تڑپ، تڑپ کر رو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تصویر تھی۔ جسے دیکھتے ہوئے وہ بڑی شدت سے گریہ کر رہی تھی۔ عمائم کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی تھی۔ پھر اس نے بے ساختہ بھیگا چہرہ پونچھا۔ آنکھیں رگڑیں۔ گال صاف کیے۔ عمائم تب تک آگے بڑھ کر بسمہ کی گود سے فریم شدہ تصویر اٹھا کر دیکھ چکی تھی۔ یہ ایک وجیہہ، نوجوان کی تصویر تھی۔ چمکتی شفاف آنکھوں والا، کھڑی مغرور ناک والا......انتہائی خوب صورت نوجوان، عمائم کی آنکھوں میں ستائش اتر آئی تھی۔ اس نے بسمہ چاچی کا بھیگا کپکپاتا ہاتھ پکڑ کر بے ساختہ پوچھا۔
''یہ کس کی تصویر ہے؟'' عمائم کی آنکھوں میں تجسس تھا۔ تب تک بسمہ بھی سنبھل گئی تھی۔ تصویر عمائم کے ہاتھ سے لے کر بھیگی، پرنم، کرب انگیز آواز میں بولی۔
''میرے شوہر کی......'' بسمہ کی آنکھوں سے قطرہ، قطرہ آنسو پھر سے پھسلنے لگے تھے۔ عمائم نے تحیر سے پوچھا۔
''یہ کہاں ہیں......ابروڈ کیا؟''
''نہیں، جیل میں۔'' بسمہ نے سر جھکا کر ضبط کی کڑی منزلوں سے گزرتے ہوئے بتایا۔ عمائم کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔

☆☆☆

وہ بہت عجلت میں پارکیٹ، سے نکل رہا تھا۔ اور کوئی بہت تیزی سے اندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یوں دونوں کی بڑی آؤٹ کلاس ٹکر ہوئی تھی۔ نتیجتاً دونوں کے ہاتھ میں موجود چیزیں گر پڑیں۔ دونوں ہی حواس باختہ ہو گئے تھے۔ پھر جب حواس ٹھکانے آئے تو پہچان کا مرحلہ دونوں طرف طے ہوا تھا۔
''سونیا......تم!'' طاہر نے اپنے گاگلز اٹھاتے ہوئے بے ساختہ جوش سے کہا تھا۔ اسے نئے خریدے گاگلز کے چمکتے شیشوں پر پڑنے والے اسکریچز کا غم بھی لمحہ بھر کے لیے بھول رہا تھا۔ ورنہ وہ تو ایسی ''چیز'' تھا کہ پیسے نکلوا کر قیمت وصول کرتا اور دم لیتا۔ اِدھر سونیا بھی گومگو کی کیفیت سے نکل کر بے دلی سے مسکرا دی تھی۔ اس نے طاہر کو پہچان لیا

ایک عہد ساز شخصیت .... : سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا

میرا اور جاسوسی پبلیکیشنز کا ناتا بہت پرانا ہے جب میں صرف تیرہ سال کی اسکول گرل تھی گھر میں سسپنس جاسوسی اور پاکیزہ آتے تھے اور ہم اس کی کترنیں بہت شوق سے پڑھتے، میرے چاچو کینیڈا سے کراچی شفٹ ہو گئے اور یہاں مختلف سلسلوں میں معراج انکل سے ان کے مراسم بنے جب وہ تہواروں پر گھر آتے تو مرے ہاتھوں میں رسالے دیکھ کر کہتے ان کا اونر مرا دوست ہے اور میں ان پر رشک کرتی۔ میں نے نویں کلاس سے تبصرے لکھنا شروع کر دیے تھے اور اس وقت کرسی صدارت ملنا بڑا اعزاز تھا جب یہ کرسی ملتی تو گھر بھر میں خوشی سے دوڑتے تب چاچو کہتے میں معراج سے کہوں گا اسے پکی کرسی دے، دے تا کہ یونہی خوش رہے خیر سفارش تو نہ ہوئی مگر ٹیلی فونک رابطہ ہو گیا ہم قاریوں کے لیے تو معراج انکل بڑی توپ چیز تھے۔ ان سے بات کا ہونا قلعہ فتح کرنے کے برابر تھا میرے تبصروں کا ذکر ان کی زبان پر مجھے کہاں سے کہاں اڑا کر لے گیا اور یہ انہی کے الفاظ تھے کہ وکیل سے پہلے تم رائٹر بنو گی اور مرزا امجد بیگ کی طرح سسپنس میں اسٹوریز لکھو گی... ان کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی مگر جب قلم چلا ہم بڑے ہوئے تو ہماری تحریر پر رائے دینے والی ہستی بیمار ہو گئی میری ملاقات بھی تب ہوئی جب وہ بیمار تھے دلکش کی تقریب میں مگر بہت حیرت ہوئی جب انہوں نے مجھے پہچان لیا بہت خوشی ہوئی مگر ان کی طبیعت کی وجہ سے زیادہ بات نہ ہو پائی مگر ڈائجسٹ کی دنیا کے بادشاہ سے یہ ملاقات میرے لیے سرمایہ بن گئی۔ ان کے چاروں رسالوں کی مقبولیت کی اصل وجہ ان کا رائٹر کو معاوضے کے ساتھ مان اور عزت دینا ہے ان کے لیے کوئی بڑا یا چھوٹا رائٹر نہ تھا سب برابر تھے اور وہ ان کے لکھے کی قدر کرتے تھے معراج رسول وہ جوہری جسے ہیرے کی پہچان تھی انہوں نے

تھا۔ عمامہ کا بھائی، شوخ اور شرارتی سا۔ جس کی تعریفیں کرتی بسمہ کبھی نہیں تھکی تھی۔ اگر اتنا زور وکالت پر لگا لیتی تو نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔

ان دونوں کو قسمت نے ڈیڈی کے دفتر میں ملا دیا تھا۔ بسمہ اگر کیس نہ ہارتی تو ان کی ملاقات ہی نہیں ہوتی۔ لیکن وہ کیس کیسے نہ ہارتی۔ اوپر تقدیر میں ان کا میل اسی سبب سے لکھا تھا۔ اور کیا ضروری تھا بسمہ کو طاہر ہی ٹکراتا، عمامہ کا بھائی......؟ جسے دیکھ کر سونیا کو پہلی مرتبہ کوئی اپنا محسوس ہوا تھا۔ اور یہ تو بہت شکر کی بات تھی جو سونیا کو سنبھلنا آتا تھا۔ ورنہ اس کی حالت بھی عمامہ سے کم نہیں ہوتی۔ وہ بھی عمامہ کی طرح جوگ اور روگ لگا کر بیٹھ جاتی۔

پہلی نگاہ میں کوئی اچھا لگے، کوئی بہت اپنا لگے اور وہ ہمارے لیے نہ ہو...... تو یہ صرف تقدیر کا اٹل فیصلہ ہوتا ہے جس سے ٹکرانا انتہائی بیوقوفی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ سو سونیا نے مشکل سے، ہی سہی، اپنی راہ بدل لی تھی۔ کیونکہ مقابل کوئی اور نہیں، اس کی اپنی معصوم بہن تھی۔ جیسے طاہر سے بڑا ''معصومانہ پیار'' ہو چکا تھا۔

بسمہ اور عمامہ کے لیے ہی سہی، سونیا کو اخلاقاً زبردستی مسکرانا پڑا تھا۔ طاہر بھی کھل سا گیا۔ بسمہ اور عمامہ کے حوالے سے وہ سونیا سے بہت اخلاق کے ساتھ بات کر رہا تھا۔

''کیا میں تمہیں ڈراپ کر دوں......؟'' ''تم نے کیا خریدنا ہے؟'' طاہر کو اچانک اپنی ذمے داریوں کا احساس ہوا تھا۔ سونیا ایک مرتبہ پھر اخلاقاً مسکرائی تھی۔

''میں اپنی گاڑی میں آئی ہوں...... کچھ ونڈو شاپنگ کروں گی۔ تم بتاؤ، عمامہ کیسی ہے؟'' سونیا نے عجلت میں کہا۔ وہ جلد از جلد طاہر کے سامنے سے ہٹنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اسے ابرار کی کال پر پہنچنا تھا۔ وہی ابرار جو اسے بھی

ایسے ایسے ہیرے تراشے جو ادب کے بے تاج بادشاہ بنے انہی میں محی الدین نواب شامل ہیں جو ویا بیگم کے فرضی نام سے لکھ رہے تھے معراج صاحب نے جب انہیں جاسوسی پبلی کیشنز کا حصہ بنایا تو دیوتا جیسا لازوال سلسلہ چلا اسی طرح علیم الحق حقی، طاہر مغل، عبدالقیوم شاد، الیاس سیتا پوری اور بہت سے نامور مصنف انہی کے ہاتھ کا لگا پودا ہیں اور سب سے اچھا پہلو اپنے ادارے کے تمام لوگوں کا اپنے گھر کے افراد کی طرح خیال رکھنا ان کے دکھ اور سکھ میں شامل ہونا ایک فیملی کے فرد کی طرح ایک مقبول و معروف ادارے کے مالک کا یہ رویہ قابل تحسین ہے بلکہ اکثر مصنفین کو کہانیوں کا معاوضہ پیشگی ادا کر دیا جاتا تھا تاکہ ان کی ضروریات پوری ہو سکیں اسی لیے میں یہ کہتی ہوں معراج رسول صرف ایک شخصیت نہیں بلکہ عہد ساز شخصیت ہیں۔ اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور جاسوسی پبلیکیشنز کو اسی طرح ادب کے افق پر براجمان رکھے، آمین۔

تھذیب کی چاشنی ...... سدرۃ المنتھی

کسی بھی ...... قوم کے لیے اس کا ادب مشعل راہ ہوتا ہے اور ایک دنیا جانتی ہے کہ ڈائجسٹی ادب نے گاؤں گوٹھوں قصبوں دیہاتوں چھوٹے بڑے علاقوں میں اپنی طرز کی شمع روشن ضرور کی ہے۔ ایک بھی نہیں چار، چار پرچوں کو اکٹھے چلانا اور ہر طرح کے حالات میں قائم رکھنا بہت بڑی بات ہوتی ہے معراج صاحب کو کریڈٹ ہے کہ وہ چار، چار پرچوں کو اسی معیار کے ساتھ نباہتے رہے۔ آج وہ ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کا سرمایہ ان کی حیات کی محنت کو اجالتا نکھارتا رہے گا۔ یہ پرچے ہمیں یاد دلاتے رہیں گے ان کی اور ان کے اگائے ہوئے پودوں کی مہک ہم تک پہنچتی رہے گی۔ اور ہمیں تہذیب کی چاشنی دیتی رہے گی اور انہیں جزائے خیر دیتی رہے گی۔

ڈیڈی کے آفس میں ٹکرایا تھا۔ یہ بھی کیا کیمسٹری تھی۔ ان دونوں بہنوں کو اپنے ”رائٹ مین“ ملے بھی تو کہاں...... ابرار وہ تھا جس کے بارے میں ابھی تک وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکی تھی اور عمامہ کو بھی نہیں بتا سکی تھی۔ لیکن... کم از کم ابرار اسے دیکھ چکنے اور پرکھ چکنے کے مرحلے سے گزرنے کے بعد اس وقتی دکھ کی کیفیت سے نکالنے کے لیے بہترین آپشن بنا تھا۔ وہ اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔ اس وقت طاہر کی بات پر چونک گئی۔

”عمامہ ٹھیک ہے لیکن کچھ افسردہ لگتی ہے۔ جانے اسے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ تم اس کی فرینڈ ہو۔ پوچھو ناں اسے وہ پہلے کی طرح نہیں...... بدلتی جا رہی ہے۔ کسی دن چکر لگاؤ ناں...... تمہیں دیکھ کر وہ خوش ہوتی ہے۔“ طاہر کے لہجے میں بہن کے لیے محبت ہی محبت تھی۔ سونیا کو رشک سا آیا۔

”میں آؤں گی......“ اس نے اخلاقاً حامی بھری اور اجازت لے کر مارکیٹ کے ہنگامے میں کھو گئی تھی۔

طاہر بھی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ یہ جانے بغیر کہ دو شاطر اور مکار آنکھوں نے اس کا دور تک پیچھا کیا تھا...... جب طاہر نظر سے اوجھل ہو گیا۔ تب وہ مکاری سے مسکراتا ہوا ایک نزدیکی پی سی او کی طرف بڑھ گیا تھا۔

”اوہ تو ایک تیر سے دو شکار...... دو بہنیں، دونوں ہی سہیلیاں، بڑا چکر چلایا ہے طاہر صمدانی...... وکیل صاحب بھی پھانس لی اور اس کی بہن بھی۔“ وہ ایک نمبر ملاتا بار، بار اسی منظر سے لطف اٹھا رہا تھا۔

☆☆☆

فون کی گھنٹی بجی تو صوفی صالح نے مصروف انداز میں فون اٹھالیا۔ وہ اس وقت کاروباری کتابچوں کو کھول کر حساب کتاب لگا رہے تھے۔ فون کی دوسری طرف سے آتی آواز سن کران کے ماتھے پر گرہیں سی پڑیں۔

''تم...... منحوس انسان بکو...... کیوں فون کیا ہے؟ کیا ہڈی منہ سے نکل گئی؟'' منصور کی آواز سن کر صوفی صالح کے تیور بگڑ گئے تھے۔ان کا سارا اچھا موڈ فنا ہو گیا۔
''میں نے ایک خاص مقصد کے لیے فون کیا ہے؟ اتنا فارغ میں بھی نہیں......'' منصور نے بھی ترخ کر جتلایا۔
''بکو......'' وہ لمبی بحث میں پڑے بغیر غرائے تھے۔
''آپ کے بیٹے کی کارگزاری کے متعلق اطلاع دینی تھی۔'' منصور نے عادتاً تجسس کری ایٹ کرنا چاہا۔
''مطلب......؟'' انہوں نے نخوت سے پوچھا۔قریب تھا کہ وہ فون پٹخ ہی دیتے۔جب منصور ان کا ارادہ جان کر عجلت میں بولا تھا۔
''ذرا دل تھام کر سننا...... یہ نہ ہو ہارٹ اٹیک ہو جائے۔آخر آپ کی ''نیک نامی'' پر چار حرف کی بات کرنے والا ہوں۔'' منصور نے دل جلانے والے انداز میں کہا تھا۔صوفی صالح ضبط سے سنتے رہے۔
''آپ کا شہزادہ طاہر دو، دولڑکیوں کو بغل میں دبائے سارے شہر میں ''عیاشی'' کرتا پھر رہا ہے۔'' منصور آگے بھی تفصیلات بتا رہا تھا۔صوفی صالح کا دماغ گھوم گیا۔ان کے ہاتھ سے ریسیور گر گیا تھا۔

☆☆☆

''تم تو بہت ہی ڈفر ہو عمامہ!'' سونیا چیخ پڑی تھی۔''اللہ نہ کرے ایسا ہو۔''
''تو پھر مسئلہ کیا ہے؟'' عمامہ نے چڑ کر پوچھا تھا۔
''اچھا، ناراض مت ہو...... بات تو بتاتی ہوں مگر ہے رسوائی کی۔'' سونیا نے اسے ٹہوکا دے کر آہ بھری تھی۔ عمامہ چونک گئی۔
''بتا بھی چکو......'' اس کے صبر کا پیمانہ خواہ مخواہ کے سسپنس کی وجہ سے لبریز ہو رہا تھا۔
''مجھے جس سے محبت ہوئی ہے وہ ایک لارڈ کا لخت جگر تھا۔'' سونیا نے ایک جذب سے کہا۔عمامہ جیسے اٹک گئی تھی۔
''تھا؟ کیا گزر چکا ہے؟'' اس نے دہل کر پوچھا۔سونیا جیسے چیخ پڑی تھی۔
''تم سے کسی اچھی بات کی کوئی امید نہیں۔''
''تو پھر......؟'' وہ ہونق سی گئی۔جبکہ سونیا اسے گھورتی رہ گئی۔
''اب تم بیچ میں ٹوکنا تو سہی......'' سونیا نے اسے وارننگ دی تھی۔عمامہ چپکی بیٹھی رہ گئی تھی۔احتیاطاً لبوں پر انگلی بھی رکھ لی تھی۔ورنہ عین ممکن تھا سونیا اس کے لبوں پر ٹیپ چپکا دیتی۔
''ہاں تو میں بتا رہی تھی۔وہ ایک لارڈ کا بیٹا تھا۔آج کل کنگال ہے۔وہ بھی اپنے ''خطرناک'' باپ کی وجہ سے......اس کے باپ نے گن پوائنٹ پر اس کا نکاح اپنی بھتیجی سے کروانا چاہا...... وہ مال دار اکلوتی آسامی تھی۔یہ رسیاں تڑوا کر بھاگ نکلا ہے۔آج کل ڈیڈی کے دفتر میں بیچارہ ملازمت کر رہا ہے۔اس نے ابروڈ کے لیے اپلائی بھی کر رکھا ہے۔جیسے ہی کام بنا وہ لمبی اڑان پر ''شوں'' کر کے سمندر پار......'' سونیا نے باقاعدہ ہاتھ کا جہاز بنا کر دکھایا تھا۔عمامہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔
''اور تم......؟''
''میں بھی اس کے ہمراہ جاؤں گی ڈفر......'' سونیا نے دانت پیسے۔
''تو پرابلم کیا ہے پھر......؟'' عمامہ کو یہ ''معما'' سمجھ نہیں آیا تھا۔جب لڑکا اور لڑکی راضی تھے تو پھر پرابلم کیا تھی؟ سونیا کے ڈیڈی بھی بہت لبرل تھے۔یقیناً اس کے مسائل عمامہ جیسے نہیں تھے۔اس کے ڈیڈی کوئی اعتراض نہ کرتے۔
''پرابلم یہ ہے کہ ڈیڈی نے اسے اپنی ''دامادی'' میں لینے سے انکار کر دیا۔'' سونیا نے سوں، سوں کرتے ہوئے بتایا۔عمامہ کو شاک لگا......سونیا کے لبرل سے ڈیڈی ظلم سماج بن جائیں گے۔عمامہ کو توقع نہیں تھی۔

''انکار کیوں کیا؟'' عمامہ کو دلی رنج ہوا تھا۔ اس کی سہیلی بھی اس کی طرح ''بے مراد'' رہتی یہ عمامہ کو گوارا نہیں تھا۔

''اس کے کنگال پن کی وجہ سے۔'' سونیا نے بیزاری سے بتایا تھا۔ گو کہ یہ بڑی وجہ نہیں تھی پھر بھی سونیا اداس تھی۔ سونیا اداس کیوں تھی۔ عمامہ متفکر ہوئی۔

''وہ باہر چلا جائے گا تو پھر کیا مسئلہ ہے؟''

''وہ چاہتا ہے ہم کورٹ میرج کرلیں...... وہ میرے پیپرز بھی بنوالے۔ لیکن ڈیڈی نہیں مانتے۔ انہیں بہت سے تحفظات ہیں۔'' سونیا جذباتی سی ہوگئی تھی۔ عمامہ سوچ میں پڑ گئی۔

''انکل کے تحفظات بجا ہیں۔'' بہت دیر بعد عمامہ نے کہا بھی تو کیا؟ سونیا کو برا لگا...... اس نے تیکھے چتونوں سے اسے گھورا تھا۔

''تم تو یہی کہو گی۔'' وہ بسوری تھی۔ ''اپنی دفعہ کا پتا ہے، کس حد تک جانے کے ارادے تھے؟'' سونیا کو بھی گزشتہ ایک، ایک بات ازبر تھی۔ بھولی کچھ نہیں تھی۔ عمامہ کا دل ڈوب سا گیا۔ وہ تو دل سے چاہتی تھی سونیا کی مراد ''بر'' آئے۔ بلکہ وہ تو سونیا کو اپنی بھابی بھی بنانا چاہتی تھی۔ لیکن عمامہ کے چاہنے سے کیا ہوسکتا تھا؟ کچھ بھی نہیں...... عمامہ کو بھی بہت کچھ یاد آگیا۔

''اور تم جو میرے بھائی کے لیے دل میں نرم، نرم جذبات رکھتی تھیں۔ وہ کہاں گئے؟'' عمامہ نے بھی اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ صد شکر کہ میں طاہر بھائی سے بات نہیں کرچکی۔ ورنہ کتنا برا ہوتا۔''

''نرم، نرم جذبات تو اب بھی موجود ہیں۔'' سونیا نے آنکھ ماری تھی۔ ''بلکہ میرا تو پکا ارادہ تھا تمہارے ''نو شکے'' سے بھائی کو ٹریپ کرنے کا لیکن میرے ہیرو نے بڑے غلط ٹائم پر انٹری مار کے میرے ہاتھوں تمہارے بھائی کو بچا لیا ہے۔''

''اچھا ہی ہوا......'' عمامہ نے ہاتھ جھاڑے تھے۔ ''ورنہ میرا بھائی ساری عمر تجھے بددعائیں دیتا۔''

''دعائیں تو وہ اب بھی نہیں دے گا۔'' سونیا نے طنزیہ کہا۔

''کیوں......؟'' عمامہ نے اسے گھورا۔

''کیونکہ میری ''حواس باختہ'' بہن تمہارے بھائی کے پلے پڑنی ہے۔'' سونیا نے جیسے دھماکا کیا تھا۔ عمامہ کا منہ بے ساختہ کھل گیا تھا۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ عمامہ کی آنکھوں میں حیرانی پھیلتی چلی گئی تھی۔ جیسے اسے کسی طور پر بھی سونیا کی بات پر یقین نہیں آیا ہو۔ جیسے سونیا نے اِک تعجب میں ڈالنے والی بات کی ہو۔ لیکن اچانک اسے خیال آیا تھا۔ شام بھی طاہر بھائی کے کسی چکر کا ذکر کررہا تھا۔ کیا خبر یہی چکر ہو...... وہ سوچتی، سوچتی ایک نکتے پر ٹھہر گئی تھی۔

''میری تو خواہش تھی کہ تم میری......'' عمامہ کچھ کہتے، کہتے رک سی گئی تھی۔ ''میں نے سوچا شاید تم بھی...... طاہر بھائی تمہیں پسند تو تھا ہی...... میں نے سمجھا۔'' وہ اٹک، اٹک کر چپ ہوگئی تھی، کیا اسے یہ باتیں دُہرانا چاہیے تھیں۔

''ہر خواہش پوری نہیں ہوتی...... سنا تم نے۔'' سونیا نے بے ساختہ اس کی بات کاٹ دی تھی۔ اس کا انداز کچھ، کچھ جارحانہ تھا۔ عمامہ کے ہونٹ بھینچ گئے تھے۔

''تو کیا سونیا، طاہر بھائی سے......؟'' عمامہ دھک سے رہ گئی۔ اس کے چہرے پر تو جو تاثرات ابھرے تھے وہ سونیا کی نگاہوں سے چھپ نہیں سکے۔ اس نے بے ساختہ نظر چرالی تھی۔ اور پھر سونیا نے دل کی تہوں میں اترا راز کھول دیا۔ عمامہ جیسے ششدر رہ گئی تھی۔

''مجھے خاموشی سے رستہ چھوڑنا تھا سو چھوڑ دیا۔ بغیر کسی شور اور آہٹ کے...... کیونکہ جس رستے پر میں محوِ سفر تھی۔ وہ رستہ میرا تھا ہی نہیں۔'' سونیا کے اگلے الفاظ عمامہ کو فریز کرچکے تھے۔ وہ اس کے ''ایثار'' پر سرتاپا لرز رہی

تھی۔ کیا یہ سونیا تھی...... اتنی وسیع القلب......؟ کیا اسی سونیا کو عمامہ جانتی تھی؟ وہ دنگ کھڑی رہ گئی۔
''میں نے سمت بدل لی۔ اور توجہ بھی...... اس سے اچھا آپشن نہیں تھا۔ پھر وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا......'' اب وہ بڑے سکون سے بتا رہی تھی۔ اتنے سکون سے کہ عمامہ کو اس کے سکون پر وحشت ہونے لگی۔
''تم نے یہ سب کس طرح سے کیا؟ کیسے؟'' عمامہ نے دہل کر پوچھا۔ اس کے لیے یہ سب بہت کٹھن اور دشوار تھا۔ وہ سونیا جیسی وسیع القلب اور بہادر نہیں تھی۔
''بہت آسان ہے...... اگر تھوڑا دل بڑا کرلیا جائے...... جو کہ میں نے کرلیا...... کچھ مشکل تو تھا لیکن آپی کی ''خوشی'' سے بڑھ کر نہیں تھا۔ میں نے ان کی آنکھوں میں پیار کے رنگ دیکھ لیے تھے۔'' وہ بہت سکون سے کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

عمامہ نے بے ساختہ اسے روکا تھا۔ وہ شدید گھبراہٹ کا شکار تھی۔
''تم نے اسے کیوں بلوایا ہے؟ میں نہیں ملوں گی۔ میرے بھائیوں کو پتا چل گیا تو......؟'' عمامہ رو دینے کو تھی۔ اسے گھبراہٹ کے مارے غش آرہے تھے۔
''کیسے پتا چلے گا؟ بس ایک منٹ کے لیے اپنی سہیلی کے ہونے والے شوہر کا درشن کرلو...... بعد میں مت کہنا۔ تمہیں دکھایا بھی نہیں......'' سونیا اس کی سنے بغیر اپنی کہے جا رہی تھی۔ شاید وہ عمامہ کی پریشانی کی تہوں میں نہیں اتری تھی۔
''تم مجھے بس گھر بھجوا دو......'' عمامہ نے گھبراہٹ میں کہا...... ''دیکھو، کتنا وقت گزر گیا۔ اماں ناراض ہوں گی۔''
''یار آدھے منٹ کی بات ہے...... تم آؤ تو سہی......'' وہ اسے کھینچ کر گیٹ پر لے آئی تھی۔ عمامہ نے چہرہ ڈھک لیا تھا۔ چادر پیروں تک پھیلالی تھی۔ باہر کوئی اسمارٹ نوجوان کھڑا تھا۔ سونیا پوری باہر نکل گئی۔ دو تین منٹ کے لیے اس سے بات کی۔ تب ایک سیکنڈ کے لیے وہ اندر کی طرف مڑا تھا۔ عمامہ کے دھواں بھرتے کانوں میں صرف سلام اترا تھا۔ عمامہ نے باقی کچھ نہیں سنا...... سر ہلا کر جواب دیا۔ اور پلٹ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ بندہ بھی سونیا کی طرف متوجہ ہوگیا۔ بہت شائستہ اطوار تھا۔ اگلے منٹ میں سونیا کو ''بائے'' کہا اور چلا گیا۔ لمحوں کی دیر تھی۔ اسی پل ایک اور کار کے ٹائر سونیا کے گیٹ پر چرچرائے تھے۔ سونیا نے گردن گھما کر دیکھا اور مسکرا کر آگے بڑھی۔ سلام دعا کی اور عمامہ کو آواز لگائی۔ اس کا انداز پُرجوش تھا۔
''عمامہ......! تمہارے بھائی لینے آئے ہیں...... ایمان سے یہ بھی کم نہیں......'' وہ آنکھوں سے شوخ سا اشارہ کر رہی تھی۔ عمامہ کا دل اچھل پڑا۔ وہ جلدی سے کھلے گیٹ کو کچھ اور کھول کر باہر آگئی تھی۔ فرنٹ سیٹ پر تقی براجمان تھا...... اسٹیئرنگ وہیل کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے...... اس کا چہرہ بہت سپاٹ تھا۔ اتنا سپاٹ کے عمامہ لرز کر رہ گئی۔
''کہیں تقی بھائی نے کچھ دیکھ تو نہیں لیا؟'' خوف کے مارے اس کی گھگی بندھ گئی تھی۔ اگر تقی بھائی نے دیکھ لیا ہو تو؟ عمامہ کی دھڑکنیں تک رکنے لگی تھیں۔ اس کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ چادر میں گم اس کے کانپتے وجود سے بے نیاز سونیا، تقی بھائی کو چائے کے لیے روک رہی تھی۔ لیکن بھائی کا خشک سا انکار عمامہ کے بدترین خدشات کی تصدیق کر رہا تھا۔ تو کیا اس نے واقعی کچھ دیکھ لیا؟ تقی کو پتا چلا کہ عمامہ گھر پر نہیں ہے اور وہ بہانے سے سہیلی کے ہاں گئی ہے تو اس کا پارہ چڑھ گیا۔ اور تب وہ اماں پر غصہ کر کے سونیا کا ایڈریس پوچھنے کے بعد اسے لینے کے لیے پہنچ گیا تھا۔ چونکہ عمامہ پر پہلے سے غصہ تھا سو سونیا کے گھر کا بیرونی منظر اس کے غصے کو بڑھا گیا تھا۔ ایک اجنبی جوان کا سونیا کے گھر سے نکلنا اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھا، پھر سونیا بھی گیٹ پر موجود تھی اور عمامہ کی جھلک بھی نظر آرہی تھی۔ جس کا مطلب تھا وہ دونوں مہمان کو سی آف کر رہی تھیں۔
شدید غصے اور غیرت کے مارے تقی کے گال تپ رہے تھے۔ جیسے آگ کی گرم لپیٹیں نکل رہی ہوں...... پھر بھی

وہ ضبط کا مظاہرہ کر رہا تھا اور اس وقت عمامہ سے کلام کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن عمامہ کے لیے وضاحت دینا ضروری تھی۔ اس نے بڑی ہمت کے ساتھ ڈرتے، ورتے بہت دیر کی خوفناک خاموشی کے بعد تقی کو مخاطب کر لیا تھا۔

''تقی بھائی! ہوا کیا ہے؟'' وہ کپکپانے لگی۔ تقی نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ عمامہ کی سانس جیسے خشک ہوئی تھی۔

''کون تھا وہ......؟'' اب کے اس کا لہجہ کمزور ہو گیا۔ بہت دھیما مگر سخت......عمامہ کی آنکھوں میں ریت بھر گئی تھی۔ اسے سمجھ آ گئی، تقی بھائی نے کچھ نہ کچھ دیکھ لیا تھا۔

''وہ سونیا کا مہمان تھا......اس کا منگیتر......'' عمامہ نے سر جھکا کر بتایا۔ تقی نے ایک سلگتی نگاہ عمامہ پر ڈالی تھی۔ اس کے غصے کا گراف ایک دم بڑھ گیا تھا۔

''لیکن تمہارا وہاں کیا کام تھا؟'' بہت محتاط ہو کر بھی اسے کھل کر پوچھنا پڑا۔ عمامہ کا سر جھک گیا تھا۔ اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ سونیا کی دھونس اور ضد کا کیسے بتاتی؟

''وہ مہمان یا اس کا منگیتر تمہاری موجودگی میں سونیا کے گھر کیا کر رہا تھا۔'' تقی کے ماتھے کی رگ پھولنے لگی تھی۔ اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھوں کی گرفت سخت ہو گئی تھی۔

''وہ صرف گیٹ پر آیا تھا۔ دو منٹ کے لیے......اسے سونیا سے کام تھا کوئی......سونیا کے ڈیڈی کے پاس کام کرتا ہے۔'' عمامہ نے ہکلا کر وضاحت دی تھی۔

''بھاڑ میں جائے وہ، تم گیٹ پر کیوں آئی تھیں؟'' تقی غرایا تھا۔ عمامہ کانپ سی گئی۔

''بہت دیر ہو گئی تھی، میں نے سونیا سے کہا، مجھے گھر چھوڑ آئے۔'' وہ بری طرح سہم کر رونے لگی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس تفتیش سے گزر رہی تھی۔ اس کے بھائیوں نے کبھی ایسے سوال نہیں کیے تھے۔ نہ وہ ایسے امتحانی کمرے میں کبھی بیٹھی تھی۔

''تم گھر فون کرتی یا دفتر......وہاں سے کوئی آ جاتا۔'' تقی کچھ دھیما پڑا تھا۔ جو کام عمامہ کے آئیں بائیں سے الفاظ نہیں کر سکے تھے۔ وہ کام اس کے آنسوؤں نے کر دکھایا تھا۔

☆☆☆

اس کے پیروں میں چکر پھیریاں لگی تھیں۔ وہ دوپہر سے سہ پہر تک چکراتی رہی۔ سوچتی رہی، پریشان ہوتی رہی۔ عمامہ کی سہیلی اتنی بری نہیں تھی۔ کم از کم فیقہ کے لیے تو بالکل نہیں......اس نے سونیا کے خلوص کو سمجھا نہیں اور بیچاری کی ہمدردی کو ٹھکرا دیا۔ فیقہ کو تب سے رہ، رہ کر افسوس ہو رہا تھا۔ کاش، سونیا دوبارہ چکر لگاتی تو وہ اس سے معذرت کر لیتی۔ اسے سونیا تک معذرت پہنچانے کا کوئی ٹھوس ذریعہ نہیں سمجھ آ رہا تھا۔ اسی پریشانی میں وہ چکراتی پھر رہی تھی۔

معاً اسے خیال گزرا۔ وہ عمامہ کی ڈائری سے اس کا فون نمبر لے سکتی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ عمامہ کے کمرے میں چلی آئی۔ فون نمبر بہ آسانی مل گیا تھا۔ فیقہ نے تھوڑی ہمت سے کام لیا اور نمبر ڈائل کیا۔ کچھ ہی دیر میں کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ فیقہ کو سمجھ نہیں آیا وہ کیا تعارف دے؟ ابھی تک عمامہ بھی نہیں لوٹی تھی۔ کیا پتا، دونوں ایک ساتھ ہوں......؟ اس نے غلط ٹائم پر فون کر دیا تھا۔ اب کیا کرتی، بند کر دیتی؟ بات کر لیتی؟ پھر اس نے سونیا کے بار، بار ہیلو کے جواب میں اپنا تعارف کروا دیا۔ دوسری طرف سونیا کو شاک لگا تھا۔ وہ حیران رہ گئی تھی۔ فیقہ نے بغیر رکے ایک ہی سانس میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو اس کے اندر پچھتاوے بھر رہا تھا۔ اس نے بیس منٹ تک بات کی اور مسلسل خود ہی بولتی رہی۔ سونیا نے اس کی بات اطمینان سے سنی تھی۔ اسے فیقہ کی معذرت پر دلی خوشی ہوئی اس نے سوری کو ایکسپیٹ کر لیا تھا۔ دونوں میں خوشگوار گفتگو کا تسلسل بڑھتا رہا۔ آخر میں فیقہ نے سونیا سے کہا۔

''تم میری مدد کرو گی؟'' اس کے انداز میں جھجک تھی۔ سونیا نے جوش میں حامی بھر لی۔ مدد کی نوعیت نہیں

پوچھی تھی۔
''وائے ناٹ...... ہر وقت ہر جگہ......'' وہ مسکراتی رہی گویا فیقہ کو احساس ہو گیا تھا۔ سونیا کی کامیابی کے لیے یہی کافی تھا۔
''سونیا! میں چاہتی ہوں تم مجھے بدل دو......'' فیقہ اب بھی جھجک رہی تھی۔ کچھ خفیف ہو رہی تھی۔ سونیا ٹھٹک گئی۔
''تم نے کہا تھا ناں...... تم مجھے بدل دو گی...... میری زندگی میں بہت گھٹن ہے، بہت حبس ہے، میں کھلی فضا میں سانس لینا چاہتی ہوں...... میری سہیلی نے جو گرہن میرے منہ پر لگایا تھا اس نے میری زندگی کو ختم کر دیا۔ میرے اندر سے امید ختم ہو گئی تھی۔ میں چاہتی ہوں میرے اندر امنگ آئے، میں جینا چاہتی ہوں سونیا......'' فیقہ کی بولتے، بولتے آواز بھرا گئی تھی۔ سونیا کا بھی دل بھر آیا۔ وہ ایک لڑکی ہونے کے ناتے فیقہ کے جذبات سمجھتی تھی۔
''میں تمہاری مدد کروں گی فیقہ......'' سونیا نے تکلف اور عمر کی ہر دیوار گرا کر بڑے خلوص سے کہا تھا۔ فیقہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔
''لیکن اس کے لیے تمہیں سب سے پہلے اپنی پرسنالٹی پر توجہ دینا ہو گی۔ تمہیں اپنا لباس اور اسٹائل بدلنا ہو گا۔ میں تمہیں اچھی سے اچھی کریم اور اسکن ٹریٹمنٹ لا کر دوں گی۔ تمہارا چہرہ زیادہ نہ سہی کچھ ضرور بہتر ہو گا۔ تم اعتماد سے سب کا سامنا کر سکو گی۔ اور میں چاہوں گی تم اچھی سے اچھی کتاب پڑھو، میگزین دیکھو...... فیشن کو سمجھو، اسٹائل اپناؤ، دیکھنا، تم کتنا بدل جاؤ گی۔'' وہ خلوصِ نیت سے کہتی چلی گئی تھی۔ فیقہ کی آنکھوں میں امید جاگ گئی تھی۔ اس نے بے ساختہ خواب آگیں لہجے میں کہا۔
''میں عمامہ جیسی ہو جاؤں گی؟'' فیقہ کی آنکھوں میں ستارے سے بھر گئے تھے۔
''عمامہ سے بھی اوپر کی چیز......'' سونیا نے اپنے کھلے ڈھلے بے ساختہ انداز میں جواب دیا تھا۔ فیقہ کا دل خوش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر پھول کھل اٹھے۔ وہ چہرہ جو کبھی گلاب تھا اب ہر گلابی سے مبرا تھا۔ اس وقت ست رنگوں میں بدل رہا تھا۔
''پھر تو شام میری طرف متوجہ ہو گا؟'' فیقہ بڑی آس سے پوچھ رہی تھی۔ سونیا دھک سے رہ گئی تھی۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ ایسے سوال بھی کر سکتی تھی۔ اس سے کوئی جواب بن نہیں پڑا۔ وہ خفیف سی ہو کر لائن ڈسکنیکٹ کر گئی تھی۔ فیقہ نے سمجھا، کال ڈراپ ہو گئی ہے، وہ فون بند کر کے باہر نکل آئی...... اس وقت وہ پھول کی طرح ہلکی پھلکی تھی اور خود کو بادلوں کے رتھ پر سوار محسوس کر رہی تھی۔ اس کے من میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ کیا اس کی زندگی میں حقیقتاً کچھ بدلنے والا تھا۔

☆☆☆

سونیا نے جو کہا کر دکھایا...... وہ اگلے ہی دن فیقہ کے بلاوے پر حاضر ہو چکی تھی۔ سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ سونیا کو دیکھ کر دادی نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی بلکہ خوب لپٹا کر پیار کیا...... اب سونیا کیا جانے، دادی مطلب کے وقت گدھے کو بھی باپ بنا لیتی تھیں۔ شاید فیقہ نے دادی کو خوب سمجھا لیا تھا۔ سونیا کی خاطر دادی کو لب سینے ہی پڑے تھے۔ ورنہ یہی دادی تو تھیں سونیا کو ''جادوگرنی'' کا خطاب دینے والی۔ اس کی بے عزتی کرنے والی۔ اور اب انہوں نے جیسے سونیا سے بہناپا جوڑ لیا تھا۔
دادی نے گویا خفیہ تجوری کا منہ کھول دیا تھا۔ وہ سونیا کا پرس بھر دیتیں اور سونیا سب کچھ فیقہ پر اڑا کر آ جاتی۔ پھر ایک دن سونیا اسے پارلر بھی لے گئی۔ تب پارلر ایسے مقبول نہیں تھے۔ کوئی، کوئی ایسی عیاشی افورڈ کرتا تھا، سونیا نے زبردستی فیقہ کے لانبے بالوں کو اسٹائلش انداز میں سیٹ کروایا۔ اس کے کئی طریقے اور انداز کے فیشل ٹریٹ

منٹ کروائے۔ ہر روز مساج ہوتا، ہر روز طرح، طرح کی کریمیں لگوائی جاتیں پھر اسکن اسپیشلسٹ سے کنسلٹ بھی کیا...... دوائی، علاج، ڈاکٹرز سے سیشن بھی چلتے رہے۔ گھر کے مرد اتنی بڑی، بڑی تبدیلیوں سے آگاہ نہیں تھے۔ اب بیٹی کا معاملہ تھا۔ سو دادی خاموش رہیں ورنہ بہوئیں تو یہ سب نہیں کر سکتی تھیں۔ طاہرہ سب کچھ دیکھتی اور ٹھنڈی آہ بھر کے خاموش ہو جاتیں۔ عمامہ نے فیقہ کے علاج میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ بلکہ وہ حتیٰ المقدور سونیا کو مشورے دیا کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا فیقہ جب پرفیکٹ ہوگی تب اس کی اچھی جگہ پر شادی کر دادی جائے گی۔ سونیا کی بھی یہی خواہش تھی۔ وہ اس کا ظاہری علاج کر رہی تھیں، نفسیاتی نہیں......

سو دنوں میں فیقہ کا ظاہر بہت نہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور بدل گیا تھا۔ اسے پہننا...... اوڑھنا آ گیا۔ اسے سجنا سنورنا آ گیا تھا۔

عمامہ تو خود بھی سونیا کی کایا پلٹ پر حیران تھی۔ اتنی حیران کہ اسے فیقہ کو دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا اور فیقہ کو دیکھ کر تو کسی کو بھی یقین نہیں آتا تھا گھر کے مردوں کو بھی نہیں...... حتیٰ کہ شام کو بھی نہیں...... وہ خود بھی بہت متحیر تھا...... اور سونیا کے کمال دیکھ رہا تھا۔

ان دنوں عمامہ کے گھر سونیا ہمدانی، ہارٹ فیورٹ پرسنالٹی کے روپ میں ابھر کر سامنے آئی تھی۔ وہ سب کی ہر دل عزیز ہستی بن چکی تھی۔ دادی سے لے کر طابہ اور رافعہ تک ہر ایک سونیا سے مشورہ کرتا۔ فیشن، حسن، اسمارٹ نیس کے متعلق سونیا کی معلومات اپ ٹو ڈیٹ تھیں۔ طابہ اور رافعہ تک سونیا کے مشوروں سے فیض یاب ہوتیں۔ دادی سونیا کا نام لے، لے کر جیتیں۔ فیقہ اس کی شکر گزار ہوتی اور سونیا کے لیے سب کے دلوں میں احترام بڑھتا گیا تھا۔

پھر انہی دنوں موسم نے اچانک پلٹا کھایا۔ سرما سے گرما میں بدل گیا۔ موسم بہار کے بعد گرمی نے انگڑائی لی تھی۔ فیقہ کا لمبا علاج بھی ختم ہونے کے قریب تھا۔

ویسے تو سونیا، فیقہ کی زندگی میں خوشگوار ہوا کا جھونکا بن کر آئی تھی۔ اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی خوشگوار دھماکا بھی کرتی تھی لیکن ان دنوں تو سونیا کی وجہ سے عمامہ اور طاہرہ ہر قسم کے طنز اور کسیلی باتوں سے بچی ہوئی تھیں۔ دادی کا موڈ خوشگوار تھا۔ سو راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔

وہ گرما کا خوشگوار سا دن تھا۔ جب سونیا کی دھماکا خیز آمد ہوئی تھی۔ دادی سونیا کو دیکھ کر واری صدقے گئیں۔ اسی وقت طابہ کو آرڈر دیا۔ لوازمات سے سجی ٹرالی آ گئی تھی۔ پھر طاہرہ کو بھی آواز دے کر بلا لیا تھا۔ طابہ اور رافعہ بھی آ گئی تھیں۔ بڑی بھابیاں بھی پہنچ گئی تھیں۔ سونیا نے ماحول سازگار دیکھ کر گفتگو کا آغاز کیا۔ وہ دادی کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھی تھی۔ عمامہ بھی پہنچ گئی تھی کیونکہ سونیا کے انداز کچھ غیر معمولی تھے۔ جانے وہ کیا کہنے والی تھی؟ عمامہ کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

''میں ایک خاص مقصد کے لیے آئی ہوں دادی!'' سونیا نے بڑی لگاوٹ سے کہا۔ دادی، سونیا پر ان دنوں فریفتہ تھیں سو ساتھ لگا کر محبت سے بولیں۔

''کیسا مقصد میری بیٹی......؟'' ان کے انداز سے مٹھاس پھوٹ رہی تھی۔ سونیا نے کچھ ڈرامائی سا وقفہ دیا۔ ایک طائرانہ نگاہ سب کے چہروں پر ڈالی پھر نہایت محبت اور خلوص سے اپنے آنے کا مقصد بتایا۔

''میں فیقہ کے لیے ایک بہت اچھا پروپوزل...... لائی ہوں، لاء کالج کا پروفیسر ہے، بہت اچھا پروپوزل سمجھیں، فیقہ کی تو لاٹری نکل آئی۔'' سونیا بڑے جوش و خروش سے کہہ رہی تھی۔ ساری محفل پر سکوت طاری ہو گیا تھا۔ ہر کوئی ہکا بکا سونیا کو دیکھ رہا تھا۔ عمامہ تک حیران تھی۔ لیکن یہ حیرت محدود مدت تک تھی۔ اسے سونیا پر ٹوٹ کر پیار آ گیا تھا تو بالآخر اس نے عمامہ سے کیا وعدہ نبھا دیا تھا۔ وہ فیقہ کو اس کے رستے سے ہٹا کر کوئی ایک راہ ہموار کرنا

چاہتی تھی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو؟ اس کی دھڑکنیں رک سی گئیں۔
''دادی! آپ لڑکا دیکھیں گی تو بہت خوش ہوں گی۔ عمر بھی زیادہ نہیں...... اور بہت اسمارٹ ہے۔'' سونیا اب اس کی چیدہ، چیدہ خوبیاں گنوا رہی تھی۔ عمامہ کی سانسیں اٹکنے لگیں۔ وہ پوری محفل میں کسی کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی ساری توجہ دادی کی طرف تھی۔ وہ دادی کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ ان کا چہرہ پُرسوچ تھا۔ جھریوں سے اٹا ہوا، سوچتا ہوا، محفل پر پھر سے سکوت طاری ہو گیا تھا۔ یہ سکوت پھر دادی نے ہی توڑا تھا۔ کیونکہ سونیا جواب چاہتی تھی۔ اور بار، بار سوال ڈہرا رہی تھی۔
''سونیا بیٹی! تمہارا لایا ہوا رشتہ سر آنکھوں پر......'' دادی نے بڑی اعلیٰ پائے کی تمہید سوچی تھی۔ یہ سونیا کی خدمات کا اثر تھا۔ ورنہ پہلے سے حالات ہوتے تو دادی نے سونیا کا منہ توڑ کر رکھ دینا تھا۔
''لیکن بیٹی! تمہیں عمامہ نے نہیں بتایا۔؟ فیقہ اور شام کا رشتہ طے ہے۔ اب تو شادی کی تاریخ طے کرنے والی ہوں۔'' انہوں نے بڑے سلیقے اور مہارت سے سونیا کا منہ بند کر دیا تھا۔ ان کا انداز دو ٹوک قسم کا تھا۔ بہت مستحکم اور ٹھوس جس میں ردو بدل کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ سونیا ہکا بکا رہ گئی۔ وہ جو ڈھیر ساری ''وکالت'' سوچ کر آئی تھی ایک لفظ بھی ''دلیل'' نہ بنا سکی۔ دادی کا انداز ہی کچھ سوچا سمجھا تھا۔ سونیا کا سارا پروگرام بری طرح فلاپ ہو گیا تھا۔ جیسے ساری ریاضت مٹی میں مل گئی تھی۔ سارا منصوبہ فیل ہو گیا تھا۔ اس نے کیا سوچا تھا؟ فیقہ میں تبدیلی لاتا؟ اس کا علاج کرواتا، اسے زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا سکھاتا پھر اس کی اچھی جگہ شادی...... اور پھر عمامہ کی محبت کے لیے جگہ خالی ہو جاتی۔ لیکن سب کچھ پلان کے تحت نہیں ہوتا۔ یہ کچے، نافہم، ناسمجھ لوگوں اور ذہنوں کی پلاننگ تھی کیسے کامیاب ہوتی۔
سونیا کی رنگت اڑ سی گئی تھی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ سر اٹھا کر عمامہ کا دھواں ہوتا چہرہ دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔ اس سے سر اٹھایا نہیں گیا۔
دادی نے پہلے ہی وار میں سونیا کو چپ کروا دیا تھا۔ وہ جو فیصلہ کر چکی تھیں، اس سے ہٹنے والی نہیں تھیں۔
''میں اگلے ہفتے تاریخ رکھنے والی ہوں، سونیا بیٹی! تم نے ہر قدم پر پہلے کی طرح ساتھ دینا ہے، ساری خریداری تمہارے سپرد ہے۔ ہمیں تو کچھ فیشنوں اور رواجوں کا پتا نہیں......'' دادی نے سونیا کے کندھوں پر بڑی بھاری ذمے داری ڈالتے ہوئے محبت سے کہا تھا۔ اس کا سابقہ خلوص گواہ تھا کہ وہ انکار کرنے کی جرأت نہ کرتی۔ سونیا کے حلق میں گولا سا پھنس گیا۔ وہ عمامہ اور طاہرہ کے سامنے نکو سی بن گئی تھی۔ گردن پر ایسا بوجھ لد گیا تھا کہ سر اٹھانا محال تھا۔
اس میں عمامہ کے چہرے پر اڑتی ریت دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس میں طاہرہ کے چہرے پر پھیلی مایوسی دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔
''جس طرح تم نے فیقہ کا ساتھ دیا ہے، میری بچی! تمہاری عزت ہمارے دل میں بہت بڑھ گئی ہے، تم عمامہ کی سہیلی نہیں، اس گھر کا ایک خاص فرد ہو، ہر رسم میں تم نے شریک ہونا ہے۔'' اب وہ محبت بھری دھونس سے کہہ رہی تھیں۔ سونیا کا سر اثبات میں بھی نہیں ہل سکا۔
''تم نے میری بے رنگ بیٹی کی زندگی میں ''رنگ'' بھر دیے ہیں۔ میں تمہاری عمر بھر کے لیے شکر گزار رہوں گی۔ کبھی اس احسان کو اتار نہیں سکوں گی۔'' دادی نہایت رقت آمیز لہجے میں بولیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ سونیا نے بے ساختہ سر اٹھا کر دادی کی طرف دیکھا۔ اس کی گردن پر لدا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ نہایت ترنت اور اچانک......
''آپ اس احسان کا بدلہ اتار سکتی ہیں۔'' سونیا کے اگلے الفاظ نے سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔
(جاری ہے)

ساحل کی قسم منت طوفاں نہ کریں گے

سلمیٰ غزل

کمرے کی دھندلی روشنی میں کائنات نے ٹھنڈی سانس بھری اور دکھے دل سے کچھ سوچنے لگی۔ سردیوں کی شام کی اداس دھوپ ملگجی روشنی پھیلاتی ہوئی رخصت ہورہی تھی۔ کیسے گزرے یہ دس سال؟ کوئی اس کے دل سے پوچھتا جو درد کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ ان سالوں میں اس کی منزل دور دھندلکوں میں چھپی ہوئی تھی۔ دھندلی، دھندلی کہر زدہ منزل جو اس کا کل سرمایہ تھی۔ جینے کا آسرا اور زندہ رہنے کی

امنگ...... کبھی، کبھی وہ خود ترسی کا شکار ہو جاتی۔ یوں تو کالج میں اسے سب بے پناہ چاہتے تھے، عزت کرتے تھے ۔ سب شاگرد جان چھڑکتے تھے اور پورا اسٹاف اس کی صلاحیتوں اور قابلیت کا معترف تھا۔ پرنسپل بھی اس کی کارکردگی اور محنت سے بہت خوش تھیں۔ ہر سال اس کا رزلٹ کالج میں سب سے اچھا ہوتا تھا۔ ادبی دنیا کی وہ روحِ رواں تھی۔ گھر میں وہ باپ اور بھائی کی آنکھ کا تارا تھی، بھابی بھی جان چھڑکتی تھیں دونوں خوب صورت گوری چٹی بہنیں گھر بار کی ہوگئی تھیں۔ اکلوتا بھائی فارس امریکا پڑھنے گیا تو تعلیم مکمل کر کے شادی ہی کرنے آیا۔ غنیمت تھا کہ اس نے ابو کی پسند سے ان کے دوست کی بیٹی سے شادی کرلی جو بچپن میں اپنی ماں کو کھو چکی تھی اور باپ بھی اب کینسر کی آخری اسٹیج پر تھا۔ اِدھر ابا سدا کے رقیق القلب اور دوستی نبھانے والے دوست کی بیٹی کے لیے انہوں نے اپنے بیٹے کو آگے کردیا۔ خوب صورت ،طویل قامت اور مردانہ وجاہت کا نمونہ لیکن خیر خوب صورتی میں تو عنایہ بھی کچھ کم نہیں تھی۔ سادہ، خوش مزاج اور معصوم۔ اس کے ابو بھی شاید بیٹی کی رخصتی کا انتظار کررہے تھے اس لیے راہیِ ملک عدم ہونے میں انہوں نے دیر نہیں لگائی۔ عنایہ نے سسرال میں بھی آکر اپنی خوش مزاجی اور خوش اخلاقی سے سب کے دلوں میں جگہ بنالی۔ فارس چلا گیا اور کاغذات مکمل ہونے پر عنایہ نے بھی رختِ سفر باندھ لیا...... اب گھر میں ماں، باپ اور وہ نمناک آنکھوں والی سانولی سلونی لڑکی رہ گئی۔

☆☆☆

امی بے حد خوب صورت تھیں اور ابا واجبی شکل صورت کے عام سے مرد...... ہر بچے کی پیدائش پر امی کی دعا ہوتی تھی کہ کوئی بچہ اپنی ددھیال پر نہ جائے اور خدا نے ہمیشہ ان کی سنی...... پہلی بیٹی اور بیٹے کے بعد جب کائنات دنیا میں آئی تو ان کا منہ اتر گیا۔ سانولی سلونی رنگت، نقش ونگار برے نہ تھے لیکن بڑی بہن اور بھائی کے حسن کے آگے ماند پڑ گئے لیکن ابا بہت خوش ہوئے پھر ایک اور بیٹی ہوئی جو بڑی سے بھی زیادہ حسین تھی۔ اماں کو اپنے خاندان کے حسن پر بڑا مان اور غرور تھا۔ یہ سانولی سلونی لڑکی ہر جگہ ان کے لیے احساسِ کمتری کا باعث بن جاتی۔ ماں تھیں محبت تو کرتی تھیں لیکن اس کی کم روئی ان کے دل میں تیر کی طرح چبھتی تھی مگر ابا کو اپنی یہ بیٹی بے حد عزیز تھی اور انہیں اس کی کم مائیگی کا احساس شدت سے تھا۔ اس کے سانولے سلونے چہرے پر اس کی نمناک آنکھوں نے انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ کہیں وہ دوسری بہنوں کے مقابلے میں احساسِ کمتری کا شکار نہ ہو جائے۔ انہوں نے کائنات پر زیادہ توجہ دینی شروع کردی۔ تب ان پر انکشاف ہوا کہ وہ خداداد صلاحیتوں اور زبردست ذہانت سے آراستہ غیر معمولی بچی ہے۔ یوں بھی وہ سب سے مختلف تھی۔ بہنیں اپنی دوستیں گھر بلا کر سارا دن گھر میں ہنگامہ کیے رکھتی تھیں۔ سب موویز دیکھے جاتیں اور وہ اپنے کمرے میں کتابوں میں مدغم رہتی۔ البتہ فارس اس کا بے حد خیال رکھتا۔ اسے اپنی یہ معصوم اور سیدھی سادی بہن بہت پسند تھی جس کی سادگی میں بھی پُرکاری تھی۔ اس کی دونوں بہنوں کی ڈریسنگ ٹیبل میک اپ کے لوازمات سے بھری رہتی جبکہ کائنات کی سنگار میز پر کنگھے اور لوشن کے علاوہ کتابیں ہی دھری رہتیں۔ ان بہنوں پر ہر فیشن ختم تھا۔ ان کی الماری جدید فیشن کے کپڑے سے بھری رہتی جبکہ وہ امی کے لائے ہوئے ہلکے اور سادہ کپڑے بھی بڑے شوق سے پہن لیتی اور مطمئن اور خوش نظر آتی تھی۔ امی کبھی، کبھی گھبرا کر کہتیں۔

''یا اللہ اس لڑکی کا کیا بنے گا، بوڑھی روح ہے لڑکیوں والی کوئی بات ہی نہیں، کیسے رنگ ڈھنگ ہیں پتا نہیں کس پر گئی ہے۔'' تب ابا سمجھانے بیٹھ جاتے۔

''نیک بخت تم دیکھنا میری بیٹی آج نہیں تو کل جس مقام پر پہنچے گی تمہیں فخر محسوس ہوگا اور سب کو اس کی قابلیت نظر آئے گی۔ اس کی صلاحیتوں کا اعتراف ایک زمانہ کرے گا۔''

☆☆☆

ایک دن ابا اس کے کمرے میں آئے تو وہ

کتابیں کھولے اداس بیٹھی نظر آئی۔ وہ باپ کو دیکھ کر دوپٹا سنبھالتے ہوئے گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ابا کوئی کام تھا تو مجھے بلا لیتے۔''

''کیوں بھئی، میں اپنی بیٹی کے کمرے میں نہیں آسکتا کیا......؟'' انہوں نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے پیار سے کہا پھر نرمی سے گویا ہوئے۔

''میں جانتا ہوں میری بیٹی بہت سمجھدار اور ذہین ہے۔ اور اس لیے تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں......'' پھر وہ ذرا رک کے اور بولے۔

''بیٹا...... یہ بات ذہن نشین کرلو کہ چہرے کی خوب صورتی انسان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی، اصل خوب صورتی تو باطن کی ہوتی ہے، آپ کے ذہنی رجحانات ہی آپ کو خوب صورت بناتے ہیں بلکہ حسن کو غذا مہیا کرتے ہیں۔ اپنی آنکھوں کو ہمیشہ کھلا رکھو اور ان میں مسکراہٹ کا رنگ ہو، سوچ مثبت اور مزاج میں شگفتگی ہو تو یہی انسان کی خوب صورتی ہے پھر تم تو ماشاءاللہ ...ذہین ہو تمہارے اندر کی صفات تمہارے چہرے پر نمایاں ہوں گی تو تم اپنے آپ میں ایک نئی زندگی محسوس کروگی۔ امنگیں اور آرزوئیں تمہاری آنکھوں سے جھانکیں گی جو تمہاری صحت اور حسن کو بحال کرنے کا موجب بنیں گی۔ طبعی خوبیاں اور ذہنی صفات اس بات کی دلیل ہیں کہ ایک تم اس دنیا کو مسخر کرلو گی اور لوگ تم پر رشک کریں گے شاید شاعر نے یہ شعر تمہارے لیے ہی کہا ہے بیٹی۔

سیرت نہ ہو تو عارض و رخسار سب غلط
خوشبو اڑی تو پھول فقط رنگ رہ گیا''

ابا کی آواز دیر تک کائنات کے کانوں میں گونجتی رہی اور اس نے خود سے عہد کیا کہ وہ ابا کو کبھی مایوس نہیں کرے گی۔ جب بھی لوگوں کی نگاہیں اسے بے چین کرنے لگتیں ابا کی آواز اسے حوصلہ دیتی۔

''یہ ضروری نہیں کہ ظاہری حسن ہی خوب صورتی کی بنیاد ہو اگر تم نے اپنے اندر خوش طبعی اور مثبت صفات پیدا کرلیں تو اس کا مطلب ہوا تم نے خوب صورتی کا اعلیٰ درجہ حاصل کرلیا۔ تم تنہا نہیں ہو بیٹی، میں تمہارے ساتھ ہوں میں اپنی بیٹی کو بہت مضبوط، توانا اور ان دنیاوی فضول باتوں سے ماورا دیکھنا چاہتا ہوں، ایک دن تم سب سے اپنا لوہا منوالوں گی......''

اور پھر کائنات کی زندگی کا رخ ہی بدل گیا اس نے سر اٹھا کر اعتماد کے ساتھ جینا سیکھ لیا اور ہر امتحان میں امتیازی نمبروں سے پاس ہوتی چلی گئی۔ اس دوران دونوں بہنوں کا رشتہ آیا پڑھنا وہ پہلے ہی چھوڑ چکی تھیں ماں باپ نے رخصتی میں دیر نہیں لگائی۔ وقت آگے بڑھا اب وہ اپنے کالج کی بہترین مقررہ تھی۔

پاکیزہ کی مستقل قاری شگفتہ حیا ترمذی
وادی کاغان کی پھپھو سیدہ ساجدہ عزیز اور
ان کے شوہر سید قاسم گیلانی اپنے ولیمے کے روز

شاعرہ تھی ، بزمِ ادب کی روحِ رواں تھی۔ ہر مباحثہ جیت کر آتی ، اس کے افسانے اور غزلیں اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے تو ابا کا سر فخر سے بلند ہو جاتا۔

سب اس کی ظاہری شکل دیکھتے لیکن اس کے خوب صورت ذہن اور حساس دل کا کوئی قدر دان نہ تھا۔ بڑھتے ہوئے شعور کے ساتھ اسے اس سنگدلی کا احساس شدت سے ہونے لگا تھا کہ لوگ کتنے بے حس اور شقی القلب ہوتے ہیں حتیٰ کہ اس کی ماں تک اس کی شکل دیکھ کر ٹھنڈی، ٹھنڈی آہیں بھرتیں جو اس کے دل پر چھریاں چلا دیتا۔

''ارے سنیے، آپا ایک رشتہ بتا رہی تھیں لڑکا اچھا پڑھا لکھا اور خوش شکل ہے اس کے گھر والوں کو کائنات کی شکل پر بھی کوئی اعتراض نہیں بس وہ چاہتے ہیں کہ کوئی ان کے لڑکے کو اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا بھیج دیے۔ میرا خیال ہے فارس بھی وہیں ہے اس سے مشورہ کر لیتے ہیں۔'' ابا کے چہرے پر دکھ کے سائے پھیل گئے۔

''ہرگز نہیں...... کبھی نہیں...... سوچنا بھی مت ایسے کم ظرف اور لالچی لڑکے کے بارے میں جو اپنے قوتِ بازو کی جگہ لڑکی کے پیسوں سے ترقی کے خواب دیکھے باطنی خوب صورتی کی جگہ ظاہری خوب صورتی کو اہمیت دے ورنہ یہ مطالبہ نہ کرتا......''

''تو پھر بٹھائے رکھنا ساری عمر......'' امی جل کر کہتیں۔

''تم فکر مت کرو، میری بیٹی ہے، دونوں بیٹیوں کا فیصلہ تم نے کیا، اس کا میں کروں گا جو دنیا دیکھے گی...... ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دوں گا جو اسے وہ عزت اور محبت دے جس کی میری بیٹی مستحق ہے۔''

☆☆☆

کالج میں اس کی ایک ہی دوست تھی مومنہ بے حد خوب صورت، معصوم اور سیدھی سادی...... اسے کائنات کی ذہانت بھری شخصیت سے عشق تھا اور وہ اکثر اپنے اکلوتے بھائی شازل کا ذکر کرتی رہتی تھی جو IBA میں پڑھ رہا تھا اور بہترین مقرر اور شاعر تھا۔ پھر دونوں کا داخلہ یونیورسٹی میں ہو گیا۔ دونوں ہی انگلش لٹریچر کی اسٹوڈنٹ تھیں تب کبھی کبھار شازل کا بھی سامنا ہونے لگا۔ بے حد خوش شکل، اسمارٹ اور مہذب...... اس دن جب مومنہ نے بتایا ''آج کل سارا دن شازل بھائی پرانے، پرانے رسالوں میں سے ڈھونڈ، ڈھونڈ کر اس کے افسانے اور شاعری پڑھتے رہتے ہیں حالانکہ ان کی اردو کانونٹ میں پڑھنے اور A لیول کرنے کی وجہ سے بالکل بھی اچھی نہیں لیکن پھر بھی......'' یہ سن کر اس کے رخسار جل اٹھے اور اس نے جلدی سے موضوع بدل دیا۔ جب بھی اس کا شازل سے سامنا ہوتا اسے لگتا اس کی آنکھیں کچھ کہہ رہی ہیں۔

وہ عموماً مومنہ کے گھر اس وقت ہی جاتی تھی جب اسے شازل کی غیر موجودگی کا یقین ہوتا کیونکہ اس کے ذو معنی جملے اور گہری نظریں اس سے ڈسٹرب کرتی تھیں حالانکہ یہ نگاہیں پاکیزہ بھی تھیں اور ان میں کائنات کے لیے احترام کے رنگ بھی تھے۔ اس روز خلافِ توقع شازل گھر میں موجود تھا۔

''زہے نصیب آپ نے ہمارے غریب خانے کو شرفِ باریابی بخشا......'' وہ شوخی سے بولا تب ہی مومنہ اس سے آ کر لپٹ گئی۔

''دیکھا تم نے تمہاری صحبت میں رہ کر شازل بھائی کتنی گاڑھی اردو بولنے لگے ہیں۔''

''ویسے آپ کے افسانے میں نے پڑھے ہیں بہت اچھے عمدہ لیکن کچھ تنقید کروں تو آپ برا تو نہیں مانیں گی۔'' شازل نے پوچھا۔

''بالکل بھی نہیں، تنقید تعمیری ہو تو تحریر میں نکھار آ جاتا ہے......'' وہ جلدی سے بولی۔

''آپ کا اندازِ بیاں، الفاظ کا چناؤ، کردار نگاری بہترین ہوتی ہے لیکن کہیں، کہیں آپ جذباتی ہو کر بہت تلخ ہو جاتی ہیں، حالانکہ تجربے سے گہرائی ضرور لینی چاہیے مگر تلخی نہیں......'' شازل متانت سے بولا۔ ''آپ نے برا تو نہیں مانا......؟'' وہ بے چینی سے گویا ہوا۔

''بالکل بھی نہیں لیکن لکھنے والا گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہو کر ہی لکھتا ہے...... جب معاشرے

میں ہر طرف بے راہ روی، معاشرتی ناہمواری اور... ناانصافی پھیلی ہو تو قلم خود بخود تلخ ہو جاتا ہے ہم اگر سماجی اور غیر سماجی بے ترتیبی سے متاثر ہوتے ہیں تو اس کا اثر تحریر پر بھی تو پڑتا ہے۔ میں بھی اس معاشرے کا ایک حصہ ہوں جب میرا دل دکھتا، جلتا اور کڑھتا ہے تو اپنی بے بسی پر رونا آتا ہے ہی لیکن قلم بھی تلخ ہو جاتا ہے......'' کائنات نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''معاف کیجیے گا...... میں بھول گیا تھا کہ میرا سامنا تو ایک بہترین مقررہ اور افسانہ نگار سے ہے جو لفظوں سے کھیلتی اور جملوں کے موتی پروتی ہے......'' شازل نے ہنس کر کہا تو کائنات کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

☆☆☆

جب دونوں سہیلیاں یونیورسٹی سے فارغ ہوئیں تو شازل امریکا جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ جب کائنات نے سنا تو اس کے دل کو کچھ ہونے لگا انجانے میں وہ شازل کے لیے دل میں ایک نرم گوشہ رکھنے لگی تھی مگر اس نے یہ احساس نہ کبھی شازل کو ہونے دیا نہ مومنہ پر اپنے جذبات ظاہر کیے۔ اس نے دل کے نہاں خانے میں سب کچھ چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ اسے اپنی خودداری اور وقار سب سے زیادہ عزیز تھا۔ چاند کو چھونے کی تمنا دل میں رہے تو بہتر ہے ورنہ لوگوں کی نگاہیں سینہ چھلنی کر دیتی ہیں۔

وہ سردیوں کی ایک ایسی دھندلی اور ملگجی شام تھی، اداس دھوپ عشق پیچاں کی بیلوں پر اتر آئی تھی، وہ لان میں بیٹھی خیالات میں غلطاں تھی جب چوکیدار نے شازل کے آنے کی اطلاع دی۔ امی، ابا کہیں تعزیت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ کائنات کو یقین تھا کہ مومنہ ساتھ ہوگی مگر شازل کو تنہا دیکھ کر وہ پریشان ہوگی۔

''آپ پریشان نہ ہوں، مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا تھی اس لیے مومنہ کو ساتھ نہیں لایا اور مجھے معلوم تھا اس وقت آپ تنہا ہیں......'' کائنات کی حیرانی دیکھ کر وہ جلدی سے بولا۔

''آپ جانتی ہیں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے امریکا جا رہا ہوں، میں لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھوں گا صاف بات کر رہا ہوں کہ میں آپ کو پسند کرتا ہوں اور جس طرح کا لائف پارٹنر میری خواہش ہے وہ صرف، تم ہو کائنات ہاں تم......'' اس نے آپ سے تم پر آنے میں دیر نہیں لگائی پھر کائنات کی آنکھوں میں بے یقینی دیکھتے ہوئے متانت سے بولا۔

''یہ بات بزرگوں کے کرنے کی ہے لیکن ان تک اپنی مرضی پہنچانے سے پہلے میں تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں، مجھے سوچ سمجھ کر جواب دینا، یہ محبت سطحی، چھچھوری یا وقتی نہیں ہے میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے...... مجھے تم جیسی ذہین، باوقار، سمجھدار اور باشعور لائف پارٹنر کی ضرورت ہے تمہارے جواب کے بعد والدین کو لے کر آؤں گا اگر جواب مثبت ہوا تو......'' پھر وہ فوراً ہی پلٹ گیا کائنات کو لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی سنہرا اور خوب صورت خواب دیکھ رہی ہوں۔

زندگی میں ہر طرف خوشیوں کے رنگ بھر گئے تھے۔ زندگی بے حد حسین ہو گئی تھی۔ خزاں کا موسم بھی بہار سا لگ رہا تھا۔ اس کے انگ، انگ میں خوشی اور مسرت کی لہریں دوڑنے لگی تھیں۔

تب اچانک دوسرے دن مومنہ آ گئی۔

''گھر کی گھونس......'' اس نے آتے ہی کائنات کی کھنچائی شروع کر دی۔ ''تم تو جیسے پیروں میں مہندی لگا کر بیٹھی ہو کبھی جو گھر سے نکلو......'' وہ کائنات کے سرخ پڑتے چہرے کی طرف دیکھے بغیر نان اسٹاپ بولے جا رہی تھی جو جذبات کے ہاتھوں سرخ ہو رہا تھا۔

''اچھا سنو، تمہیں تو پتا ہے شازل بھائی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے امریکا جا رہے ہیں اور امی چاہتی ہیں جانے سے پہلے ان کے پیروں میں منگنی یا نکاح کی بیڑیاں ڈال کر بھیجیں تاکہ کوئی گوری میم انہیں اپنے جال میں نہ پھنسا لے اس لیے آج کل امی اپنے چاند سے بیٹے کے لیے حور پری ڈھونڈنے میں لگی ہیں تاکہ چاند سورج کی جوڑی دیکھ کر لوگ رشک کریں مگر شازل بھائی قابو میں نہیں آ رہے، ہر لڑکی ریجیکٹ کر دیتے

ہیں، پتا نہیں کیا چاہتے ہیں۔''

''اُف...... '' کائنات کو لگا چاند کو چھونے کی تمنا میں وہ تھک کر زمین پر آپڑی ہو چکور کی طرح خوابوں کی تعبیر اتنی بھیانک کہ نیند آنکھوں سے روٹھ جائے۔ ابھی تو اس نے خوابوں کا محل پوری طرح سجایا بھی نہیں تھا کہ خرمنِ حیات پر بجلی گر پڑی اور دل کی بستی بسنے سے پہلے ہی اجڑ گئی خواہش حسرت بن گئی بس اب شازل کا سامنا کرنے کی ہمت اس میں نہ تھی اس لیے اس کے فون پر اس نے صاف انکار کر دیا۔

''لیکن کیوں؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''اس کیوں کا جواب میرے پاس یہی ہے کہ میرا اور آپ کا کوئی میل نہیں، کہاں راجا بھوج کہاں گنگو تیلی......''

''آپ نے مجھے گنگو تیلی کہا۔'' وہ شوخی سے بولا۔ ''آپ کی باتوں سے صاف لگ رہا ہے کہ آپ ہرٹ ہوئی ہیں کسی بات سے دیکھیے میرا شکل صورت سے کوئی لینا دینا نہیں...... آپ کا باطن، آپ کی ذہانت اور آپ کی قابلیت میرے لیے معنی رکھتی ہے پلیز انکار مت کرنا۔'' شازل نے التجا کی۔

''سوری، شادی ایک شخص سے نہیں پورے خاندان سے ہوتی ہے اور میں آپ لوگوں کے درمیان آکر احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہونا چاہتی...... میں اپنی تمام خامیوں اور تنہائیوں کے ساتھ بہت خوش ہوں، اس لیے پلیز میرے ارادوں کو متزلزل نہ کریں اور جہاں گھر والے کہتے ہیں وہیں شادی کرلیں۔'' اس نے تلخی سے کہا اور موبائل بند کرکے پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔

☆☆☆

کمیشن کا امتحان پاس کر کے اسے ایک گورنمنٹ کالج میں سترہ گریڈ کی جاب مل گئی اور وہ اپنی زندگی میں مصروف ہوگئی۔ اسی دوران مومنہ کے ابو کا تبادلہ اسلام آباد ہوگیا۔ مصروفیت اس قدر بڑھ گئی کہ مہینوں اس کی مومنہ سے بات نہ ہو پاتی' دونوں بہنیں کبھی، کبھار آجاتی تھیں، لگتا نہیں تھا کہ اپنے گھر میں بہت خوش ہیں۔ ساری زندگی اپنی، اپنی خوب صورتی پر ناز رہا گھرداری یا پڑھنے لکھنے سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا خوب صورتی کی چمک چار دن رہی اب شوہروں کو ان کی بے پروائی، پھوہڑپنا اور بدانتظامی آنکھوں میں کھٹکنے لگی تھی۔ آرام طلبی اور بچوں کی پیدائش کے بعد بے تحاشا بداحتیاطی نے گوشت کا پہاڑ بنا دیا تھا۔ اکثر جب دونوں کے شوہر ساتھ آتے تو کائنات سے مذاق کرتے۔

''بھئی سالی صاحبہ بھینس کالونی دیکھنی ہو تو دور نہ جایا کرو ہمارے گھر آجایا کرو......'' اور دونوں بہنیں خونی نظروں سے اسے گھورنے لگتیں جو آج بھی چاق و چوبند اور اسمارٹ تھی اور صبح تیار ہوکر کالج جانے لگتی تو امی.... بے اختیار پڑھ کر دم کرنے لگتیں۔

وہ بڑے سے گھر میں امی، ابا کے ساتھ اکیلی رہتی تھی۔ ان کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ فارس کا فون آتا تو جیسے گھر میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی۔ کبھی، کبھی کائنات کو حیرت ہوتی تھی گرین کارڈ ملنے کے بعد فارس ایک مرتبہ بھی پاکستان نہیں آیا تھا جبکہ اسے ماں، باپ اور بہن سے والہانہ محبت تھی۔ خاندان والے اس کی محبت اور فرمانبرداری کی مثال دیتے تھے مگر اب تو جیسے اس نے سب کچھ بھلا دیا تھا ماں، باپ بھی کہہ، کہہ کر تھک سے گئے تھے مگر انہیں پوتا، پوتی سے ملنے کی ہڑک ضرور جاگ اٹھتی تھی۔ اس کی عزیز دوست مومنہ بھی جانے کہاں کھوگئی تھی کیا ایسے بھی دوستی نبھائی جاتی ہے۔

اس دن وہ کالج سے کتابیں لینے مارکیٹ چلی گئی تب ہی کوئی پیچھے سے آکر اس کے گلے لگ گیا۔ ''بے وفا، بے مروت لیکچرار بن کر زیادہ ہی اترانے لگی میں تو پرانے گھر گئی تھی مگر پتا چلا تم لوگ ڈیفنس شفٹ ہوگئے۔''

''ہاں ہم تینوں کے لیے گھر سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا اس لیے ڈیفنس میں فلیٹ لے لیا ہے؟'' مومنہ کے اصرار پر وہ اس کے گھر چلی آئی، اس کی امی اسے دیکھتے ہی کھل اٹھیں۔

''کہاں چلی گئی تھیں، مومنہ ہر روز تمہیں یاد کرتی تھی اب تمہارے انکل کی ریٹائرمنٹ کے بعد ہم واپس

کراچی شفٹ ہو گئے ہیں مومنہ کی شادی بھی طے ہو گئی ہے مگر اس نے صاف کہہ دیا تھا جب تک بھائی نہیں آئیں گے اور کائنات نہیں ملے گی وہ شادی نہیں کرے گی۔ شکر ہے تم مل گئیں اور شازل بھی ان شاء اللہ جلد ہی آجائے گا۔'' ان لوگوں کا پیار اور خلوص دیکھ کر اس کا دل بوجھل ہو گیا پھر مومنہ اسے اپنے کمرے میں لے گئی جہاں ان دونوں بہن، بھائیوں کی بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔

''تم جانتی ہو ہم سمجھ رہے تھے بھائی امریکا جا کر کسی گوری کی زلفوں کے اسیر ہو گئے ہوں گے...... مگر انہوں نے صاف کہہ دیا انہیں اماوس کی شام پسند ہے...... چاند کی روشنی آنکھوں میں چبھتی ہے۔ پتا نہیں کہاں اور کس سے دل لگا بیٹھے ہیں، گھنے کہیں کے مجھے بھی نہیں بتاتے......'' مومنہ اپنی رو میں بولے جا رہی تھی اور کائنات کے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہونے لگی تھیں۔

☆☆☆

اب تو بہنوں کے علاوہ ابا بھی اس کی شادی کے لیے فکر مند رہنے لگے تھے اور ماں نے تو جیسے دل پر پتھر کی سل رکھ لی تھی اس کی قابلیت کی ہر طرف دھوم تھی اور اس کے مضامین اردو، انگلش اخبار و جرائد میں چھپتے رہتے۔ اور ماں، باپ کو فخر بھی تھا مگر زیادہ تر رشتے اس کا عہدہ اور قابلیت دیکھ کر آرہے تھے اِدھر جب بھی مومنہ آتی اس کی زبان پر صرف شازل کا تذکرہ ہوتا۔

''پتا ہے کائنات ایک دن میں نے ان کی رائے جاننا چاہی تو اداسی سے بولے۔ ''میں نے تمہارے لیے بڑی پیاری سانولی سلونی بھابی ڈھونڈی تھی...... سچ اگر وہ مان جاتی تو ہمارے گھر میں چاندنی پھیل جاتی۔ میں نے امریکا جیسے شہر میں اس جیسی معصوم بچی اور قابل لڑکی تلاش کی۔ اس کی گہری سیاہ آنکھیں جو اعتماد کی دولت سے مالا مال تھیں مگر افسوس اس جیسا ملکوتی حسن اور سادگی مجھے کہیں نظر نہیں آتی۔ پھر بھی مایوس نہیں، دور بہت دور روشنی کی ایک کرن میرے لیے زادِ راہ ہے۔ میں اپنے رب سے نا امید نہیں بس تم میرے لیے دعا کیا کرو......'' بھلا کائنات تم ہی بتاؤ

سنہری باتیں

☆ وہی لوگ خوب صورت ہوتے ہیں جن سے بات کر کے دل ہلکا اور مطمئن ہو جائے۔

☆ صورتیں کتنی بھی حسین ہوں، سیرتوں کی محتاج ہوتی ہیں۔

☆ حرام کی کمائی اگرچہ شکلیں نہیں بگاڑتی مگر نسلیں بگاڑ دیتی ہے۔

☆ کسی انسان کی نرمی اس کی کمزوری کو ظاہر نہیں کرتی کیونکہ پانی سے نرم کوئی چیز نہیں مگر پانی کی طاقت چٹانوں کو ریزہ، ریزہ کر دیتی ہے۔

☆ انسان ایسا ہو جب دنیا میں ہو لوگ اس سے ملنے کی تمنا کریں اور جب دنیا میں نہ ہو تو اسے اچھے الفاظ میں یاد کریں یہی کامیابی ہے۔

از: فہمیدہ جاوید، ملتان

چٹ پٹے ٹوٹکے

☆ چلتے، چلتے اگر چپل ٹوٹ جائے تو لنگڑانا شروع کر دیں لفٹ ضرور ملے گی۔

☆ آملیٹ سامنے آجائے تو یہ نہ سوچیں کہ مرغی پہلے آئی یا انڈا...... بس کھانا شروع کر دیں۔

☆ چھٹی والے دن بھی یونیفارم پہن لیں اس طرح آپ بہت پڑھا کو نظر آئیں گے۔

از: جینا...... کراچی

شازل بھائی کی اس بات سے میں کیا سمجھوں، پتا نہیں کون بدنصیب لڑکی تھی جس نے میرے اتنے حسین بھائی کو ٹھکرا دیا مل جائے تو دماغ صحیح کر دوں......'' وہ غصے سے بولی تو کائنات کو ہنسی آگئی اور دل کی...... بے قراری حد سے سوا ہو گئی۔

پھر گھر والوں نے اس کے لیے ایک رشتہ پسند کر لیا اس نے سنا تو رو، رو کر ڈھیر کر دیا۔ اماں خفا، بہنیں ناراض لیکن ابا اس کے ساتھ تھے طوفان گزر گیا مگر اس کی دنیا تہ و بالا ہو گئی۔ ''میں کس کے انتظار میں زندگی کے قیمتی سال ضائع کر رہی ہوں جس نے اتنے سالوں میں پلٹ کر نہیں پوچھا۔ کیا محبت ایسی ہوتی ہے؟ زندگی کا راستہ کتنا ناہموار ہے کوئی آس کا جگنو

نہیں...... کوئی امید کی کرن نہیں پھر بھی ایک نا معلوم احساس ہے جس نے مجھے پابند کیا ہوا ہے ایک نادیدہ قید ہے جس میں پابند سلاسل ہوں شاید خوش فہمی یا غلط فہمی کے حصار پر میں نے خود ہی انکار کیا تھا پھر کیوں......؟'' وہ مایوس تھی، دل گرفتہ تھی اس کی زندگی کی ناؤ بیچ منجدھار میں آ کر پھنس گئی تھی، وہ اپنے ماں، باپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے سجدے طویل اور دعائیں لمبی ہوتی گئیں۔

☆☆☆

اور پھر وہ ہو گیا جس کے بارے میں کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ فارس مع فیملی کے آ گیا تھا ہمیشہ کے لیے گھر میں جیسے خوشیوں کی بارات اتر آئی تھی۔ ''آپ نے سوچ بھی کیسے لیا تھا کہ میں آپ لوگوں کو چھوڑ کر اپنی دنیا میں وہاں خوش رہوں گا۔ بس ذرا امریکی شہریت ملنے کا انتظار تھا اور یہ بھی کہ یہاں آ کر اپنا بزنس بھی سیٹ کر لوں تو الحمد للہ ایک دوست کی شراکت میں اس کا بھی آغاز ہو چکا ہے جو میرے ساتھ ہی پاکستان آیا ہے۔'' وہ اماں، ابا کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولا۔

''اور ایک خوش خبری اور آپ کو سنانی ہے۔'' وہ شرارت سے مسکرایا پھر کائنات کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''میں نے اپنی بہن کو گھر سے نکالنے کی تیاری کر لی ہے۔ بات پکی کر کے آیا ہوں...... میں نہیں چاہتا نند بھاوج کے جھگڑے میں میرے والدین بے سکون ہوں......'' کائنات کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں مگر اماں گھبرا کر بولیں۔

''بیٹا یہ کیا کہہ رہے ہو، کیا تم اپنی بہن کو نہیں جانتے کس قدر حساس اور زود رنج ہے۔''

''اپنی بہن کو جانتا ہوں جب ہی تو فیصلہ کیا ہے کہ میری بہن میرا مان نہیں توڑے گی۔ میری بہن ہیرا ہے تو اس کے لیے ایک جوہری ہی پسند کیا ہو گا جس کو ہیرے کی قدر بھی ہو اور پرکھ بھی......'' کائنات کو خود پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا، اپنے کمرے میں آ کر ساری ہمتیں جواب دے گئیں۔

''اگر انجام یہی ہونا تھا تو کیوں میں نے اتنے سال کرب میں گزارے کیوں اس کا انتظار کیا، کیوں اس کو بھول نہ سکی یہ آنسوؤں کی برسات کیوں؟ یہ جذبات میں تلاطم کیسا؟ اب مجھے حالات سے سمجھوتا کرنا پڑے گا۔ نہ میں بھائی کا مان توڑ سکتی ہوں نہ ماں، باپ کا بھرم۔'' فارس تو جیسے مکمل تیاری کے ساتھ آیا تھا دو دن بعد ہی اس نے اعلان کر دیا۔

''کل شام وہ لوگ گھر آ رہے ہیں آپ لوگ تیاری کر لیں......'' کائنات کی دنیا تہ و بالا ہو رہی تھی مگر اس نے خود کو نئی زندگی اپنانے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا باہر چہل پہل کی آوازیں آ رہی تھیں مگر وہ کمرے میں اندھیرا کیے خاموش بیٹھی اپنی ہمت اکٹھی کر رہی تھی ابھی تک بھابی اسے بلانے نہیں آئی تھی پھر ایک سایہ سا اندر داخل ہوا۔

''کائنات تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا تھا کہ ماہ و سال میرے جذبات اور احساسات کو گرد آلود کر دیں گے اور ظاہری خوب صورتی میرے پائے ثبات میں لڑکھڑاہٹ پیدا کر دے گی۔ میں یہاں سے جا کر بھی تمہیں نہیں بھولا...... جو نظریہ میرا پہلے تھا آج بھی وہی ہے کہ حسن انسان کے باطن میں ہوتا ہے اور اب تو میرے علم و مشاہدے میں زیادہ وسعت اور گہرائی پیدا ہو گئی ہے لگن سچی ہو تو کیا نہیں ہو سکتا فارس کو ڈھونڈ لیا اسے راز دار بنا لیا......'' ابھی جملہ ادھورا تھا کہ ایک دم کمرا روشن ہو گیا۔

''بس شازل بھائی بہت ہو گیا آپ کو تقریر کرنے کے لیے نہیں بھیجا تھا، آپ راستہ ناپیں اب میں ذرا اپنی دوست کی خبر لے لوں...... گھنی میسنی مجھ سے بھی پردہ پوشی......'' مومنہ آ کر اس سے لپٹ گئی۔ ساحل سامنے تھا طوفان تھم چکا تھا اسے محسوس ہوا جیسے اس کی کشتی ڈوبتے، ڈوبتے کسی پُرزور اور خطرناک طوفان سے بچ کر ساحل پر پہنچ گئی ہو۔

❀❀❀

ناولٹ

مسیحا

سحر ساجد

وہ ایک آرٹ گیلری تھی جس میں نمائش کے لیے رکھی گئی سب سے پہلی تصویر گرا پنے قد وقامت کے اعتبار سے سب سے جدا تھی تو اپنی تھیم کے لحاظ سے سب سے منفرد...... وہ ایک ہاتھ تھا، ایک بھاری مردانہ ہاتھ جس کے ہاتھ کی چوتھی انگلی زمین پر گری ایک سوکھی شاخ کو چھو رہی تھی اور جہاں سے انگلی اس شاخ کو چھو رہی تھی وہاں سے شاخ ہری ہوتی دکھائی گئی تھی۔ ایسے جیسے یہ ہرا رنگ اس شاخ کے پورے بدن میں پھیل کر اسے گل وگلزار بنادے گا اور تصویر کا عنوان تھا...... ''مسیحا۔'' وہ مصوری کا شاہکار ناٹ فار سیل تھا۔

تھوڑا آگے 25 کے سن کو چھوتی ہوئی ایک لڑکی پیور شیفون کے سیاہ لباس میں ملبوس کھڑی ایک دوسری رپورٹر لڑکی سے محوِ گفتگو نظر آتی تھی۔

''زی اے..... آج کی نمائش کے حوالے سے آپ کیا کہیں گی؟'' مائیک اس لڑکی کے آگے آیا۔

''یہ نمائش میری زندگی کی پہلی نمائش ہے مگر مجھے کہنے دیجیے یہ میری سات سال کی ریاضت ہے......وہ تجربہ ہے جس نے میرے ہر تنِ مو کو اس عمل میں تھکایا اور پھر تھکا کر پکایا ہے۔ یہ رنگ، یہ کینوس نہیں، یہ وہ کشف ہے جو مجھ پر ان سات سالوں میں کھلا'' عمر کے اعتبار سے اس کی آواز کا ٹھہراؤ......قابلِ رشک تھا۔ اس کا انداز، اس کا لہجہ، پختگی کا پتا دیتا تھا۔ وہ باتیں کرتے کرتے پینٹنگ مسیحا کے پاس آکر رک گئی تھیں۔

''آپ کی آج کی اس نمائش میں یہ پینٹنگ not for sale کیوں ہے؟''

''جیسے آپ اپنا بچپن لکڑی کے کسی منقش صندوق میں قید کر کے رکھتے ہیں، ایسے ہی میرا بچپن اس تصویر میں قید ہے۔ میں اسے کیسے کسی کو دے سکتی ہوں کیسے؟ ''مسیحا'' کوئی کیسے فار سیل کر دے...... کیسے؟'' اور اس تصویر کو دیکھتے ہوئے......وہ جیسے کہیں کھوئی تھی۔ دور کہیں بہت دور......سمندر کی لہروں کا شور تھا۔ ساحل کنارے ہوا نمی کی باس لیے چلتی تھی اور وہ نمی سمندر کے کھارے پانی کی نہ تھی......وہ نمک کسی کی آنکھ میں گھلتا تھا۔ سات سال پہلے کہ جب زندگی اس سوکھی شاخ کے مانند ٹوٹ کر زمین پر گری تھی......تو تب ٹھیک تب وہ آیا تھا۔ اس کا مسیحا۔

☆☆☆

''خودکشی کا خیال کیوں آیا......؟'' نفسیات کے ڈاکٹر نے مریض سے سوال کیا۔

''خودکشی کا خیال کیوں آتا ہے؟'' مریض کا جواب الٹا سوال تھا۔

''جب کوئی زندہ نہیں رہنا چاہتا۔'' مریض مسکرایا۔ اس نے ڈاکٹر کو دو جملوں میں چت کیا تھا۔

''جب جواب معلوم ہے تو سوال کیا ہی کیوں؟''

''جواب معلوم ہے سبب نہیں......خودکشی کا خیال کیوں آیا؟'' وہ ڈاکٹر تھا اس نے ثابت کیا۔ مریض کی آنکھوں میں کچھ جلنے لگا تھا۔ غصہ، ہاں اس کی کیفیت کا نام غصہ تھا۔

''مجھے آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دینا......'' مریض ایک دفعہ پھر اپنے خول میں سمٹا۔

''آپ کو میرے کسی سوال کا جواب نہیں دینا مس زینب اسلم بلکہ......'' اور اس نے کلام ادھورا چھوڑ کر کہا......''نیکسٹ پلیز......''

''بلکہ......!'' تجسس نے اسے ادھ موا کیا......وہ تلملائی مگر اس ''بلکہ'' کے بعد کیا تھا......یہ پوچھنا گوارا نہ تھا۔ اس نے پیر پٹخ کر دروازہ ''ٹھاہ'' مار کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''یہ بلکہ'' ہی آپ کو آئندہ مجھ سے ملنے پر مجبور کرے گا۔ مس زینب اسلم، آخر کو میں ڈاکٹر ہوتا ہوں......وہ بھی نفسیات کا۔'' وہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ نے جیسے سمندر کی گہرائی ناپی تھی۔

☆☆☆

زینی کا مسئلہ بھی بڑا عام سا تھا۔ وہی جو امیروں کو لاحق ہوتا ہے۔ ''ڈپریشن'' اکلوتی اولاد......باپ کا بزنس وسیع تو ماں کا سوشل سرکل......بچی پیدا تو ہوگئی اور دینے کے نام پر پیسہ، سہولیات، ایک لگژری لائف سب ہی تھا، نہیں تھا تو وقت نہیں تھا۔ ماں کے پاس نہ باپ کے پاس۔ ملازموں کے ہاتھوں پلتی بچی جب اٹھارہ کے سن کو پہنچی تو اسے امیروں والی شدید بیماری لاحق ہوگئی اور اسی شدید بیماری کے ہاتھوں مجبور ہو کر نیند کی دوا زیادہ مقدار میں کھانے کا اہتمام بھی کر لیا۔ مگر زندگی تھی سو بچ گئی۔ اماں، ابا نے ہائے وائے مچا کر شہر کا سب سے نامور اور ماہر نفسیات کا ڈاکٹر ڈھونڈ اور اب گھر کے بجائے اس کے کلینک پھینک آئے۔ اس کی نینی کی بھی اچھی کلاس ہوئی سو اب صورتِ حال یہ تھی کہ ڈاکٹر تھا اور زینی......ڈاکٹر علاج پر بضد اور زینی کو مرہم سے ضد تو دیکھیے پھر ان میں سب سے پہلے کون ہارتا

ہے...... ڈاکٹر یا زینی......

☆☆☆

''آہا...... مس زینب اسلم آیئے، آیئے......''
ایک پُرجوش سا انداز تھا۔ ''کیسی ہیں آپ......؟''

''ٹھیک ہوں......''

''آج تو آپ کی اپائمنٹ نہیں تھی۔'' اس نے یاد دہانی مناسب سمجھی۔

''نہیں تھی کیا؟'' اس نے بھلکو پن کا اظہار مناسب جانا۔

''تھی تو نہیں......'' وہ خواہ مخواہ ہی مسکرایا۔

''اچھا...... میں بس پھر آجاؤں گی۔'' اور اس نے خواہ مخواہ میں مروت نبھائی۔

''اب آپ نے کلینک کو رونق بخش ہی دی۔ ہے تو جانے کا سوال کیسا؟'' وہ تو جیسے منتظر ہی تھا۔

''اب آپ روک رہے ہیں تو میں ٹھہر جاتی ہوں۔'' اور وہ تو جیسے جانے کو تیار تھی ہی نہیں۔

''آپ نے اس دن کہا تھا ناں کہ مجھے آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دینا بلکہ...... ''بلکہ'' کیا؟''
اُف...... اس کا ماتھا عرق آلود ہوا تھا۔

''اچھا...... میں نے کہا تھا ایسا؟ کب؟'' یک دم ڈاکٹر کو یادداشت کا عارضہ لاحق ہوا تھا۔

اس نے بے بس ہو کر ڈاکٹر کو دیکھا...... اور اس کی بے بسی پر جیسے ترس کھایا گیا۔

''اچھا تو مس زینب اسلم یوں کرتے ہیں ابھی میرا لنچ بریک ہے، آپ بھی میرے ساتھ چلیے...... پھر دیکھتے ہیں کہ میں نے کب اور کیوں یہ بات کہی تھی...... کیا خیال ہے؟'' کہنیاں میز پر ٹکائے ہاتھوں پر ہاتھ رکھے...... متبسم آنکھوں کے ساتھ وہ جواب کا منتظر تھا اور زینی کو چڑ ہوئی۔ ان دو مسکراتی آنکھوں سے اِک لمحے کے لیے اس نے سب بھاڑ میں جھونک دینا چاہا مگر وہ ''بلکہ......''

''چلیں......!'' وہ بادلِ ناخواستہ اٹھتے ہوئے بولی۔

☆☆☆

اچھا لنچ تھا بھئی کہ ایک فوڈ چین سے دو برگر پکڑے...... ایک اس کے ہاتھ میں تھمایا...... ایک خود پکڑا اور آ گئے سی ویو پر...... اور اب ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھے وہ تو بڑی رغبت سے کھا رہا تھا جبکہ اس کے حلق سے نوالا مشکل سے اتر رہا تھا۔ وہ ہر دو سیکنڈز کے بعد ڈاکٹر کا چہرہ تکتی شاید کہ اب وہ بتائے شاید کہ اب اسے یاد آئے کہ اس ''بلکہ'' کے بعد کیا تھا۔ مگر وہاں ڈاکٹر تھا اور اس کا چہیتا برگر...... جسے وہ یوں کھا رہا تھا... جیسے آج سے پہلے زبان کو برگر کا ذائقہ ہی نصیب نہ ہوا ہو۔

''ڈاکٹر!''

''اونہوں...... اچھے بچے کھاتے ہوئے نہیں بولتے۔'' فوراً ٹوک دیا گیا اور وہ برگر ہاتھ میں پکڑے ہاتھ گود میں دھرے منہ اٹھائے بیٹھی رہی۔

وہاں لہروں کے اٹھنے گرنے کا شور تھا۔ ایک لہر اٹھتی...... ساحل تک آتی اور پھر ڈھے جاتی پھر دوسری لہر اٹھتی پھر تیسری...... وہ یہ دیکھنے میں اتنی مگن ہوئی کہ اس ''بلکہ'' کو بھول گئی۔

''سمندر خوب صورت ہے ناں......؟''

''ہوں......'' اور وہ چونک گئی...... مڑ کر ڈاکٹر کو دیکھا۔

''سمندر خوب صورت ہے یا نہیں؟''

''خوب صورتی کیا ہوتی ہے؟ مجھے نہیں معلوم......''

''ہر وہ شے جو آپ کو خود میں ضم کر کے ابدی سکون مہیا کرے...... خوب صورت ہے وہی خوب صورتی رکھتی ہے۔'' اس جواب پر اس نے ڈاکٹر کا چہرہ دیکھا۔

''تو پھر موت بھی خوب صورت ہوئی...... کیا نہیں......؟'' اس کے ہونٹوں پر زہریلا تبسم تھا۔

''نہیں......'' طبیب کے تبسم میں تریاق تھا۔

''کیسے......؟''

''موت خود میں ضم تو کر لیتی ہے مگر سکون کی گارنٹی ہے کیا؟'' اور آپ کے کیس میں تو سکون کی ایک فیصد بھی گارنٹی نہیں......''

''کیوں نہیں بھلا؟''

اور طبیب رک گیا...... اس نے ٹھہر کر مریض کا

چہرہ دیکھا۔

''خودکشی حرام ہے زینب اسلم......''

اور زینب اسلم لاجواب ہوئی......اس نے طبیب کے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر ایک بار پھر سمندر کی خوب صورتی میں غرق ہو جانا چاہا مگر اب کی بار ایسا ہو نہیں سکا۔

''سمندر خوب صورت نہیں رہا تھا۔ اس نے اپنی خوب صورتی کھو دی تھی۔ کیوں؟'' زینی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''یہ اب خوب صورت کیوں نہیں دکھ رہا......؟''

اس نے بچوں کی طرح منہ بسور کر کہا۔

''اچھا سوال ہے مگر اس کا جواب میں آپ کو نیکسٹ سیشن میں دوں گا۔ ابھی آپ کا وقت ختم ہوا۔''

وہ کیسے منٹ میں بدلا تھا۔ زینب نے منہ کھول کر اتنی حیرانی سے اسے دیکھا کہ اس کی آنکھ آنسو ٹپکانا بھی بھول گئی۔

''ایک ذرا سے سوال کا جواب دیتے کتنا وقت برباد ہو جائے گا آپ کا......'' وہ غصے سے چلائی۔

''تو......تو......سیکنڈ......سیکنڈ قیمتی ہے بی بی......اور جس نے وقت کی قدر کی سمجھو اس نے زندگی کا راز پالیا......'' وہ کہتا جا رہا تھا اور ٹیلوں، پتھروں کو پھلانگتا جا رہا تھا۔

''آپ کو اللہ پوچھے گا......'' مٹھیاں بھینچ کر وہ شدتِ غم سے دہاڑی تھی۔

''وہ تو آپ کو پوچھے گا......کیونکہ آپ کو اوپر کا ٹکٹ کٹوانے کی جلدی ہے۔ میرا تو ابھی ایسا کوئی ارادہ ہی نہیں......'' وہ اتنے مزے سے بولا کہ زینی کا جی چاہا اس کا منہ نوچ لے......مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔ ماسوائے چیخنے چلّانے کے، غصہ کرنے کے......سو وہ بکتی جھکتی اس کے پیچھے، پیچھے تھی۔

☆☆☆

اور اس دفعہ ڈاکٹر کا حربہ کامیاب نہیں ہوا تھا۔ زینب اسلم اتنے غصے میں آ گئی تھی کہ نیکسٹ سیشن میں وہ نہیں آئی اور طبیب کا علاج ابھی ہی تو شروع ہوا تھا۔

اس نے زینب کو کال ملائی۔

''ہیلو......'' سوئی سی آواز ابھری۔

''السلام علیکم زینب......کیسی ہیں آپ؟'' دن کے ایک بجے......ایسی فریش اور جوشیلی آواز کس کی تھی۔ زینب نے مندی، مندی آنکھوں سے نمبر پہچاننا چاہا......اور وہ ناکام ہوئی۔

''کون......؟''

''چچ......بری بات ہے السلام علیکم کا جواب وعلیکم السلام ہوتا ہے۔'' افسوس کا اظہار ہوا اور بڑی شدت سے ہوا۔ یہ آواز......یہ لہجہ......یہ انداز......

''خودکشی حرام ہوتی ہے زینب اسلم......'' ٹھاہ کر کے ایک جملہ ذہن میں ٹکرایا اور اس کی آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔

''ڈاکٹر عماد......؟''

''جی ناچیز کا یہ ہی نام ہوا کرتا ہے۔''

''آپ نے کیوں کال کی ہے؟'' وہ بدتمیز ہوئی۔

''آپ کی یاد آ رہی تھی......اس دفعہ کی فیس جو نہیں آئی۔''

''ویسے تو آپ بڑے فلسفے بھگارتے ہیں......اور ہیں آپ اتنے مادہ پرست......''

''مادہ پرست نہیں کمیٹڈ......اور پیسہ کس کی ضرورت نہیں بی بی......دال روٹی کا بھی بندوبست کرنا ہوتا ہے یا نہیں......مگر آپ کو کیا پروا......کیا فکر......آپ جیسے لوگ منہ میں سونے کا نوالہ لے کر چاندی کے بستر پر پیدا ہوتے ہیں۔ مجھ غریب کو دیکھیے مریضوں کو خود کال کر کے کلینک پر بلاتا ہوں تاکہ گھر کا چولھا جل سکے......''

''آپ کو پیسوں کی ضرورت ہے؟'' اور طبیب نے فون کان سے ہٹا کر دیکھا۔ ''اچھا'' تو بچی رحم دل ہے۔

''ہے تو سہی......''

''میں بھجوا دیتی ہوں......کتنے چاہئیں......؟''

''نہ میں کوئی بھک منگا لگتا ہوں کیا؟ محنت سے کماتا ہوں......اپنا کام کیے بغیر ایک دھیلا بھی نہیں لوں......''

اوہ طبیب تو خاصا جذباتی تھا.... مریض نے فون کان سے ہٹا کر دیکھا۔

''تو آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کے پاس آؤں؟''

''اوہو اس میں تو عقل بھی ہے....'' طبیب حیران ہوا۔

''ظاہر ہے، آپ آئیں گی.... پیسہ آئے گا، چولھا جلے گا اور....''

''میں ایک شرط پر آؤں گی۔'' مریض نے بات کاٹی۔

''بنا سنے، بنا جانے منظور....'' طبیب نے جھٹ کہا۔

''کل صبح 11 بجے ٹھیک ہے؟''

''ٹھیک ہے....'' اور مریض نے گہری سانس لے کر سوچا۔

''ہائے بیچارہ غریب ڈاکٹر....''

☆☆☆

''آپ نے کل شرط نہیں پوچھی۔''

''تو آپ پوچھ لیتے ہیں.... بتایئے۔''

''آپ کو پچھلے دونوں سوالوں کے جواب دینے ہیں.... نہ دیے تو میں ابھی کے ابھی اٹھ کر چلی جاؤں گی اور فیس بھی پے نہیں کروں گی۔''

''تو آپ نے کاؤنٹر پر فیس نہیں دی....؟'' طبیب نے سر کھجایا۔

''نہیں....'' مریض کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔

''اچھا.... ٹھیک ہے.... مجھے تو پیسے چاہئیں' پوچھیے کون سے سوال....؟'' طبیب شاید ہار گیا تھا کیا.... وہ دونوں کہنیاں میز کے سرے سے ٹکائے مریض کے سوال کا یوں منتظر تھا جیسے وہ طبیب نہیں مریض تھا۔

''اس ''بلکہ'' کے بعد کیا تھا؟'' اور طبیب کے تبسم نے سمندر کی گہرائی کو مات دی۔

''ارتھ یعنی زمین اور یونیورس کے فرق کا تو معلوم ہوگا آپ کو؟''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں....''

''شش.... اسی طرف آ رہا ہوں تو ارتھ اور یونیورس کا فرق معلوم ہے؟''

''ہے تو....''

''یونیورس میں سب آتا ہے ناں دنیا.... ستارے سیارے گلیکسیز.... بلیک ہولز سب.... ہے ناں؟''

''ہوں....''

''تو اس یونیورس کا.... میں دُہرا رہا ہوں۔ اس پوری کائنات کی سب سے supreme creature کون ہے؟''

''کون ہے....'' وہ الجھی، شانے اچکا کر دُہرایا۔ طبیب نے ذرا سا توقف کیا اور پھر کہا۔

''آپ....''

''میں....؟'' اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''جی آپ.... آپ ہیں اس یونیورس کی supreme creature اور آپ کو لگتا ہے کہ آپ کو میرے جیسے لوگوں کے سوالوں کے جواب دینے کے لیے بھیجا گیا ہے زینب اسلم....! نہیں.... آپ کو تو ان سوالوں کے جواب دینے ہیں جو زندگی آپ کے سامنے اٹھا کر لا رکھے گی۔ خالق نے آپ کو اس لیے بنایا ہے کیا کہ ایک دن زینب اسلم اٹھے اور آ کر عماد یاسر سے پوچھے کہ اس ''بلکہ'' کے بعد کیا تھا؟ خالق کی supreme creature اب کیا یہ کرے گی؟ زینب اسلم میرے سوالوں کے نہیں.... اپنے اندر اٹھنے والے سوالوں کے جواب تلاشیں خود جانیں.... سوچیں کہ خالق نے آپ کو کیوں پیدا کیا....؟ آپ کو لگتا ہے کہ اللہ آپ کو ایویں ہی.... فضول میں ہی اس دنیا میں لے آیا ہے؟ اللہ سے آپ کیا کوئی بے مقصد کام یا بے مقصد تخلیق کی توقع رکھ سکتی ہیں؟ تو آپ یا آپ کا وجود کہ جس کا شمار اس کائنات کی اشرف المخلوقات میں ہوتا ہے وہ بے مقصد ہے.... یا اس کا آنا بے مقصد ہوگا؟ impossible'' لمحے کے توقف کے بعد وہ میز پر ہاتھ مار کر بولا تھا۔

''کیا ہے میرا مقصد....؟'' رندھی آواز.... لبریز آنکھیں۔

''یہ آپ کو خود تلاشنا ہے زینب اسلم...... آپ کو خود جاننا ہے...... میں یا کوئی بھی دوسرا شخص اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کیونکہ یہ آپ کے اندر bult in ہے میرے یا کسی دوسرے شخص کے پاس کیسے ہو سکتا ہے؟'' اور وہ ہنس دی...... تمسخر سے۔

''آپ کہتے ہیں کہ میں بنا مقصد کی تخلیق نہیں...... میرا وجود تو میرے ماں، باپ کو اتنا سا بھی مجبور نہیں کر پایا کہ وہ میرے لیے کچھ وقت نکال سکیں۔'' وہ مسلسل اسے دیکھے جا رہی تھی۔

''آپ کے ماں، باپ کو اللہ نے اولاد کی نعمت سے نوازا...... ایک مقصد عطا کیا اور اگر وہ اس کو پورا نہیں کرتے تو زینب اسلم اس کے لیے وہ accountable ہیں آپ نہیں...... آپ خود کے لیے accountable ہوں گی اور یہ خودکشی وغیرہ کر کے یا قتل کر کے کیا جواب دیں گی وہاں جا کر...... کیا منہ دکھلائیں گی؟ آپ کو لگتا ہے کہ جب اللہ آپ سے پوچھے گا۔ ''من ربکم......'' تو آپ جواب دے لیں گی جبکہ آپ اس کی حد توڑ کر اس دنیا سے گئی ہوں گی۔''

''دینیات مت پڑھائیں مجھے؟''

''میں پڑھا نہیں رہا...... حقیقت بتا رہا ہوں...... کیا آپ اس حقیقت سے انکاری ہیں کہ آپ اللہ کی تخلیق ہیں؟'' اور وہ لاجواب ہوئی...... اپنے ناخن چبانے لگی۔

''ماں چاہیے ہوتی ہے بچے کو ڈاکٹر صاحب...... اس کا پیار ہر درد کی شفا ہوتا ہے...... اس کا لمس ہر زہر کا تریاق ہوتا ہے...... مجھے یہ بھی نہیں ملا......'' اور اس کی لبریز آنکھیں جھلک پڑیں۔

''اچھا...... آپ کو لگتا ہے کہ آپ اس دنیا کی سب سے مظلوم ہستی ہیں، اچھا......'' یہ کہہ کر اس نے بیل بجائی۔

''رشیدہ کو بھیجنا ذرا......'' اس نے پیون کو کہا۔

''جی صاحب......'' تھوڑی دیر بعد رشیدہ حاضر تھی۔ رشیدہ ایک چالیس، بیالیس سال کی سانولے رنگ کی کمزور جسامت کی عورت تھی جس کے سانولے رنگ میں زردیاں گھلی ہوئی تھیں۔

''یہ رشیدہ ہے......'' طبیب نے تعارف کروایا۔

''سلام......'' اس نے ہاتھ ماتھے تک لے جا کر زینی سے کہا۔

''رشیدہ کتنے بچے ہیں تمہارے؟''

''پانچ جی......''

''میاں کیا کرتا ہے تمہارا؟''

''کچھ نہیں سارا دن نشے میں پڑا رہتا ہے۔''

''اس کلینک میں صفائی کرنے کے علاوہ اور کہیں کام کرتی ہو؟''

''جی...... صاب...... صبح ایک گھر کے برتن دھو کر آتی ہوں اور اتوار کے اتوار کپڑے بھی۔''

''اور یہاں سے کتنے بجے فارغ ہوتی ہو؟''

''رات کے نو تو بج ہی جاتے ہیں۔''

''اچھا تو رات کتنے بجے گھر جاتی ہو؟''

''گھر جاتے، جاتے جی کبھی ساڑھے نو ہو جاتے ہیں کبھی دس......''

''پھر......؟''

''پھر کیا جی گھر جا کر صبح کے لیے کھانا بنانا ہوتا ہے اور سو طرح کے کام ہوتے ہیں جی......''

''کتنے بجے سوتی ہو......''

''بارہ ساڑھے بارہ۔''

''اور اٹھتی کب ہو؟''

''چار ساڑھے چار بجے۔''

''بچوں کے لیے وقت کب نکالتی ہو؟''

''کیسا وقت صاحب جی...... ان کے پیٹ میں کچھ چلا جائے، ان کا تن ڈھک جائے۔ بس اسی کوشش میں کب دن ہوتا ہے کب رات...... کچھ پتا ہی نہیں چلتا صاحب جی......''

''اچھا ٹھیک ہے جاؤ......'' اور طبیب نے ایک نظر مریض کو دیکھا...... اور کہا۔

''دوسرا سوال؟'' مریض چند لمحے ہونق ہو کر

طبیب کا چہرہ تکتا رہا۔
تو اسے خود سمجھنا ہوگا...... خود جاننا ہوگا...... منہ میں بھر کر چمچہ نہیں دیا جائے گا اسے کچھ لمحے لگے خود کو سنبھالنے میں۔
''سمندر کی خوب صورتی کیوں کھو گئی تھی؟ وہ دیبا خوب صورت کیوں نہ رہا......؟''
آپ کی دلچسپی کھو گئی تھی، زینب اسلم......'' اور طبیب کے لہجے میں شفا تھی۔
''تو پھر وہ خوب صورت تو نہ ہوا ناں...... ابدی سکون تو میسر نہ کیا ناں اس نے......''
''ہاں...... ہر شخص کے لیے خوب صورتی کی تعریف شخصی اعتبار سے مختلف ہے، آپ کو خود معلوم کرنا ہوگا کہ کون سی شے، کون سی چیز، کون سا کام آپ کے لیے خوب صورت ہے...... کون سا کام آپ کو ابدی سکون مہیا کرسکتا ہے۔''
''اور یہ کیسے ہوگا......؟ کیسے ملے گا؟''
''hit and trial'' اس کی وہ مسکراہٹ...... مریض کو خواہ مخواہ میں چڑ ہوئی۔
''مطلب...... میں کیسے......؟''
''کل مل سکتی ہیں لنچ بریک میں...... ڈیڑھ بجے تک......؟'' اور وہ چپ ہو کر محض اسے دیکھنے لگی۔
''کیوں؟'' کچھ دیر بعد بولی۔
''ملیں گے تو بتاؤں گا...... کل پھر...... ڈن؟''
''اونو......'' اس نے مٹھیاں بھینچ لیں...... منہ سرخ کرلیا اور طبیب دل کھول کر ہنسا تھا۔

☆☆☆

گاڑی ایک ادارے کے سامنے آ کر رکی تھی۔
گاڑی روک کر اس نے ساتھ بیٹھی شخصیت کو دیکھا اور کہا۔
''کوئی سوال نہ ہوگا...... کوئی بات نہیں...... بس آپ خاموشی سے دیکھیں گی اور یہ جانیں گی کہ یہ کام آپ کو خوب صورت لگتا ہے؟ یا سکون دیتا ہے کہ نہیں......''
''او کے......'' اور وہ تیار نظر آتی تھی۔
''چلیں پھر اٹھائیں یہ ڈبے...... میرے ساتھ۔''
وہ مختلف کھانے پینے کی چیزوں کے ڈبے تھے...... جو انہیں بانٹنے تھے اور وہ ایک یتیم خانہ تھا۔
پہلے تو وہ طبیب کے ساتھ بانٹتی رہی مگر پھر بیزار ہو کر وہیں غلام گردش میں بھٹکنے لگی...... یہاں سے وہاں اِدھر سے اُدھر پھر وہ رک گئی۔
وہ ایک پانچ سال کی بچی تھی...... جو ایک درخت کی شاخ کی ہلکی سی لکڑی سے زمین پر کچھ بنا رہی تھی۔
''آپ کیا بنا رہی ہیں؟'' وہ اس کے قریب ہوئی۔
''فلاورز......'' مگن سے انداز میں جواب آیا۔
قریب ہونے پر معلوم ہوا کہ وہاں چھوٹے بڑے بہت سے فلاورز بنے ہوئے تھے۔ وہ چند لمحے اس بچی کو دیکھتی رہی...... اس کے پھولوں کی ورائٹی حیرت انگیز تھی۔
''آپ پینٹ کیوں نہیں کرتی ہو فلاورز کو......؟ یوں گیلی مٹی پر کیوں بنا رہی ہو......؟''
''میرے پاس پینٹ نہیں ہیں......'' اس کے انہماک میں فرق نہیں آیا اور زینی کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ اس نے بچی کا معصوم چہرہ دیکھا...... اس گیلی زمین کو دیکھا...... اس کے میلے ہاتھ کو دیکھا...... اور اس کی آنکھ نم ہوئی۔
''اگر میں آپ کو پینٹ لا دوں تو؟'' اور بچی کا ہاتھ یکلخت رک گیا...... دنیا بھر کی حیرانی...... اس ایک آنکھ میں آن سمٹی تھی۔
''آپ لائیں گی...... آپ لا دیں گی۔'' اشتیاق قابلِ دید تھا۔
''بالکل...... میں لا کر دوں گی...... بلکہ ابھی لا کر دوں گی۔ آپ...... آپ یہیں میرا انتظار کریں......'' وہ اٹھی اور تیزی سے بڑھی اور پھر پلٹی۔
''نام کیا ہے آپ کا......؟''
''صالحہ......!''
''او کے صالحہ...... یہاں سے جانا نہیں...... میں ابھی پینٹ لے کر آتی ہوں......'' اور اس بچی سے زیادہ اشتیاق کا مظاہرہ اس نے کیا۔ وہ بھاگی، بھاگتی آئی تھی۔
''ڈاکٹر......'' اس نے یک دم جا کر عماد کا بازو تھاما۔
''چلیں......'' اس کی آستین کو کسی بچے کی طرح کھینچا۔

''کہاں......؟ کیا ہوا؟'' ڈاکٹر بچوں کے ساتھ بزی تھا۔

''چلیں ناں...... چلیں بھی۔''

''اُفوہ...... کیا...... زینی...... کیا مسئلہ ہے...... زینی؟'' اور زینب اسلم کیسے زینی ہوئی طبیب انجان تھا۔

''مجھے پینٹ لینے ہیں۔''

''کس لیے؟''

''صالحہ کے لیے......'' اور طبیب، صالحہ کون کہتے، کہتے رک گیا۔ اس نے ٹھہر کر زینی کا پُرجوش سرخ چہرہ دیکھا...... ''تو کیا اسے مقصد مل گیا؟ تو کیا اس نے اسے ڈھونڈ لیا......؟'' مگر زینی نے اسے یہ سوچنے نہ دیا اور کھینچ کر گاڑی تک لے گئی...... اور جب وہ پینٹ لے کر واپس آئے تو......

''میں جا رہا ہوں...... آپ کے ڈرائیور کو یہاں بھیج دوں گا...... اوکے......''

''اوکے......'' اور وہاں پروا کسے تھی، زینی پینٹ اور برشز کا شاپر سنبھالے تیزی سے اتری اور اس سیاہ گیٹ کے پیچھے غائب ہوگئی۔

طبیب اسے تکتا رہا۔ اور پھر مسکرا کر گاڑی اسٹارٹ کردی۔

☆☆☆

اور اس دن اس نے صالحہ کو پینٹ نہیں لا کر دیے تھے اپنے لیے اِک راہ کھولی تھی۔ یوٹیوب سے ویڈیوز دیکھ، دیکھ کر صالحہ کو پینٹ سکھاتے، سکھاتے نہ جانے کب، کیسے اس کی دلچسپی بھی اس چیز میں بڑھتی چلی گئی۔ وہ انجان تھی، اب اس کے ہر مشن میں اس کے ساتھ صالحہ کی پینٹنگ ہوتی تھی۔ اور اب ڈاکٹر اس سے سوال نہیں کرتا تھا۔ وہ بات کیا کرتی تھی...... بات بھی کیا باتیں...... صالحہ سے شروع ہو کر صالحہ پر ختم...... اور طبیب نے مسکرا کر اس کا معصوم پُرجوش چہرہ دیکھا۔

''تو کیا وہ لوٹ آئی تھی؟''

''اوہو...... آپ یہ تو دیکھیں......'' مریض نے طبیب کے سامنے ایک کے بعد ایک کاغذ نکال کر رکھنا شروع کیا۔

''یہ بس پھول ہی بناتی ہے کیا؟'' طبیب ایک کے بعد ایک کاغذ دیکھ کر کہتا تھا۔

''ہاں، صالحہ کو پھول بنانے بے حد پسند ہیں۔''

''یہ......'' وہ ایک کاغذ کو دیکھتے، دیکھتے یک دم رکا۔ ''یہ اس نے خود بنایا؟''

''جی مگر یہ آئیڈیا میرا تھا۔''

''تمہارا......؟'' وہ حیران ہوا۔

وہ دو ہاتھ جو ساتھ، ساتھ دعا کی شکل میں جڑے تھے اور ان دو ہاتھوں کی ہتھیلیاں پھولوں سے لدی ہوئی تھیں۔ طبیب نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ مسکرائی۔

''آپ کو معلوم ہے یہ ہاتھ کس کے ہیں؟''

''کس کے ہیں؟'' طبیب انجان بنا۔

''آپ کے......'' اور زمانہ اِک پل کے لیے اپنی گردش بُھولا تھا۔ یا زینی کا دل دھڑکنا۔

''آپ میرے مسیحا ہیں......'' طبیب ایک لمحے کے لیے چپ ہوا۔ اور پھر ہنس دیا۔

''میں تو اپنے تمام مریضوں کا ہی مسیحا ہوں۔''

''نہیں، آپ میرے لیے......''

''تم صالحہ کا کام سامنے کیوں نہیں لائیں؟''

''مطلب......؟'' اور وہ بڑے آرام سے موضوع سے ہٹی تھی۔

''مطلب یہ کہ دنیا کے سامنے لاؤ بھئی اس کا کام...... اتنی ٹیلنٹڈ بچی ہے...... ٹیلنٹ ضائع تھوڑی کرنا ہے۔''

''کیسے لاؤں؟''

''یا خدا زینی......'' طبیب اِک دم ہاتھ چھوڑ کر بیٹھا تھا۔

''آج کے دور میں بھی کوئی پوچھتا ہے کیسے؟ بھئی FB پیج بناؤ ناں......''

''ہا...... او......'' اور وہ دونوں ہاتھ منہ پر رکھے پیچھے کو ہٹی۔ ''میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا؟'' وہ سخت تعجب کا شکار تھی۔

''ذہن ہوتا تو ناں......'' وہ بڑبڑایا۔

''ڈاکٹر......'' وہ چیخی اور پھر وہاں ان دونوں کی ہنسی گونجنے لگی تھی۔

☆☆☆

اور پھر اس نے Saliha,s Art کے نام سے FB پیج بنایا...... جس پر صالحہ اور اس کے کام کی تصاویر تھیں۔ اس کی ویڈیوز...... کچھ زینی کے ساتھ، کچھ زینی کی پینٹ کرتے ہوئے، کچھ کھیلتے ہوئے۔ کرتے کراتے ایک دم اس کا پیج بہت مشہور ہوگیا۔ اس کی ویڈیوز وائرل ہونے لگیں اور یہ تب ہوا جب اس نے اپنی ایک وڈیو اس پیج پر شیئر کی کہ جس میں صالحہ کا تعارف......اور حالات کا بیان تھا۔ وہ یتیم خانے کی عمارت دکھائی گئی تھی اور یہ صالحہ کے لیے آرٹ اسکول میں داخلے کے لیے تھا...... فنڈ ریزنگ تھی...... یہاں پر یہ سوال بنتا ہے کہ زینی تو خود اتنی امیر تھی تو یہ فنڈ ریزنگ کیسی؟

وہ ایسی کہ زینی کے اماں، ابا نے اس فضول سی یتیم بچی کے لیے ایک بھی دھیلا دینے سے انکار کردیا تھا...... تو اسے خود یہ کرنا پڑا......وہ آئی تھی...... ڈاکٹر عماد کے پاس بھی آئی تھی۔

''آیئے، آیئے زینی بی بی...... آپ تو ہمیں بھول ہی گئیں؟'' اس کی ٹینشنز خود بخود کم ہوتی گئیں۔

''آپ کو کیسے بھول سکتی ہوں ڈاکٹر......'' اور وہ اس لہجے، اس انداز پر مسکرایا۔

''بڑی ہوگئی ہیں۔''

''پتا نہیں......''

''خیریت......؟''

اور وہ چپ ہوگئی۔

''مدد چاہیے......'' اتنی سنجیدگی...... طبیب بھی سنجیدہ ہوا۔

''کیسی مدد......؟'' اور وہ ہونٹ چبا کر اسے دیکھنے لگی۔

☆☆☆

اور پھر صالحہ کا داخلہ ایک بہت اچھے آرٹ اسکول میں ہوگیا تھا۔ زندگی کو سمت مل گئی تھی مگر......

عذرا کے جیون ساتھی

جیون میں بہت سے رشتے انسان کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں اور ہر رشتہ اپنی الگ اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور اس سے بچھڑنے کا تصور بھی محال لگتا ہے لیکن میاں بیوی کا ایک دوسرے سے بچھڑنا تو جیسے زندہ درگور کر جاتا ہے۔ عذرا پیاری بہنا یہ صرف آپ کی اور میری ہی نہیں بہت سی بہنوں کی آواز ہے۔

آس کے دیپک قدم قدم پر
سانجھ سویرے جلائے ہیں
آشا ہے بس اتنی سی
کہاں ملوگے جیون ساتھی

جیون بن گیا کالی ریناں
پائے نہ دل کہیں تجھ بن چیناں
بن ترے، ترے چنی روئے
آنسوؤں سے غم دل کے دھوئے
آشا ہے بس اتنی سی، کہاں ملوگے جیون ساتھی

دیکھو تری نیناں ترسیں
بن ترے یہ چھم چھم برسیں
ہر پل روتا چھوڑ گئے ہو
دل برہن کا توڑ گئے ہو
برکھا رُت کی بارش برسے
پیاسا من ترے ملن کو ترسے
آشا ہے بس اتنی سی، کہاں ملوگے جیون ساتھی

یاد کو تیری بھلاؤں کیسے
تڑپوں جل بن مچھلی جیسے
ترے لائے گجرے پھول
جاؤں ساجن کیسے بھول
آشا ہے بس اتنی سی، کہاں ملوگے جیون ساتھی

فرماتا ہے رب رحمان
کل من علیھا فان
دنیا دو دن کی نادان
ہمیشہ رہے گی رب کی شان

اللہ تعالیٰ بھائی معراج رسول صاحب اور تمام مرحومین کی مغفرت فرمائے، آمین۔

مسز خالدہ اعجاز، اوکاڑہ

مقصد؟'' یہ کہیں ابھی دور تھا۔ کہیں چھپا ہوا تھا...... آج پھر اس کا سیشن تھا۔

''کیا میری زندگی کا مقصد صالحہ کی زندگی بنانا تھا ڈاکٹر......؟''

''ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔''

''مطلب......؟''

''مطلب یہ کہ زینی بعض واقعات آپ کی ''زندگی'' کے سپورٹنگ کیریکٹر ہوتے ہیں۔ یہ واقعات طے کرتے ہیں...... یا کہہ لیں......کہ رہنمائی کرتے ہیں کہ آپ کو آخر جانا کہاں ہے۔ جیسے میں اور آپ صالحہ کی زندگی کے سپورٹنگ کیریکٹرز ہیں۔ اس کی زندگی کا مقصد تو نہیں ہو سکتے ناں......''

''ہاں...... میں اور آپ...... آپ......'' وہ گردن پیچھے کو پھینک کر ہنسی۔

''میرے ابا، اماں کو پتا چلے ناں تو......'' وہ پھر سے ہنسی......''

''یہ فیک سیشنز......''

تو ہوا کچھ یوں تھا کہ زینی نے مدد کے نام پر ڈاکٹر سے یہ ہی فیک سیشنز مانگے تھے۔ جو فیس ڈاکٹر کے پاس ان سیشنز کے نام پر آتی تھی۔ وہ صالحہ کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو جایا کرتی تھی...... ہاں وہ بھی کبھی آ جایا کرتی تھی۔ جب کبھی دل گھبرا جاتا...... بیزار ہوتا یا مایوس، وہ آ جاتی تھی۔

''جی فیک سیشنز جس دن پکڑے گئے ناں، لائسنز کینسل کراؤ گی تم میرا۔''

''نہیں ہوتا......'' وہاں بے پروائی سی بے پروائی تھی۔

''ویسے اس سیشن کی فیس لوں گا میں......''

طبیب نے ایک دم ماتھے پر آنکھیں رکھیں......اور زینی کو ہمیشہ یہ فیس لینے والی بات دل پر جا کر چبھتی تھی۔

''تم کالج جوائن کر لو......''

''کیوں......کروں گی کیا کالج جا کر...... کچھ نہیں میرے پڑھنے کو۔''

وہ یوں نظر آئی جیسے دنیا میں اس کے پڑھنے کے واسطے کچھ بچا ہی نہیں۔

''وہ ہی پڑھنا جو صالحہ پڑھتی ہے۔''

''کیا......؟'' وہ جھٹکا کھا کر آگے کو ہوئی...... طبیب کے پاس ہر علاج موجود تھا۔

''آپ کا مطلب ہے...... آرٹس، فائن آرٹس؟''

''ہاں، تم کر سکتی ہو......''

''آپ کو لگتا ہے میرا انٹرسٹ اس میں ہے؟''

''انٹرسٹ تمہارا ہو اور معلوم مجھے ہو...... کمال کرتی ہو بی بی......'' اس کے ساتھ ہی اس نے گھڑی دیکھی اور دیکھ کر کہا۔ ''ٹائم اوور......''

اس نے طبیب کا چہرہ دیکھا...... اور دیکھ کر رہ گئی۔ آج وہ تلملائی نہیں تھی، غصہ نہیں کیا تھا۔ ایک گہری سانس بھر کر...... ایک گھوری ڈال کر وہ اپنا پرس اٹھا کر چلی گئی تھی۔ اور طبیب کرسی سے ٹیک لگا ہاتھوں میں پین گھماتے اسے گہری نگاہ سے جاتا دیکھتا تھا۔ وہ شفایاب ہو رہی تھی۔

☆☆☆

فائن آرٹس جوائن کرنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ تو اس میں اچھی خاصی دلچسپی رکھتی تھی۔ وہ یوں مصروف ہوئی کہ باقی سب بھولنے لگی...... علاوہ ڈاکٹر کے۔ وہ اب بھی اس سے ملتے رہنا چاہتی تھی۔ اور اس ملتے رہنے کی جتنی فیس بھی اسے بھرنی پڑتی وہ بھرتی۔ رنگ، کاغذ اور زینب اسلم...... جب یہ تکون اپنا رنگ جماتی تھی تو دنیا کے باقی رنگ پھیکے پڑنے لگتے تھے۔ اس کے ہاتھ میں جادو تھا، وہ کمال تھا، وہ ہنر تھا جو کہ دیکھنے والی آنکھ کو باندھ دے...... زینب اسلم جب رنگوں کو چھوتی تھی تو رنگ باتیں کیا کرتے، بولنے لگتے، اپنا آپ دیکھنے والی آنکھ پر یوں عیاں کرتے کہ وہ جان جاتا کہ زینب اسلم کو تو رنگوں کا کشف حاصل ہے۔

''فیس جمع کروا دی......'' اور وہ بیٹھتے، بیٹھتے رک سی گئی۔ ایک تیز نظر سے ڈاکٹر کو دیکھا...... وہ عینک ناک پر جمائے محویت سے کچھ لکھتا تھا۔

''ایک سیشن کی فیس نہیں بھی دوں گی تو فاقوں سے مر نہیں جائیں گے آپ۔ اور اتنی تو ''آشنائی'' ہے ناں کہ میں ایسے ہی کبھی ملنے آجایا کروں کہ نہیں؟'' اسے سخت تپ چڑھی۔

''گدھا گھاس سے دوستی کرے تو کھائے گا کیا زینی بی بی۔'' وہ پین پر کور لگاتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''اتنے پروفیشنل نہ بنا کریں......''

''میں اتنا ہی پروفیشنل ہوں...... فیس جمع کروائی؟''

''ڈاکٹر......!'' اسے دکھ ہوا۔ طبیب نے کندھے اچکائے۔

''میں بھر دوں گی......'' اس کی آنکھ خواہ مخواہ نم ہوئی۔

''ہاں، تو اب کہیے؟ کیسے آنا ہوا......؟''

وہ چند لمحے اس چہرے کو دیکھتی رہی۔

''کیوں کرتے ہیں آپ ایسے؟''

اور وہ ایسی مسکراہٹ سے مسکرایا جو کہتی تھی...... میں بتاؤں اب کیا؟

''مجھے آنا ہی نہیں چاہیے تھا......'' وہ تلملا کر اٹھی اور جتنی زور سے دروازہ کھولا اس سے بھی کہیں زور سے بند کر کے اپنی کھولن نکالی تھی۔

اور ڈاکٹر کے لیے یہ نیا نہیں تھا...... بہت سے مریض اس سے یوں ہی اٹیچ ہو جایا کرتے تھے...... یہ فیس تو اُن کی دل شکنی کا اِک بہانہ تھی۔ وہ تو ڈاکٹر تھا...... علاج کرتا تھا، ہر ایک کی زندگی کا حصہ کیسے بن سکتا تھا؟ اور ہر شفایاب ہونے والا اسے اپنی زندگی کا حصہ بنانا چاہتا تھا...... جیسے کہ اب زینب اسلم بھی۔

☆☆☆

رات دو بجے اس کے فون نے ایک دم شور مچایا تھا۔ ایک دفعہ تو وہ شور اسے جگانے میں ناکام رہا مگر متواتر ہوتے شور نے بالآخر اس کی نیند توڑ دی تھی۔ بمشکل، ادھ کھلی آنکھوں سے نام دیکھا تو patient Z بلنک کر رہا تھا (اور زینی اپنا نمبر یوں save ہوا دیکھ لیتی تو غم سے مر ہی جاتی۔) نیند کے غلبے نے اسے سمجھنے نہیں دیا تھا کہ یہ patient Z کون تھا۔

''کون......؟'' نیند نے اس کا خلق بھی بند کر چھوڑا تھا۔

''آپ کو معلوم ہے...... میں نے جان لیا...... میں نے جان لیا ڈاکٹر......!' دوسری طرف زینی کی پُرجوش کھلکھلاتی آواز سنائی دی۔ (زینی اس جوش کے ہاتھوں بصارت سے محروم نہ ہوتی تو ''کون'' کہنے پر برا تو ضرور بناتی......) ڈاکٹر نے خود کو کھینچ کر کراؤن سے ٹیک لگائی، وہ تا حال اس آواز کی مالک شخصیت کو پہچان نہیں پایا تھا۔

''آپ پوچھیں گے نہیں کیا جان لیا......؟''

''کیا جان لیا......؟'' وہ اپنے لیے ٹائم buy کر رہا تھا تا کہ وہ حواس میں آکر جان سکے کہ دوسری طرف کون بات کرتا تھا۔

''یہ ہی کہ آپ اور دوسرے ڈاکٹرز میں کیا فرق ہے؟''

''اوہ...... زینی!'' اِک دم فلیش ہوا اور اسے سمجھ آگئی تھی۔

''آدھی رات کو تم نے مجھے یہ ''فرق'' بتانے کے لیے فون کیا ہے زینی......؟'' وہ ٹھیک ٹھاک بیزار ہوا تھا۔

''سو رہا تھا یارا......''

''سوری مگر......''

''اچھا صبح کلینک آکر بتانا...... اس وقت بہت سخت تھکا ہوا ہوں......''

''آپ فیس لیں گے۔'' شرارت بھرا چہکتا انداز...... ناسمجھی اپنے عروج پر تھی۔

''نہیں لیتا......'' وہ ناک تک بھرا بیٹھا تھا۔ ''بند کر رہا ہوں......''

''آ...... ایک سیکنڈ......''

''کیا ہے؟''

''کس وقت آؤں......؟''

''جب جی چاہے......'' اور ٹھک سے فون بند...... فون کو پھینک کر دو منٹ بھی نہیں لگے تھے عماد یاسر کو سونے میں اور وہاں کسی نے رات آنکھوں میں کاٹی تھی۔

☆☆☆

”رات کو دو بجے یوں منہ اٹھا کر آپ ہر کسی کو ایسے ہی کال کر دیتی ہیں......؟“ وہ اسے دیکھتے ہی بولا۔

”آپ ہر کسی تھوڑی ہیں۔“ وہاں ناز اپنے عروج پر تھا۔

”جی تو کہیئے کیا جان لیا آپ نے؟“

”یہی کہ آپ میں اور دوسرے ڈاکٹرز میں کیا فرق ہے؟“

”اچھا تو کیا فرق ہے؟“

”حلال کر کے کھاتے ہیں آپ...... دوسروں کی طرح پیسہ تو بناتے ہیں مگر اس پیسے کو حلال بنانے کے لیے آپ آخری حد تک جان مارتے ہیں۔ کون ڈاکٹر ہے جو اپنے مریض کو ایک مہنگی فوڈ چین سے لنچ لے کر دیتا ہے نہ صرف یہ بلکہ ساحل پر بھی لے جاتا ہے...... وہ اسے دکھانا چاہتا ہے کہ دنیا کتنی خوب صورت ہے اور یہ کہ اسی کے لیے تو بنائی گئی ہے۔“

”زینی آپ......“

”مجھے کہنے دیں......“ اس نے ٹوک دیا۔

”کتنے ہیں...... ہاں، ڈاکٹر کتنے ہیں جو کہ اپنے مریض کو کسی یتیم خانے لے جا کر یہ دکھاتے ہیں کہ زندگی کس قدر مجبور ہے، انگلیوں پر گنے جانے لائق بھی افراد نہیں جو کسی کی زندگی کو اس کا ”محور“ عطا کر دیتے ہیں...... آپ نے یہ کیا...... آپ نے کیا، آپ نے مجھ سے اپنے پانچ منٹ کے بھی پیسے لیے مگر پھر انہیں حلال کیا ڈاکٹر......! حلال کیا۔ مجھے نئی زندگی اس ڈاکٹر نے عطا نہیں کی تھی...... جس نے میری کٹی پھٹی رگوں کو جوڑا تھا...... یہ آپ نے عطا کی ہے ڈاکٹر...... آپ نے۔“ اس کی آنکھیں نم تھیں...... محبت سے زیادہ عقیدت سے وہ آنکھیں سامنے بیٹھے شخص کو تکتی تھیں۔

ڈاکٹر عماد نے ایک گہری سانس بھر کر اسے دیکھا...... پھر اس نے ایک فائل اٹھائی...... اور زینب کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

”case closed zaini تمہیں اب میری ضرورت نہیں رہی...... تم اس قابل ہو چکی ہو کہ زندگی کو اور اس میں رونما ہونے والی چیزوں کو اپنی عقل کے ساتھ پرکھ سکو...... welcome to life zani۔“ وہ مسکرایا...... اور بھوزینی کی روح فنا ہوئی۔

”کیا مطلب......؟“ اس نے فائل نہیں پکڑی تھی۔

”مطلب کہ تمہیں اب روز، روز میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں...... تم اتنی مضبوط ہو چکی ہو کہ زندگی کو اپنی ٹانگوں کے سہارے چل سکو......“ اور زینی کے حلق میں کچھ پھنسا تھا۔ جسے نگلنا عذاب بنا۔

”ملتے تو رہیں گے ناں......؟“ پتا نہیں کیسی یقین دہانی تھی۔ جو اس نے چاہی تھی۔

”میرے پاس وقت ہی کہاں ہوتا ہے...... تمہیں تو معلوم ہے۔“ وہ صاف انکاری ہوا۔ زینب نے سر جھکا لیا کہ آنسو اب اس کے اختیار میں نہ رہے تھے۔ وہ چند لمحے ہاتھوں کو ملتی رہی یوں کہ جیسے اسے کہنا چاہیے یا نہیں کہنا چاہیے؟

”میں......“ بہتے آنسوؤں کے ساتھ اس نے ایک دم منہ کھول کر سانس لی۔ ”میں...... میں آپ کو...... آپ سے......“

”میں جانتا ہوں......“ اس کا جملہ کہے بنا سمجھا گیا...... اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”اور تم ہی نہیں زینب اسلم...... تم ہی نہیں...... یہاں بیٹھنے والا ہر شفایاب ہونے والا فرد مجھ سے ملتے رہنا چاہتا ہے اور ہر دوسری عورت مجھ سے محبت کی دعویدار ہوتی ہے...... یہ ہیومن سائیکولوجی ہے...... مریض اپنے ”مسیحا“ کے ساتھ ایک رشتے میں بندھ جاتا ہے اور پھر اس کا دماغ اس رشتے کو محبت کا نام دے کر ڈیفائن کرنا چاہتا ہے مگر...... ایسا نہیں ہے زینب ایسا نہیں ہے۔ یہ ہمارے وقتی جذبات وقتی attachments...... ہوتی ہیں۔ اور یہ ایسی شدید ہوتی ہیں کہ ہم انہیں محبت کا نام دے کر انہیں ہمیشگی عطا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ محبت نہیں ہوتی...... اور تم اتنی چھوٹی ہو کہ تمہیں ہر وہ شے محبت لگے گی ہر اس بندے سے محبت ہوگی جو تمہیں ذرا سی بھی توجہ دے گا۔ محبت یہ نہیں ہوتی یہ صرف hallucination ہے زینی...... محض

hallucination یہ جو تمہارے جذبات ہیں ناں یہ کہیں exist نہیں کرتے..... reality میں یہ کہیں بھی وجود نہیں رکھتے تو ان وقتی جذبات سے متاثر ہو کر اپنی زندگی کو ایک نئے نفسیاتی مسئلے میں مت الجھاؤ..... لکھو، پڑھو، رنگ بکھیرو..... کچھ بنو..... پھر چاہے محبت کرو مگر جب محبت کرو تو زینی وہ hallucination نہ ہو..... وہ ایسی ہو کہ بند آنکھوں کے ساتھ بھی دکھائی دے اور بن چھوئے بھی محسوس ہو۔'' وہ بولتا رہا اور اس کے آنسو ایک کے بعد ایک کر کے گرتے رہے..... اور وہ جب چپ ہوا تو زینب اسلم کو لگا کہ آج کے بعد دنیا بھی اتنی ہی خموش ہوئی۔

''کبھی کبھار اچھے دوستوں کی طرح مل بھی نہیں سکتے کیا.....؟'' اس کی آواز نم آلود تھی۔

''نہیں.....''

''کیوں.....؟'' اور وہ پیر پٹخ کر رو دی۔

''ابھی اس وقت..... جب تم میرے سامنے بیٹھ کر آنسو بہا رہی ہو تو زینب اسلم تم اس وقت کسی اور زینی کا حق مار رہی ہو۔ کئی اور زینب اسلم میری منتظر ہیں کہ میں انہیں ایک مہنگے فوڈ چین کا برگر لے کر ساحل سمندر پر لے جاؤں اور دکھاؤں کہ دنیا کتنی خوب صورت ہے..... کئی اور زینب اسلم اپنی کٹی پھٹی رگوں کے ساتھ میری منتظر ہیں تاکہ میں انہیں یتیم خانے میں پلتی زندگی دکھا کر یہ سمجھا سکوں کہ زندگی کس قدر مجبور ہے۔ کئی زینب اسلم ہیں زینی کہ جنہیں ان کی زندگی کا محور عطا کرنا ہے..... تو یہ وقت آج سے..... اب سے ان کی امانت ہے..... تو کیا تم اس میں خیانت کرنا چاہو گی؟''

اور وہ لاجواب ہوئی۔

''آپ، آپ اپنی فیملی کو بھی وقت دیتے ہوں گے ناں اسی وقت میں سے تھوڑا سا۔''

''وہ فیملی ہے زینب اسلم..... تم فیملی نہیں.....''

اور زینب اسلم کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ کہ جسے وہ خود ہی اپنا سب کچھ مان چکی تھی..... وہ کہتا تھا کہ تم فیملی نہیں ہو۔

''آپ میرا دل توڑ رہے ہیں۔''

''نہیں، میں حقیقت بتا رہا ہوں.....''

''کیا ہوا اگر یہ ہی حقیقت مجھے پھر سے اپنی جان لینے پر مجبور کر دے تو.....؟ ذمے دار کون ہوگا.....؟''

''تم خود..... زینب اسلم صرف تم.....''

''وہ کیوں؟''

''کیونکہ کہ تم حلال اور حرام کے فرق کو بہت اچھی طرح سے سمجھ چکی ہو.....'' اور اب کے زینب اسلم کے پیروں تلے سے زمین کھسکی تھی۔ اس کا دل دھک کر کے رہ گیا تھا۔

''case closed زینب اسلم.....'' اور یہ اس کے مسیحا کے آخری الفاظ تھے جو اس نے سنے۔

☆☆☆

اس ''معصوم'' چہرے کے آخری تاثر نے اسے دکھی کیا..... حالانکہ وہ اتنا پروفیشنل تھا کہ اپنا ''دکھی'' ہونا بھی کنٹرول کرنا جانتا تھا مگر پھر بھی اسے افسوس ہوا۔ وہ چاہتا تو اپنے افسوس یا رنج کو بڑے آرام سے دور کر سکتا تھا۔ مگر یہ ''مریض'' کے لیے صحت بخش نہ تھا۔ وہ پھر کبھی اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو پاتا..... ایک پیرا سائٹ (پیرا سائٹ وہ پلانٹ جو دوسرے کے بھروسے پر بڑھتا چلا جاتا ہے) بن کر رہ جاتا..... تو اسے دکھی ہونا منظور مگر یہ کہ اپنی... کئی ماہ کی محنت، پر پانی پھیرنا منظور نہیں تھا۔ تو اس نے زینی کو جانے دیا..... اسی ٹوٹے دل کے ساتھ کہ جس کا مرہم آج سے اور اب سے اسے خود کرنا تھا..... وہ کچھ لمحے کے لیے نیکسٹ پیشنٹ نہیں لے سکا۔ یوں ہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا اور پھر اس نے سیل فون نکالا..... کانٹیکٹ لسٹ میں موجود patientZ کے نمبر کو دیکھتے ہوئے وہ اس پر انگوٹھا پھیرتا رہا..... اور پھر ایک گہری سانس بھر کر اس نے نمبر بلاک کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی case ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے closed ہو گیا تھا۔

☆☆☆

وہ جب کلینک سے نکلی تو سیدھی گھر نہ جا سکی۔ نم آنکھوں کے ساتھ وہ سامنے پھیلی بھاگتی دوڑتی زندگی کو دیکھتی رہی..... یہ ابھی، ذرا سی دیر قبل..... چند ثانیے

بیشتر ایسی تو نہ تھی۔ جیسی اب تھی اور وہ خود کس قدر خوشی سے جوش سے اس کلینک میں داخل ہوئی تھی اور وہ جیسے داخل ہوئی تھی...... اب ویسی تو نہ تھی کہ جیسی ذرا سی دیر پہلے تھی...... چند ثانیے، بیشتر تھی۔

''بی بی جی......؟''

''ہوں......؟'' وہ بری طرح چونکی۔

''گھر چلیں......'' وہ ڈرائیور تھا۔

''نہیں......''

''تو پھر کہاں......؟''

''سمندر کنارے......'' اس نے جملہ پورا نہ ہونے دیا تھا اور سمندر کنارے جا کر اس نے وہی پتھر وہی ٹیلا ڈھونڈنا چاہا کہ جہاں کبھی وہ دونوں بیٹھے تھے۔ مگر ظاہر ہے یہ ممکن نہیں تھا۔

ایک سمندر یہ تھا جو سامنے پھیلا تھا اور ایک سمندر وہ تھا جو وجود میں پھیل کر آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔ مگر وہ روئی نہیں۔

''لمبی، لمبی سانس لو......'' کانوں میں کسی کی آواز گونجی۔ اس نے ہچکیاں بھرتے ہوئے منہ کھول کر سانس لی۔

''ایک اور لمبی سانس لو......'' آواز دوبارہ گونجی۔

اس نے ایک اور لمبی سانس لی۔

''اور اب خود سے کہو......''

"this won,t last forever...

this won,t last forever" اور اس نے کپکپاتے ہوئے کہا اور بار، بار کہا۔

''یہ سب وقتی ہے، گزر جائے گا......'' آواز پھر سے گونجی۔

''یہ سب وقتی ہے...... گزر جائے گا......'' اس نے دُہرایا۔

''اور یہ تکلیف یہ درد...... جب گزر جائے گا تو یوں ہوگا کہ جیسے کبھی تھا ہی نہیں......'' اور وہ آواز رہبر کا سا کام کرتی تھی۔

''اور یہ تکلیف، یہ درد، جب گزر......'' اور زینی جملہ مکمل نہ کر پائی وہ گھٹنوں کے بل گری تھی۔

''ہوسکتا ہے یہ تکلیف...... یہ درد گزر جائے مگر ڈاکٹر...... یہ تو ابھی ہے...... ابھی ہے...... اور بہت شدید ہے......'' اور اس کی آواز پر اپنا اختیار نہ رہا...... وہ لہروں سے بھی اونچی ہونے لگی...... اور سمندر نے ان آنسوؤں کو حیرت سے تکا...... یہ کیسا کھارا پانی تھا جو اس سے زیادہ طاقتور تھا...... وہ آنکھ سے بہتا ذرا سا نمک سمندر میں حل نہ ہوسکا۔ ہوسکتا تھا کہ زینب اسلم دوبارہ اسی پوائنٹ پر جا کھڑی ہوتی کہ جہاں سے چلی تھی مگر یہ کہ اسے ''مسیحا'' کی ماننے کی اتنی عادت ہوچکی تھی۔ وہ اس کی ذات پر اتنا غالب آچکا تھا کہ اس نے مان لیا ...... سمجھ لیا کہ یہ hallucination نہیں تھا۔

''وہ محبت'' کہ جس کا شکار وہ ابھی ہوئی تھی۔ وہ کہیں exit ہی نہیں کرتی تھی۔

اور مریض تو وہ ہی کرتا ہے ناں جو اس کا طبیب اس کے لیے تجویز کرے تو اب طبیب نے نسخے میں لکھ دیا کہ......

''عشق نہیں خلل ہے دماغ کا''

☆☆☆

''hallucination'' زینب اسلم نے ایک عمر اس نام کے سہارے خود کو سنبھالنا چاہا...... خلل ہے دماغ کا کہہ کر موو آن کرنا چاہا...... مگر وہ کر ہی نہیں پائی.... پوری طاقت لگا کر جب بھی وہ اس مدار سے باہر نکلنا چاہتی تو محبت ایک مقناطیس کا روپ دھار لیتی جو اس کے پیروں کو باندھ کر رکھ چھوڑتی...... اسے سانس نہیں آتی تھی...... وہ اندر کہیں سینے کے مقام پر پھنس گئی تھی اور اسے سخت تکلیف پہنچاتی تھی اور ایسے میں جب وہ طبیب کا نمبر ڈائل کرتی تو ایک آدھ بیل کے بعد disconnect ہوجاتی...... وہ پہروں ڈائل کرتی رہتی...... مگر وہاں سے جواب کبھی آنا تھا نہ ہی کبھی آیا...... وہ اس کے کلینک بھی گئی۔

''ڈاکٹر صاحب شہر سے باہر ہیں...... ملک سے باہر ہیں، یہاں نہیں ہیں۔'' ایسے جملے سننے کو ملتے رہے۔ اور اس نے کئی بار، کئی بار...... گاڑی میں بیٹھ کر

گھنٹوں اس کا انتظار کیا کہ کبھی نہ کبھی تو وہ کلینک سے نکلے گا ناں...... تو وہ اسے دیکھ لے گی۔ مگر وہ چہرہ اسے دوبارہ دکھائی نہیں دیا اور جب نہ دکھائی دیا تو وہ ہی ہوا...... یعنی ڈپریشن...... مگر اب کے زینی خود بھی چاہتی تھی ناں تو پھر سے اپنی رگیں کاٹ نہیں پاتی۔ اس کے کمرے کے پردے گرے رہتے۔ وہ پہروں نیند کی دوا کھا کر سوئی رہتی...... اینٹی ڈپریسنٹ استعمال کرتی مگر معلوم نہیں یہ کیسا خلل لاحق ہو گیا تھا جو دفعہ ہوتا تھا نہ رفع......

اور وہ بھی تو ایک ایسا دن تھا جب وہ کسل مندی سے بستر پر کسی ناکارہ شے کے مانند پڑی تھی...... کمرے کے بھاری دبیز پردے اس سے سے کی گھڑی چھپائے ہوئے تھے...... ایسے میں دروازہ ناک ہوا۔

''کون؟''

''بی بی جی...... وہ کوئی ملنے آیا ہے آپ سے۔''

''کون......؟''

اور وہ کون کہتے، کہتے رک گئی۔

''کیا...... ڈاکٹر......!'' وہ کرنٹ کھا کر اٹھی تھی۔

ننگے پیر جب وہ بھاگتی ہوئی آئی تو......

تو ایک ننھا وجود بھاگتا ہوا اس کی ٹانگوں سے آن لپٹا تھا۔

''آپ بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئیں زینی آپی......''

زینب کا دل کٹ کر رہ گیا۔

''نہیں......'' وہ بے اختیار زمین پر اس کے قد کے برابر آبیٹھی۔

''زینی آپی...... اپنی صالحہ کو کیسے چھوڑ سکتی ہے۔''

وہ اس کے ننھے ہاتھ چومتے ہوئے بولی تھی۔

''کیسے چھوڑ سکتی ہے؟'' اسے خود میں بھینچتے ہوئے اس نے جیسے بے یقینی سے خود کلامی کی تھی۔

تو طے یہ تھا کہ زینی اگر اب خود بھی چاہتی ناں تو ڈی ٹریک ہو نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

''آپ روتی کیوں رہتی ہیں زینی آپی......!''

''اس لیے کہ مجھے رونا آتا ہے صالحہ......''

''کیوں رونا آتا ہے؟''

''کوئی یاد آتا ہے۔''

''کیا بہت یاد آتا ہے؟''

''بہت......''

''تو آپ اس سے مل لیں ناں......!''

''وہ نہیں ملتا ناں......''

''تو فون کر لیں......''

''فون بھی نہیں اٹھاتا......''

''پھر تو وہ گندا بچہ ہوا ناں......''

''بہت گندا بچہ ہے......'' وہ روتے، روتے ہنس دی۔

''گندے بچوں کے لیے روتے نہیں زینی آپی......'' اور زینی نے ہونٹ یک دم بھینچ لیے۔

اور جس دن اسے یہ یقین ہوا کہ یہ ہیلوسی نیشن اب عمر بھر اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا تو اس نے ایک کام کیا اس نے اس دکھ...... اس رنج کو یوں بنا لیا جیسے اسی کے جسم کا کوئی حصہ، کوئی عضو ہو۔ وہ جان گئی تھی کہ یہ دماغی خلل اب اس کے دماغ کو یوں ہی خراب رکھے گا تو اس نے اس غم کو سوگ میں بدلنے نہ دیا۔

سوگ...... وہ ہوتا ہے کہ جس میں مبتلا ہو کر انسان کا ذہن اور دل دونوں مل کر بندے کو اس طرح سے ناکارہ بنا دیں کہ آپ پھر زندگی کا دوسرا فعل انجام نہ دے سکیں۔ غم...... یہ آپ کے ساتھ رہتا ہے۔ کسی کانچ کی طرح دل میں چبھتا...... کانٹے کی طرح پیوست رہتا ہے مگر زندگی اپنی ڈگر پر چلتی رہتی ہے۔ تو زینی نے اس دماغی خلل کو ''سوگ'' نہ بنایا کہ یہ حرام ہے۔ اس نے اسے غم کی طرح پال لیا۔ دل کا ایک کونہ اس غم سے آباد رہا...... اور روز رات وہاں درد کا دربار لگتا اور غم اپنا جشن مناتا تھا۔

اور پھر وہ زینب اسلم سے Z.A ہو گئی...... ایک ابھرتی ہوئی مصورہ کہ جس کا نام آرٹ کے قدر دانوں میں معتبر الفاظ میں لیا جانے لگا تھا۔

☆☆☆

اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر...... اس نے دروازے کے ساتھ لگے سوئچ پر ہاتھ مار کر روشنی کا انتظام کیا۔ چابیاں کارنس پر رکھیں...... تھکاوٹ اتنی تھی کہ وہ جہاں بیٹھتا وہیں سو جاتا...... آہ...... مگر اس قدر تھکاوٹ کے باوجود اسے ایک کیس اسٹڈی کرنا تھا۔ اسی واسطے اس نے فریش ہونے کے بعد پہلا کام کافی بنانے کا کیا تھا۔ کافی کے بھاپ اڑاتے مگ کے ساتھ وہ فائل لے کر لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ led آن کرتے ہوئے اس نے فائل کھولی...... ساتھ ہی کافی کا ایک گھونٹ بھرا تھا۔ اس کا دھیان فائل کے بعد کافی پر تھا...... اسکرین پر کیا چل رہا تھا۔ وہ چند آوازوں کے نام پر اس کے کانوں میں تو منتقل ہو رہا تھا مگر ذہن اور بصارت اسے گرفت نہ کرتی تھی...... اس نے کچھ پوائنٹ نوٹ کرنے کے لیے قلم اٹھایا۔

”مسیحا...... کوئی کیسے فار سیل کر دے......“ وہ آواز...... اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا تھا...... اِک لمحے کے لیے وہ اسکرین پر نظر آتے چہرے کو سانس لیے بنا تکتا رہا۔

”زینی...... ز...... ی۔“ اور اس کے لبوں سے ٹوٹتا ہوا وہ نام ادا ہوا۔

”لگتا ہے آپ اپنے بچپن میں کھو گئی ہیں......“ رپورٹر لڑکی کے کہنے پر وہ چونکی۔

”آئی ایم سوری......“ وہ متانت سے بولی۔

”اچھا تو اس پینٹنگ کی تھیم کے بارے میں کچھ بتائیے۔“ وہ اب ایک اور پینٹنگ کے پاس جاتے ہوئے بولی تھی۔

”یہ...... یہ محبت ہے......“

”اور محبت کیا ہے؟“

”محبت......“ زینی رک سی گئی۔

”محبت وہ ہے جو بند آنکھوں کے ساتھ بھی دکھائی دے اور وہ جو بن چھوئے بھی محسوس ہو......“ اور عماد یاسر کے ہاتھ سے قلم چھوٹ کر ٹیبل کی سطح سے ٹکرایا...... اس کے ہاتھ اتنے بے جان ہوئے تھے کہ اس نے کافی کا مگ میز پر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

”زینی آج آئی تھی؟“

”جی سر......“ اور اس نے ایک گہری سانس بھری۔

”یہ لڑکی......“ اس کا دل تاسف سے بھر گیا تھا۔

اس کے زیادہ تر مریض اس سے رابطہ رکھنا چاہتے تھے، ملنا چاہتے تھے...... ان ٹچ رہنا چاہتے تھے مگر یہ زینی...... اپنی ٹائپ کی ایک ہی واقع ہوئی تھی...... کچھ مریض تو پہلے مرحلے پر ہی پیچھے ہٹ جاتے جب وہ نمبر ملاتے اور آگے سے نمبر نہیں ملتا تھا...... کیونکہ ڈاکٹر انہیں بلاک کر چکا ہوتا تھا۔ کچھ دوسرے مرحلے پر پیچھے ہٹتے تھے کہ جب وہ کلینک آتے اور انہیں ملنے نہیں دیا جاتا تھا مگر یہ زینی...... آج بلا مبالغہ آٹھواں روز تھا جب وہ روز کلینک آ کر ڈاکٹر کے بارے میں پوچھتی اور اسے جھنڈی دکھا دی جاتی۔ کبھی کہہ دیا جاتا وہ ملک سے باہر ہیں...... کبھی کسی پینٹنگ یا کانفرنس میں مگر وہ اپنے نام کی ایک ہی تھی اور جب وہ باز نہ آئی تو مجبوراً بڑے دکھ کے ساتھ ڈاکٹر نے گارڈ سے کہلوا دیا کہ اسے اندر نہ آنے دیا جائے...... تو زینی تیسرے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی تو کیا واقعی میں وہ...... اور یہاں پر آ کر تمام تر نفسیات سمجھنے کے باوجود طبیب سمجھ نہ پایا...... اور اس دن جب زینی آئی تو......

”بی بی......! آپ کو اجازت نہیں......“

”جی......!“ زینی کے پیٹ میں گھونسا پڑا۔

”آپ کو اجازت نہیں......“ اور وہ اتنی حیرانی سے گارڈ کا منہ تکتی رہی تھی جیسے وہ کوئی ماورائے عقل بات کہتا تھا۔

”کیا مطلب اجازت نہیں......؟“

”ڈاکٹر صاحب نے آپ کے کلینک میں داخلے پر پابندی لگا دی ہے...... آپ اندر نہیں جا سکتیں......“ اور اب کی بار اس کی آنکھیں مرچوں سے بھری تھیں۔ اس کا منہ کھل گیا...... ناک کے نتھنے پھڑپھڑائے، ہونٹ بھنچ گئے...... اور اس نے مڑ کر اک نگاہ دروازے

کے پار ڈالی۔
''تو وہ اندر تھا......'' ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔
''اپنے صاحب سے کہنا......'' اور آنسو لڑھک کر گال پہ آ گیا۔
''زینی کو بند آنکھوں کے پیچھے کچھ دکھائی دینے لگا ہے اور بن چھوئے کچھ محسوس ہونے لگا ہے۔'' اور اپنے آنسو بے دردی سے صاف کرتے ہوئے وہ پلٹ گئی۔ اندر سی سی ٹی وی کیمرے سے اسے دیکھتے ہوئے عماد نے اِک گہری سانس بھری تھی۔
''آئی ایم سوری زینی...... سوری...... مگر یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔'' وہ دکھ سے بڑبڑایا...... وہ بہت آگے آ گئی تھی...... بہت آگے اب اس کی حوصلہ شکنی ضروری تھی۔ تھک کر اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی...... چند لمحے یوں ہی گزرے تو اس نے بیل بجائی۔
''گارڈ کو بلوایئے گا......'' اندر آنے والے ملازم سے کہہ کر وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ایک ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے...... وہ باہر پھیلی دنیا کو تکتا تھا۔
''جی سر......!'' وہ مڑا۔
''زینی نے کچھ کہا......؟''
''جی سر......''
''کیا......؟'' وہ مضطرب ہوا۔
''پتا نہیں جی...... بڑی عجیب سی بات تھی کہہ رہی تھیں کہ صاحب سے کہنا بند آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے...... چھوئے بنا کچھ ایسا ہی تھا۔''

☆☆☆

وہ ایک دعوتی کارڈ تھا۔ زینی نے اچنبھے سے اسے کھولا تو Emmad Yasir weds with Noreen Mughal زینی کے کان یک دم سائیں، سائیں کرنے لگے۔ اس کا سر چکرایا۔ کارڈ اس کے ہاتھوں سے نیچے گرا...... وہ دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر دُہری ہوئی تھی۔ عماد نے تکلیف سے آنکھیں بند کیں...... اس کو نفسیاتی طور پر ہرانے کے لیے یہ ضروری

تھا۔ یہ ضروری ہو گیا تھا۔
''آئی ایم سوری زینی......'' وہ رنج سے بڑبڑایا۔
''میں تمہیں بھلا نہیں پاؤں گا...... یقیناً میں تمہیں بھلا نہیں پاؤں گا۔'' ڈاکٹر عماد نے اس کی واپس جاتی ہوئی کار کر دیکھ کر کہا تھا۔ اور وہ آخری دن تھا کہ جس دن ''مسیحا'' نے زینی کو دیکھا تھا۔

☆☆☆

ہاں......! وہ اسے بھلا نہیں پایا تھا۔ وہ آج تک بھلا نہیں پایا تھا۔ وہ آج تک زینی کی استقامت پر حیران تھا...... وہ اگر اسے وہ دعوتی کارڈ نہ بھیجتا تو اسے یقین تھا کہ زینی آج بھی کلینک کے باہر اس کا انتظار کر رہی ہوتی۔ زینی...... وہ یاد تھی کہ جسے ''عجیب'' کا درجہ دے کر اس نے دل کے ایک کونے میں عجائب گھر کی مورتی کی طرح آج بھی سجا رکھا تھا۔ ہر دفعہ عماد کی آنکھ اس یاد کی مورتی کو بڑی حیرت سے تکا کرتی تھی...... اچھا تو سات سال پہلے ایسا بھی کوئی پاگل گزرا تھا کہ جس نے اس کا پیچھا لے لیا تھا...... سات سال پہلے کسی کی سیاہ کار روزانہ بلاناغہ اس کی کلینک کے باہر آ کھڑی ہوتی تھی...... اوہ...... تو ایسا عجیب زمانہ بھی کوئی گزرا تھا...... وہ روز رات اس عجائب گھر کو آباد کرتا اور اس کی آنکھ کی پتلی روز رات اتنی اور اسی حیرت کے ساتھ سکڑتی تھی کہ جتنی پہلے دن سکڑی تھی اور یہ اس طرح سے ہوا کہ وہ آنکھیں بند کر کے زینی کا اِک اِک نقش پہچان سکتا تھا اور بن چھوئے اس کی موجودگی کا بتا سکتا تھا۔ مگر نفسیات کا ڈاکٹر تھا ناں...... تو محبت کو اتنی آسانی سے کیسے مان سکتا تھا سو اس نے ''محبت'' کو بھی ''حیرانی'' کا نام دے کر...... ایک مورتی بنا کر اسی عجائب گھر میں سجا رکھا تھا کہ جہاں زینی کی ''یاد'' بسیرا کرتی تھی۔ اس لڑکی کے رویّے نے اسے حیران کیا تھا...... یہ توجیہہ تھی ڈاکٹر صاحب کی زینی کی یاد کے لیے...... آہ...... طبیب آہ......!

☆☆☆

''کوئی صاحب ہیں نام تو نہیں بتایا مگر وہ آپ کی مسیحا میں انٹرسٹڈ ہیں۔''
صالحہ کے کہنے پر اس نے یوں صالحہ کو دیکھا جیسے صالحہ جانتی نہ تھی۔
''میں نے ان سے کہا تھا کہ ناٹ فار سیل ہے مگر وہ بضد تھے۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔
''کون صاحب تھے۔''
''نام نہیں بتایا...... مگر کہا ہے کہ آپ سے پوچھ لوں اِک بار......''
''نہیں...... مسیحا فار سیل نہیں ہے...... صاف جواب دے دو......'' اور اس کا لہجہ دوٹوک تھا۔
صالحہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

انیکسی کے ایک کمرے کو زینی نے اسٹوڈیو میں تبدیل کر رکھا تھا۔ وہ اب خود کمانے کے قابل ہو چکی تھی۔ سو صالحہ کا گھر وہ انیکسی تھا۔ صالحہ کا کیا، وہ دونوں ہی اکثر و بیشتر وہیں پائی جاتی تھیں...... صالحہ کا پیج آج بھی اسی طرح چلتا تھا۔ کئی لوگ اسے لائک کر چکے تھے۔ زندگی کو اپنے زورِ بازو پر زینی نے رواں کر لیا تھا۔ صالحہ کے بارے میں زینی کے ماں، باپ کے کچھ تحفظات تھے اور یہی تحفظات زینی کے ان سے اختلافات کا بھی باعث بھی بنتے تھے لیکن پھر بھی وہ کوشش کرتی تھی کہ کوئی ناگوار واقعہ نہ ہی ہو تو اچھا ہے۔ ابھی اس وقت بھی وہ ایک پینٹنگ پر کام کر رہی تھی صالحہ پاس بیٹھی اپنی اسکیچ بک کا کام کر رہی تھی۔
''بی بی جی......!''
''کیا بات ہے گل نواز......'' مصروف سی آواز میں اس نے مڑے بنا کہا۔
''کوئی صاحب آئے ہیں کہتے ہیں کہ آپ کی وہ پینٹنگ خریدنی ہے جو آپ کو بیچنی نہیں ہے۔''
یہ بات سن کر وہ فوری مڑی۔ صالحہ نے بھی چونک کر سر اٹھایا۔ ان دونوں نے حیرت سے اِک دوسرے کو دیکھا۔
''میرے خیال میں مسیحا کی بات کر رہے ہیں۔''

''ہاں......مگر......'' وہ الجھی۔

''جا کر کہہ دو کہ مسیحا فار سیل نہیں ہے۔'' پھر سر جھٹک کر دوبارہ وہ ایزل کی طرف متوجہ ہوئی تھی......گل نواز وہیں سے واپس ہولیا۔ صالحہ بھی دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ کوئی پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ......

''بی بی جی......''

''افوہ......کہہ دیا ناں مسیحا فار سیل نہیں......'' اس نے مڑے بنا غصے سے کہا۔

''مسیحا خود لینے آ جائے کیا تب بھی نہیں......؟''

رگوں میں دوڑتا خون منجمد ہوا تھا یا بدن میں چلتی سانس تھمی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی برش اس کے ہاتھ سے گرا، پینٹ کے چھینٹے اڑے......کچھ پیروں پر گرے کچھ زمین پر......اور اس نے دھیرے سے آنکھیں بند کیں۔ یوں جیسے کچھ بھی نہیں دیکھنا چاہتی ہو......اسے نہیں مڑنا تھا، اسے نہیں دیکھنا تھا......اِک عمر کی ریاضت تھی کہ جس کے بعد وہ اس مقام تک پہنچی تھی کہ ''مسیحا'' کو پینٹ کر سکے اور اب اگر مسیحا خود ہی......اس کے ہاتھوں، پیروں نے بدن کا ساتھ چھوڑنا چاہا تھا مگر وہ سات سال پہلے کی زینی تھی کیا؟

اِک گہری سانس بھر کر اپنی پوری قوت لگا کر وہ مڑی اور وہ سامنے تھا......سات سال بعد وہ سامنے تھا......ویسا ہی فریش، اسمارٹ، ویسی ہی ہونٹوں پر کھیلتی ہلکی سی متبسم سی مسکراہٹ......زینی کے دل ہاتھ کو پڑا......تو کیا ان سات سالوں میں اس نے زینی کو اتنا بھی یاد نہیں کیا کہ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ہی مدھم ہو جاتی......وہ اتنا سا تو زینی کو یاد کر ہی لیتا......مگر آہ......یہ تو زینی کا روگ تھا۔

''مسیحا فار سیل نہیں......!'' وہ بولی تو آواز میں کیا، کیا نہیں تھا۔ غم، غصہ، تکلیف، رنج......

''مسیحا خود بھی لینے آ جائے تو تب بھی نہیں کیا؟''

''کوئی اپنی مسیحائی بھی خریدتا ہے کیا؟'' لہجہ تڑخا ہوا تھا۔

آ......یہ کیا کہہ دیا تھا اس نے......اس کے ہونٹوں کی مبہم سی مسکراہٹ ایک دم ماند پڑی......وہ سنجیدہ نظر آیا۔ اس ایک پل میں اس نے اپنی ساری نفسیات کی ڈگریوں کو چھان کر......ذہن کی ساری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ایک عدد جواب دینا چاہا......مگر وہ ناکام رہا۔

''بڑی ہوگئی ہو......'' مدھم مگر گہری مسکراہٹ لوٹ آئی۔

''اب بھی نہ ہوتی کیا؟'' ترنت جواب آیا......اور وہ ہنس دیا......ذرا سا آگے کو آیا......زینی سے چند قدم کے فاصلے پر......اس کی آنکھوں میں جھانکنا چاہا تو وہ نظر پھیر گئی۔

''تمہیں یوں ''بڑا'' دیکھنے کے لیے ہی وہ سب ضروری تھا......ورنہ تم آج بھی وہی سولہ سال کی زینی ہوتیں......ٹوٹ کر......بکھر کر جڑنا اور جڑ کر اپنے پیروں پر کھڑے ہو جانا......یہ فن یوں ہی تو نہیں جاتا ناں......''

زینی کی آنکھوں میں اک دم مرچیں بھر گئیں۔

''اگر تم مناسب سمجھو تو کبھی میرے ساتھ میرے گھر آؤ میں......''

''آپ کے گھر آ کر کیا کروں گی میں......؟ اپنے بچوں سے ملواتا ہے......کیا......!'' وہ یوں جل کر بولی کہ عماد کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

''بچوں سے ملاقات تو تب ہو سکے گی اگر تم ہاں کرو گی تو......!''

''میں ہاں کروں گی تو؟'' وہ حد درجہ حیران ہوئی۔

''ہاں ناں......تم ہاں کرو گی......شادی ہوگی......تبھی تو بچے ہوں گے۔''

اسے سمجھنے میں اِک پل لگا......اور جب سمجھا تو......اب اس کا منہ سرخ ہوا۔

''گل نواز......گل نواز......'' وہ چیخی۔

''صاحب کو باہر کا رستہ دکھا دو......''

''آپ کی بچوں سے ملاقات کا انتظار رہے گا......'' وہ جاتے، جاتے کہہ گیا......اور زینی۔

''اُف......'' وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر

صوفے پر گری تھی۔

☆☆☆

اور پھر تو جیسے اِک سلسلہ شروع ہو گیا تھا روز اس کے پاس اِک سلپ آتی...... مسیحا کے لیے...... وہ...... سلپ پکڑتی...... دیکھتی...... سات سال کی اذیت کو یاد کرتی اور پھر ڈسٹ بن میں پھینک دیتی۔ عجب یہ تھا کہ وہ منع نہیں کرتی تھی...... چاہنے کے باوجود کوئی شے اسے روک دیتی تھی اور اکسائی تھی کہ وہ کاغذ کا ایک ٹکڑا اس کے ہاتھوں تک ضرور پہنچے...... اور وہ جیسے ان سارے سالوں کا حساب بے باک کر دینا چاہتی تھی۔

''ایسا کب تک چلے گا زینی آپا......'' وہ صالحہ تھی۔

''جب تک دل کو قرار نہیں آ جاتا......'' یہ زینی تھی۔

''کیا دل کا قرار روزانہ اس سلپ کو ڈسٹ بن میں پھینکنے میں ہے؟'' اور زینی نے حیرت سے صالحہ کو دیکھا...... وہ کب بڑی ہوئی؟ ''سات سال آپ نے کاٹے...... کیا اگلے سات سال آپ پچھلے سات سالوں کا حساب لیتی رہیں گی؟ آپ کو لگتا ہے کہ یہ معاملہ اتنا لمبا جائے گا؟''

''کیا کہنا چاہتی ہو......؟'' وہ تڑخی۔

''اِک ہاں کہہ دینے میں آپ کی انا کتنے سال کھائے گی؟'' اور زینی اِک دم چپ ہوئی...... خاموش بالکل خاموش......

☆☆☆

آپ نفسیات کے ڈاکٹر ہوتے ہیں یا نفسیاتی ڈاکٹر ہیں......'' اُف اتنی غصے بھری آواز...... عماد نے فون کان سے ہٹا کر دیکھا۔

''مطلب......؟''

''مطلب...... روز سلپ پر لکھ بھیجتے ہیں مسیحا سیل کرو گی اور وہ انا کی چیمپئن روز اسے مروڑ تروڑ کر ڈسٹ بن میں پھینک دیتی ہے...... یہ نہیں لکھ کر بھیج سکتے کہ مجھ سے شادی کرو گی......'' آخر میں آکر صالحہ دل کھول کر غصے سے چیخی اور پھر فون بند۔

''اوہ...... یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا؟'' وہ ابھی تک حیران تھا۔

☆☆☆

اسٹوڈیو میں داخل ہوتے ہی روز کی طرح آج بھی اس نے پہلا کام ٹیبل پر سے وہ کاغذ کا ٹکڑا اٹھانے کا کیا...... اسے کھولا...... نظروں نے روز کی طرح ایک ہی سطر پڑھی پر دماغ نے ہاتھوں کو روز کی طرح وہ ہی پیغام بھیجنا چاہا کہ پھینک دو...... مگر...... وہ جھٹکا کھا کر رکی...... دماغ نے یہ سارے کام ایک دم منسوخ کیے تھے۔

''مجھ سے شادی کرو گی......؟'' وہ آنکھیں پھاڑ کر اس جملے کو دیکھ رہی تھی۔

''لکھ کر بھیج دیں نہیں......'' صالحہ کی بات پر اس نے جھٹ سے مڑ کر صالحہ کو دیکھا...... وہ سوالیہ نشان بنی ہوئی تھی۔

''اور کیا لکھیں گی؟ کیا ہاں؟'' صالحہ نے بھی اپنی کہہ کر چھوڑی...... اس نے نظریں پھیر لیں۔

نہیں کہتی تو بھی پھنستی...... ہاں کرتی تو بھی...... سو اس کے دماغ نے اِک نئی راہ بھائی...... وہ مسکرائی یوں جیسے بادلوں بھرے آسمان سے سورج کی کرن نے جھانکا ہو......

''ایسے سوالوں کا جواب مشرقی لڑکیاں نہیں ان کے ماں اور باپ دیتے ہیں۔''

اس نے کاغذ پر لکھا...... لکھ کر تہ کیا اور تہ کر کے گل نواز کو پکڑا دیا...... اور پکڑا کر وہ یوں ہو گئی جیسے روئی کا گالا...... وہ زمین پر کب تھی۔ اس نے کھڑکی کھولی...... روشن چمکتے آسمان کو دیکھ کر ایک آسودہ سانس بھری اور خود کلامی کے انداز میں بولی۔

''ڈاکٹر ٹھیک ہی کہتا ہے...... یہ سات سال میرے لیے ضروری تھے؟'' جب ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے تو وہ اپنی مقررہ ساعت سے پہلے کیسے اور کیونکر وقوع پزیر ہو جاتا۔''

صالحہ نے اس کے چہرے پر دھنک رنگ اترتے دیکھے تھے۔

❁❁❁
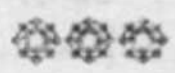
اب رہائی ملے گی تو

ہما علی

جانے سے پہلے میں نے ایک نظر سارے گھر پر ڈالی۔ سامنے والے کمرے میں میری تینوں بیٹیاں اور بیٹا اپنی ماں کے احساسات سے بے خبر سو رہے تھے، مجھے چاروں پر بے ساختہ پیار آنے لگا۔ دل چاہا انہیں بھی جگا کر اپنے ساتھ لے جاؤں مگر پھر خیال آیا کہ انہیں ظالم زمانے کے بے درد ہاتھوں اور بھوکی نظروں سے کہاں چھپا کے رکھوں گی۔ یہی سوچ کر دل پر پتھر رکھ لیا اور اُن کے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ دوسرا کمرا

جہاں میری ساس اور نند سو رہی تھیں پہلے ہی بند تھا۔ آگے کچن اور اسی کے ساتھ میرا کمرا جہاں میرا مجازی خدا اپنی تمام تر مکاریوں اور جھوٹ کے ساتھ بے ہنگم طریقے سے منہ کھولے سو رہا تھا۔ میں اندر نہیں گئی کمرے کے باہر ہی اس کے خراٹے اس کی گہری نیند کی گواہی دے رہے تھے۔

میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ باہر کے دروازے کی کنڈی کھولی اور ایک قدم باہر رکھا۔ ایک بھیگا، بھیگا جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا یوں لگا جیسے نیم جاں بدن میں جان پڑ گئی ہو۔ کیسا فرحت بخش احساس تھا یہ یا پھر اپنی آزادی کی خوشی میں ایسا محسوس ہوا تھا۔ میں لان عبور کر کے گیٹ سے باہر آ گئی۔ ہلکی، ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں کوئی چھتری نہیں تھی مگر مجھے بھیگنے کا احساس بھی نہیں ہو رہا تھا۔ بس چلی چلے جا رہی تھی اپنی منزل سے بے خبر۔

آج میں نے ان سب کو چھوڑ دیا۔ اس گھر کو چھوڑ دیا جہاں بھی بیاہ کر آئی تھی۔ اس گھر کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا جہاں میرے حصے میں صرف فرائض آئے کسی حقوق کی میں مستحق نہ ہو سکی۔

اس دفعہ گھر سے نکلتے ہوئے میں نے اپنے کسی پیارے سے کوئی مشورہ نہیں لیا ورنہ ہمیشہ کی طرح اس جہنم میں رہنے پر مجبور کر دی جاتی۔ ارے معاف کیجیے گا میں کیا بے ربط باتیں کیے جا رہی ہوں۔ میں شروع سے آپ کو اپنی کہانی سناتی ہوں ذرا ٹھہریے، یہ آگے ایک واکنگ ٹریک ہے وہاں بینچ بھی پڑے ہیں میں ذرا ستانے کو وہاں بیٹھ جاؤں پھر اپنی رام کہانی سناؤں گی۔ کہانی بھی کون سی نئی ہے کیا وہی پرانی گھسی پٹی روایتی ساس نندوں والی......؟ جی نہیں یہ تو قصہ ہی کچھ اور ہے۔ ایک ایسی عورت کا قصہ جس کے کہنے کو تو بہت گھر ہوتے ہیں، اس کے باپ کا گھر، بھائی کا گھر، بیٹے کا گھر اور سب سے بڑھ کر شوہر کا گھر...... جہاں یہ کہہ کر رخصت کر دی جاتی ہے کہ اب یہی تمہارا گھر ہے۔ یہ پتا نہیں ہوتا کہ اکثر وہ اسی گھر کے گیٹ پر کھڑے ہونے کو مجبور کر دی جاتی ہے۔ جب غصہ آیا، شوہر نامدار سے حکم مل گیا۔ نکل جاؤ میرے گھر سے...... وہی بات ہے ناں۔ رہنے کو گھر نہیں، ہے سارا جہاں ہمارا، اس دنیا میں صرف مردوں کے گھر ہوتے ہیں وہ چاہیں تو عورت کو گھر میں رکھیں نہ چاہیں تو ہاتھ پکڑ کر یا دھکا دے کر نکال باہر کریں۔ ارے دیکھا میں پھر بھٹک گئی سنانے جا رہی تھی اپنی کہانی اور کیا قصہ لے بیٹھی۔

مگر پہلے میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں، مجھے بتائیں میاں بیوی کے رشتے میں کیا چیزیں اہم ہوتی ہیں؟ آپ یہی کہیں گے ناں کہ بھئی دونوں میں محبت ہونی چاہیے، ایک دوسرے پر اعتماد ہونا چاہیے اور سب سے بڑھ کر ایک دوسرے کی دل سے عزت کرنی چاہیے، ہے ناں یہی کہیں گے ناں آپ...... میں بھی یہی سمجھتی تھی بلکہ اب بھی اس پر قائم ہوں مگر جب اعتماد، محبت اور عزت ایک، ایک کر کے رخصت ہو جائیں تو پھر اس رشتے میں کیا رہ جاتا ہے؟ ایک کھوکھلا پن، سمجھوتا یا پھر بھی، کبھی یہ لنگڑا لولا رشتہ اتنا بوجھ لگنے لگتا ہے کہ دل خود یہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا کی پروا کیے بغیر اس بوجھ سے چھٹکارا پا لیا جائے لیکن یہ بھی کہاں ممکن ہوتا ہے۔ بچوں کی شکل میں کتنی زنجیریں آپ کے پاؤں جکڑ لیتی ہیں۔

بارش کچھ، کچھ تیز ہوتی جا رہی ہے میرا ململ کا دوپٹا کافی نم ہو گیا ہے، میں ذرا دوسرے بینچ پر جاتی ہوں جو گھنے درخت کے سائے تلے ہے پھر باقی کی کہانی سناتی ہوں...... آتے جاتے لوگ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک اکیلی عورت اس وقت بارش میں کیوں بیٹھی ہے؟ جو جس کا دل چاہے سوچے، مجھے کون کی کسی کی پروا ہے۔

چلو یہاں بیٹھتی ہوں یہ درخت کافی گھنا ہے بس جلدی، جلدی سنا دوں ساری کہانی۔ کہیں بارش زیادہ تیز نہ ہو جائے اور مجھے ابھی اپنے لیے ٹھکانا بھی تو ڈھونڈنا ہے۔

آپ کو پتا ہے میرے اعصاب اتنے مضبوط تھے کہ میں خود کو unbreakable کہتی تھی، یہ نہیں

جانتی تھی کہ unbreakable چیزیں یا تو ٹوٹتی ہی نہیں اور اگر ٹوٹ جائیں تو کرچی، کرچی ہوجاتی ہیں پھر کسی کے سمیٹے نہیں سمٹتی ...... معاف کیجیے گا میرا دماغ اب ایسا ہی ہوگیا ہے کیا بات کر رہی تھی اور کہاں پہنچ گئی۔

خیر میں ایک شوہر گزیدہ عورت ہوں جو اندھے اعتماد میں ماری گئی۔ میں نے جتنی محبت اپنے شوہر سے کی شاید اتنی تو اپنے بچوں سے بھی نہیں کی۔ اس کے اچھے برے حالات میں بھرپور ساتھ دیا۔ نہ بے جا روپے پیسے کا تقاضا کیا، نہ کپڑوں، زیورات کی فرمائش کی بس ہمت بندھاتی رہی، برے حالات میں انہیں تسلی دیتی رہی۔

''تم فکر نہیں کرو میں جاب کرتی ہوں، میں اپنا اور بچوں کا خرچہ اٹھالوں گی۔'' بس پھر کیا تھا وہ تو ایسے ہی بے فکر ہوئے کہ پلٹ کر کبھی پوچھا ہی نہیں کہ تمہاری یا بچوں کی ضروریات کیا ہیں؟

بیوی، بچوں سے بے فکر ہوئے تو آنکھیں رنگین سپنے دکھانے لگیں۔ ایک گھٹیا کردار کی لڑکی ان کی زندگی میں آگئی۔ مجھے تو بڑی دیر میں پتا چلا کہ میرا شوہر کتنا بڑا اداکار ہے سو اُن کا عشق چلتا رہا۔ بڑی کامیابی کے ساتھ۔ میں صبح بچوں کو اسکول کے لیے تیار کر کے دوپہر کا کھانا بنا کر خود جاب پر چلی جاتی۔ کبھی بھولے سے بھی یہ خیال نہ آیا کہ میرا شوہر بے فکر ہوکر گلچھرے اڑا رہا ہے۔ خیال آتا بھی کیسے...... صبح نوکری، شام کو گھر کی ڈیوٹی شروع ہوجاتی۔

مجھے ابھی یاد نہیں آرہا کہ ہمارا پہلا جھگڑا کس بات پر ہوا تھا...... ارے ہاں یاد آگیا۔ اس کا رویہ بچوں کے ساتھ بہت بدل گیا تھا، نہ وہ دیکھتا کہ معصوم بچی ہے نہ دیکھتا کہ چھوٹا سا بیٹا ہے جب غصے میں آتا تو ان پر ہاتھ اٹھاتا، میں بیچ میں آجاتی تو بس پھر سارا نزلہ مجھ پر گرتا۔ تمام قسم کے طعنے کہ میں نے بچوں کو بدتمیز بنا دیا۔ بگاڑ کے رکھ دیا، میری اولاد کو میرے خلاف کر دیا...... نوکری کر رہی ہو تو مجھ پر کون سا احساس کر رہی ہو سب عورتیں

روشن چراغ کے مانند

بہت ہی مشہور کہاوت ہے کہ ''ایسے بنو کہ جب زندہ ہو تو لوگ ملنے کی تمنا کریں اور جب دنیا سے چلے جاؤ تو لوگ اچھے الفاظ میں یاد کریں یہی کامیابی ہے۔'' معراج رسول بھائی اس بات پر پورا اترتے تھے۔ جب وہ حیات تھے لوگ ملنے کی تمنا کرتے تھے اور اب ہم سب ان کو اچھے الفاظ میں یاد کر رہے ہیں تو یقیناً وہ جہاں بھی ہوں گے خوش ہوں گے کیونکہ وہ ایسے اچھے کام دنیا میں کر کے گئے کہ وہ کام ان کے لیے صدقۂ جاریہ ہیں۔ معراج بھائی روشن چراغ کے مانند تھے۔ خود تو روشن تھے یعنی بے پناہ دینی و دنیاوی علوم رکھتے تھے اور اپنے اس علم کو اَن گنت لوگوں تک پہنچایا۔ جاسوسی، سسپنس، سرگزشت اور پاکیزہ کی بنیاد رکھ کر لوگوں کے علمی و قلمی ذوق کو برقرار رکھا۔ بہت سے رائٹرز کو ظاہر کر کے اس مقام تک پہنچایا جس کے وہ حق دار تھے اور ابھی تک ہم ان کی علمی اور ادارتی کاوشوں سے (جو رسالوں کی صورت میں ہیں) فائدہ اٹھا رہے ہیں جو بھی کوئی اچھا کام کرتا ہے ان رسالوں سے پڑھ کر اور جو انسان کو مثبت و اصلاحی سوچ، تعمیری کردار و شخصیت کی تیاری اور دنیا و آخرت میں فائدے کی باتیں ملتی ہیں اور انسان عمل کر کے فائدہ اٹھاتا ہے اس سب کا ثواب معراج بھائی کو ملتا رہے گا اور لوگ روشن چراغ سے روشنی حاصل کرتے رہیں گے۔ پاکیزہ اپنے نام کی طرح ''پاکیزہ'' ہے اور اس میں ایسا مواد ہے جو ہمارے دل و دماغ کو پاکیزہ کرتا ہے یہ ایسے ہی خدا کے فضل و کرم سے پاکیزگی بکھیرتا رہے گا۔ اللہ معراج بھائی کی مغفرت فرمائے، ان کے ادارے کو ترقی دے اور ان کے اہلِ خانہ کو دائمی خوشیاں عطا کرے، آمین۔

از: فہمیدہ جاوید، ملتان

آہ......!

آپی عذرا رسول کے جیون ساتھی کو دنیا سے رخصت ہوئے دو سال ہو چکے ہیں۔ آپی ہر پل انہیں یاد کر کے افسردہ ہوجاتی ہوں گی۔ ان کا یہ رشتہ ہی ایسا تھا جو بھلایا نہیں جاسکتا۔ ہم تمام پاکیزہ بہنوں کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت میں جگہ دے اور آپ سب لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

پروین افضل شاہین، بہاول نگر

کرتی ہیں، وغیرہ، وغیرہ۔

آہستہ آہستہ ایک انجانی، ان دیکھی دیوار ہمارے بیچ حائل ہوتی گئی۔ ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور ہو گئے۔ بس یوں لگتا تھا کہ ہم لائف پارٹنر نہیں صرف "bed partner" ہیں۔

مجھے سخت کوفت ہوتی جب وہ میرے قریب ہونے کی کوشش کرتا جانے مجھے کیوں ایسا لگتا یہ مجھے نہیں ''اسے'' میری جگہ تصور کر رہا ہے۔ بس یہ سوچ آتے ہی میں خود کو اس سے دور کر لیتی وہ کبھی حیرانی اور کبھی غصے کا اظہار کرتا۔

میں نے اس کی بہت خوشامد کی بہت منایا کہ وہ اسے چھوڑ دے، اپنی پیار بھری جنت میں واپس آجائے۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے سب کچھ پتا چل چکا ہے۔ اس نے مجھے یقین بھی دلایا کہ وہ تو اب اس سے ملتا ہی نہیں پر وہ مسلسل مجھ سے جھوٹ بولتا رہا اور میں بیوقوف اس کی باتوں پر اعتبار کرتی رہی۔ میں نے بتایا ناں کہ وہ کتنی اچھی اداکاری کرتا تھا۔

غلط تھے وعدے مگر میں یقین رکھتا تھا
وہ شخص لہجہ بڑا دل نشین رکھتا تھا

اِک روز جاب سے واپسی پر میں ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی تھی کہ سگنل پر اپنی گاڑی رکتی ہوئی دیکھی سوچا چلو اچھا ہوا آرام سے گھر چلی جاؤں گی، یہ سوچ کر آگے بڑھی ہی تھی کہ ایک دم سناٹے میں آگئی۔ گاڑی میں میرا شوہر اکیلا نہیں تھا۔ وہ بھی اس کے ساتھ بیٹھی جانے کس بات پر ہنس رہی تھی۔ میرے شوہر نے مجھے نہیں دیکھا، یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ شدید غم کے احساس نے جیسے میرے دل کو مٹھی میں دبوچ لیا۔ مجھے خبر بھی نہ ہوئی کب میرے آنسو نکلے اور میرا چہرہ بھگو گئے میں تو جب چونکی جب ایک ٹیکسی والے نے قریب ٹیکسی روک کر پوچھا۔

''باجی آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ کہیں جانا ہے بتائیں۔'' گھر آکر میں بے جان اپنے بستر پر گر گئی کیسا کھانا؟ اور کہاں کی بھوک بس آنسو تھے اور میں تھی۔ دل چاہتا تھا کہ چیخ، چیخ کر روؤں مگر یہ بھی میرے بس میں نہیں تھا۔

شام گزر گئی، رات کا کھانا بھی سب کھا چکے، بچوں نے پوچھا ابو کہاں ہیں؟ آج اتنی دیر ہو گئی، میری ساس بھی پوچھ رہی تھیں۔ مگر میں ان سب کو کیا بتاتی کہ وہ کہاں ہے؟ رفتہ، رفتہ جھگڑے بڑھنے لگے، ہر چھوٹی بات بڑی لڑائی کا سبب بن جاتی۔ بچے گم صم رہنے لگے۔ ایک خوف جیسے اُن کے چہروں پر جم سا گیا تھا کہ جانے کب ماں، باپ میں جنگ چھڑ جائے۔ وہ اپنے باپ کا سامنا کرنے سے کترانے لگے تھے۔ باتیں کرتے، کرتے اُن کے لہجے میں تلخی سی گھلنے لگی۔

میں اپنے بچوں کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں، وہ منہ سے تو کچھ نہیں کہتے مگر ان کی خاموشیاں بہت کچھ کہہ دیتی ہیں۔ میرا بیٹا ہے تو ابھی بہت چھوٹا مگر بہت حساس ہے، میری کوشش ہوتی ہے کہ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاروں، باتیں کروں اُن کے اندر کا خوف دور کروں...... اکثر ان کی ایک ہی فرمائش ہوتی۔ ''ابو آپ سے اتنا لڑتے ہیں تو آپ ان کا گھر چھوڑ کیوں نہیں دیتیں، ہمیں اب یہاں نہیں رہنا۔ امی آپ نے ابو سے کیوں شادی کی؟ آپ ابو کو چھوڑ دیں۔'' وہ اپنی ماں کی مجبوریوں سے ناواقف تھے کہ ایک بے بس ماں انہیں کہاں لے کر جاتی، آج میں نے ان کی فرمائش پوری کر دی خود تو گھر چھوڑ دیا ساتھ ہی انہیں بھی چھوڑ آئی۔

بچوں کا خیال آتے ہی میری آنکھیں بھی موسم کا ساتھ دینے لگیں۔ ان آنسوؤں پر میرا اختیار نہیں، بھیگے دوپٹے سے بھیگی آنکھیں صاف کرنے لگی مگر وہاں تو آنسو درد کے تمام بند توڑ کر نکلے تھے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ اولاد کا رشتہ ہی ایسا ہے، چاروں بچوں کے چہرے آنکھوں میں گھومنے لگے۔ میرا دل کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے لگا۔

''ہائے میرا بیٹا اٹھے گا تو مجھے پکارے گا۔ وہ تو سیدھا بھاگتا ہوا میرے کمرے میں آتا ہے، مجھے نہ

پا کر بہت روئے گا، اس کی پسند کا ناشتا کون دے گا؟ میری بچیاں تو میرے بغیر نہیں رہ سکتیں، کیسے گھٹ، گھٹ کے روئیں گی' وہ تو کسی کے سامنے روتی بھی نہیں ہیں۔ نہیں، نہیں میں اپنے بچوں پر کوئی ظلم نہیں کروں گی' میں ہر ستم سہہ لوں گی مگر اپنی قسمت کی اماوس رات کا اندھیرا اپنے بچوں پر نہیں پڑنے دوں گی، انہیں..... کسی کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑوں گی، انہیں میری ضرورت ہے۔'' یہی سوچتے، سوچتے بے دھیانی میں ایدھی ہوم کے گیٹ کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ اندر جاؤں یا پلٹ جاؤں، ایک کشمکش دل و دماغ میں شروع ہوگئی۔

ممتا کے پُرجوش تیز بہاؤ میں میری تمام پریشانی، دکھ، درد، تکالیف، کمزور تنکے کی طرح بہنے لگے۔ سخت ندامت و پشیمانی اور ایک احساسِ جرم نے میرے سارے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

''میں کیسے اتنی خود غرض ہوگئی اپنے اوپر ہونے والے ظلم و زیادتی کا بدلہ میں اپنے جگر گوشوں، اپنے معصوموں سے لے رہی ہوں۔ نہیں، نہیں میں سب کو چھوڑ سکتی ہوں مگر اپنے بچوں کو کبھی نہیں، مجھے واپس جانا ہوگا۔''

میرے سارے دعوے، دوبارہ اس گھر میں نہ لوٹنے کے فیصلے ریت کی دیوار کی طرح میرے قدموں میں ڈھیر ہونے لگے۔ سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ محبت کمزور کر رہی ہے یا مضبوط بس پھر یوں لگا جیسے میرے پیروں میں پہیے لگ گئے۔ کچھ اندازہ ہی نہیں ہوا کہ فاصلے کیسے سمٹتے چلے گئے۔ بس قدم تھے کہ تیز سے تیز تر اٹھتے چلے جارہے تھے۔

ایک دھن سی سوار ہوگئی تھی کہ بس جلدی سے گھر پہنچ جاؤں..... بارش اب بالکل رک چکی تھی۔ فضا میں حبس اور گھٹن بڑھ گئی تھی۔ میں چلی جارہی تھی، سانس سینے میں سما ہی نہیں رہی تھی۔ بس تھوڑی دور اور چلنا تھا، حلق بالکل خشک ہورہا تھا۔ میں بار، بار تھوک نگلتی خود کو ہمت دے رہی تھی، کہیں بھی رک کر دم لینے کو تیار نہ تھی دل ہی دل میں بچوں سے مخاطب ہوتی۔

''میں آرہی ہوں میری جان' میں آرہی ہوں۔''

سورج اب پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوچکا تھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میری زندگی کے اندھیرے کہیں پیچھے رہ گئے ہیں اور روشنی بکھر گئی ہے میری راہوں میں......

میں نے ماتھے پر آنے والے پسینے کو پونچھا۔ سامنے مجھے گھر کا گیٹ نظر آرہا تھا۔ میں نے ایک سکون بھری سانس لی۔ ایسے لگا جیسے کسی لمبی مسافت کے بعد کوئی مسافر گھر کو آتا ہے، میں گھر کے گیٹ پر کھڑی تھی۔

شکر ہے ابھی تک کوئی بھی نہیں اٹھا تھا، جس آہستگی سے گئی تھی ویسے ہی چپکے سے دوبارہ گھر میں داخل ہوگئی۔

آپ بھی کہتے ہوں گے کہانی تو بڑے زور و شور سے شروع کی تھی۔ جب واپس ہی آنا تھا تو اتنے بلند و بالا دعوے کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں، ہوں تو میں ایک عورت ہی ناں......اور سمجھوتے تو صرف عورت کی قسمت میں ہی آئے ہیں لہٰذا میں بھی سمجھوتا کرنے پر مجبور ہوں، چاہے وہ کسی کی بھی خاطر کیا جائے۔ ایک راز کی بات بتاؤں جو گھٹن اور حبس مجھے باہر لگ رہا تھا وہ گھر میں قدم رکھتے ہی ختم ہوگیا۔ حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ وقت، حالات اور ماحول کسی بھی جگہ بدل سکتے ہیں۔ عورت کا اصل مقام اس کا گھر ہی ہے، آپ لوگ مجھے اس طرح مت دیکھیں، میں نے بتایا تو تھا شروع میں کہ میرا دماغ بس ایسا ہی ہوگیا ہے، بات کوئی کرنی ہوتی ہے اور شروع کچھ کر دیتی ہوں، معاف کیجیے گا میں نے آپ لوگوں کا اتنا ٹائم لیا۔ گھر پہنچتے ہی سب سے پہلے میں نے بچوں کے کمرے کا ''nob'' بڑی آہستگی سے گھما کر دروازہ کھولا۔ میرے دل کے ٹکڑے گہری نیند کی وادیوں میں پُرسکون نیند سو رہے تھے، یہ دیکھ کر اپنے اللہ کا شکر ادا کیا اور کمرا دوبارہ بند کر کے کچن کا رخ کیا۔

اب فیصلہ آپ سب پر چھوڑتی ہوں بتائیے کیا میں نے برا کیا؟

مکمل ناول

مٹی کا آبِ خورہ

طیبہ عنصر مغل

"محبت بھی رزق کی طرح ہوتی ہے وقت سے پہلے اور قسمت سے زیادہ کبھی نہیں ملتی اور جو اسے وقت اور قسمت کے حوالے نہیں کرتے، وہ اسے ضائع کر دیتے ہیں۔" بی بی جان نے چاندی کے پاندان کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے رسانیت سے سمجھایا۔

"تو بی بی جان اس تقسیم کا کیا کروں جو میرے وجود پر ہر پل ضرب در ضرب لگائے جا رہی ہے۔" زیتون بانو نے آنسو بھری آنکھوں سے بی بی جان کو شکوہ بھرے انداز سے دیکھا۔

"ہونہہ......! نہیں سمجھی ناں میری بات ورنہ یہ سوال ہرگز نہ کرتی۔" ایک ٹھنڈی شفقت بھری نظر بی بی جان نے زیتون بانو پر ڈالی تو اس نے کچھ بولے بغیر استفہامیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

"میں نے کہا ناں محبت بھی رزق کی طرح ہوتی ہے تو کیا رزق تقسیم ہونے سے گھٹتا ہے زیتون بانو...... رزق تو تقسیم ہونے سے بڑھتا ہے۔ ضرب در ضرب لگتا ہے لیکن در حقیقت ضرب در ضرب بڑھ رہا ہوتا ہے میری بیٹی دل کو سمجھاؤ...... یہ اللہ کا فیصلہ ہے، مرد کے لیے گنجائش اسی کی پیدا کردہ ہے تو اس کے فیصلوں کی حکمت کو بھی جان لو...... مان لو دل سے...... زندگی آسان ہو جائے گی اگر توکل کرو گی۔ میں بھی اس پل صراط سے گزری تھی، میری ساس مرحومہ بھی۔ مرد کے دل میں بہت سے خانے ہوتے ہیں۔ آزاد پرندہ ہوتا ہے، پابند کرو گی تو گناہ گار فرجان آغا ہوں گے تو جسے دار تم

بھی بن جاؤ گی۔"

"مانتی ہوں بی بی جان لیکن یہ دل نہیں مانتا......
میں فرحان آغا کا بٹوارا کیسے کرلوں...... وہ صرف میرا ہے میری ذات کا آدھا شریک...... کیسے سہہ لوں کہ وہ کسی اور کا بھی ہوگا۔" وہ جیسے بولی نہیں کراہی تھی۔ درد کا بیکراں سمندر اس کے اندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ تو سوچ کے لرز جاتی تھی۔ وہ جو فرحان آغا کی چہیتی بیوی تھی۔ بچپن کی منگیتر، پیدا ہوتے ہی فرحان کے نام لکھ دی گئی تھی۔ سالوں سال اس کے سپنوں کے جگنو مٹھی میں دبائے سولہ سال کی بالی عمر میں اس کی زندگی میں بڑی دھوم دھام سے داخل ہوئی تھی۔ نواب فرحان آغا کی اولین چاہت اس کے دل و جان کی سلطنت کی ملکہ بن کے پانچ سال سے نہیں پچھلے پندرہ سالوں سے راج کررہی تھی۔ اس کے ولی عہد اکلوتے چشم و چراغ کی ماں بھی تھی۔ عثمان جواب دس سال کا تھا۔ گھر بھر کی آنکھ کا تارا تھا۔ کہاں کمی رہ گئی تھی حسین و جمیل زیتون بانو کی شخصیت میں کہ فرحان آغا کو دوسری شادی کی چاہ نے اکسایا تھا اور وہ زیتون بانو سے اجازت کے طلبگار بنے کھڑے تھے۔ فرحان آغا، زیتون بانو کے دل کی مہک اس کے سگے خالہ زاد جو بے دریغ محبت کے خزانے زیتون بانو پر لٹاتے تھے، ان کو تو محبت کے لیے پہلے ہی وقت کم لگا کرتا تھا۔ اب کہاں سے وقت کا اضافہ ہوگیا کہ وہ ایک اور عورت کو بھی اس میں شریک کرنے جارہے تھے۔

وہ جو اپنی ذات میں اپنے مکمل روپ کا خوشنما آئینہ لیے ہر پل مسرور رہتی تھی اپنے سنگار سے جگمگاتے عکس کو فرحان آغا کی آنکھوں کے آئینوں پر اترتے خمار پر مسرور رہتی تھی۔ کبھی غور ہی نہ کرسکی کہ ادا، حسن، نزاکت کے درمیان فرحان آغا کو کیا کمی تھی جس نے اس کی ضرورت کو اس کی ذات سے باہر دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔

"ہم آپ سے کیا کہیں زیتون کہ آپ میں کیا کمی ہے یا شاید ہمیں ہی اس اضافی خوبی نے متاثر کر ڈالا۔ صاحبہ مرزا بظاہر زیتون بانو آپ کے جتنی حسین نہیں ہیں۔ لیکن ان میں بہت کچھ اضافی ہے۔ جو ناحق ہم آپ سے چھپا نہیں سکتے۔" انہوں نے رک کر زیتون بانو کی جانب دیکھا جو خاموشی سے جہازی سائز بیڈ پر دراز اپنی آنکھوں پر بازو دھرے بظاہر بے پروا تھیں لیکن ان کا وجود آنکھ بن کر فرحان آغا کا طواف کررہا تھا، وہ جانتی تھیں کہ آغا اپنی آرام دہ کرسی پر بیٹھے پڑھ نہیں رہے تھے۔ کتاب گھٹنوں پر کھلی پڑی تھی اور وہ سوچوں میں گم تھے۔

"تو وہ اضافی خوبی نہیں خوبیاں کیسے بتاؤں......"

وہ تصور میں اس کا سراپا تک رہے تھے۔ صاحبہ میں جو تمکنت تھی جو خوش لباسی تھی، اس کا فر، فرانگریزی لہجہ، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کا احساس وہ سب صاحبہ کی نشست و برخاست سے جھلکتا تھا۔ ہلکی سی چھینک پر بھی نزاکت سے "ایکسکیوزمی" کہنے والی صاحبہ کے سامنے زیتون بانو کی لگاتار چھینکوں پر بھی اس قسم کے تردد کا کوئی مظاہرہ نہ کرنا ان کا جرم تھا یا یہ کمی تھی...... تھی تو وہ بھی نوابوں کی اولاد لیکن بہترین تربیت پر کم تعلیم حاوی ہوگئی تھی...... وہ تو جلد شادی کے بندھن میں بندھ کر کاہے کو اس تردد میں پڑتیں کہ چھینک پر انگریزی میں معذرت کرنی ہے۔ اور میٹرک تک تعلیم کی وقت ان کی زندگی کا حسن ماند کرڈالے گی...... لیکن ایسا کب ہوتا ہے کہ مرد جو چاہے وہ طاقت رکھتے ہوئے بھی نہ پاسکے۔

☆☆☆

"سو باتوں کی ایک بات ہے...... میری چندا کہ آپ نواب صاحب کو اجازت دے دیجیو......" بوا نے زیتون بانو کے بالوں میں تیل کی مالش کرتے تھوڑی دیر رک کر کہا۔ زیتون بانو نے مالش کے نتیجے میں ملنے والے سکون سے بند آنکھیں پٹ سے کھول دیں۔

"آپ بھی چاندنی بوا!" زیتون بانو نے ناراضی سے جھٹکے سے اپنے بال ان کے ہاتھوں سے چھڑوائے اور دراز گیسوؤں کو ہاتھ پر لپیٹ کر جوڑا بناتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"ہم تو آپ کے بھلے کو کہہ دیوے ہیں بٹیا! مرد نے تو اپنی سی کرنی ہوتی ہے، آپ ان کو اجازت دے

کر احسان دھردو۔‘‘
’’لیکن مجھ میں کیا کمی ہے بوا اماں......!‘‘ قد آدم آئینے میں اپنی متناسب جسامت اور چمکتے چہرے کو زیتون نے غرور اور خود ترسی کی ملی جلی کیفیت میں دیکھا۔
’’کوئی کمی نہیں ہے میری چندا......بس مرد کا دل ہے گستاخی معاف! گدھی پر آجاوے تو پری بھول جائے۔‘‘ بوا نے تاسف سے سر ہلایا۔
’’نہیں بوا......ہم تو بی بی جان کے اتنا سمجھانے پر بھی دل کو نہیں منا سکے تو اب کیسے؟‘‘
’’بی بی جان کی بھی خوب کہی آپ نے بٹیا......! وہ بیچاری تو خود نواب وجاہت آغا کے لائے گئے دو سوتنوں کے تختے کو بھگتائے بیٹھی ہیں۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کا کرم کہ فرحان میاں اکلوتی اولاد تھے اور بی بی عفت آرا کے بطن سے رہے۔ اب تو بڑے نواب نہ رہے تو بیٹے کے ساتھ اکیلے بسر کرنے کو ملی ہے۔ آپ سے تو اجازت طلب کر رہے ہیں صاحبزادے......بی بی جان سے تو بڑے صاحب نے اجازت بھی طلب نہ کی تھی۔ بڑے صبر والی ہیں عفت بی بی......اللہ ان کو سلامت رکھے......یوں لگتا ہے گویا فرشتہ ہوں بہت اللہ والی ہیں۔‘‘ زیتون بانو کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ کچھ کہے بغیر ان کے آنسو گالوں پر لڑھکنے لگے۔

☆☆☆

’’بی بی جان وہ پچھلی طرف والے کمرے میں بی بی نے غضب کر ڈالا......خون میں لت پت پڑی ہیں۔‘‘ سکینہ نے ہانپتے کانپتے ہوئے آکر کہا۔ بی بی جان اپنا غرارہ سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔
’’اُف خدایا......! یہ کیا کر ڈالا آپ نے......اور یہ ان کے کمرے میں شیشے کا جگ کس نے چھوڑ دیا۔ ہم میں اب سکت کہاں کہ یہ سب سنبھال سکیں۔‘‘ انہوں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ’’سکینہ جلدی سے اس...بدنصیب کی مرہم پٹی کرو......‘‘ وہ سامنے کھڑی خون آلود ہاتھوں کو وحشت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی پھر اس نے چلاتے ہوئے سکینہ کی گردن کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا......اب سکینہ کی فلک شگاف چیخوں سے حویلی گونج رہی تھی۔

☆☆☆

’’بابا جان آپ کی نئی دلہن آرہی ہے گھر میں؟‘‘ عثمان نے فرحان آغا کی سماعتوں پر دھما کا کیا بمشکل خود پر قابو پا کر انہوں نے عثمان کو پیار سے گود میں اٹھایا۔
’’آپ کو کس نے بتایا چھوٹے نواب؟‘‘
’’بابا! امی جان اور بوا اماں کی باتیں ہم نے سن لی تھیں۔‘‘ عثمان نے معصومیت سے باپ کے سینے سے لگ کر کہا۔
فرحان آغا نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔
’’آپ کو معلوم ہے ناں بڑوں کی باتیں سننا بری بات ہے، آپ آئندہ ایسا نہیں کریں گے بیٹا! اب آپ کھیلیں، ہم بی بی جان سے مل کر آتے ہیں......‘‘ عثمان بھاگ کر وسیع وعریض لان کے ایک طرف بنے پلے لینڈ کی جانب بڑھ گیا۔
’’یہ سب تو ہوگا آخر آپ کو گلہ کس بات کا ہے صاحبزادے......جب اتنا بڑا قدم اٹھا رہے ہیں تو چھپانے کا لاحاصل عمل کس لیے......جب نئی دلہن اس گھر میں آئیں گی تب بھی تو عثمان کو پتا چلے گا ہی......تو اب کیوں نہ سہی......آپ اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کریں، آخر اللہ تعالیٰ نے کس چیز کی کمی کی ہے آپ کی حیات میں......خوب صورت وفادار بیوی ہے......اچھا گھر، نوکر، چاکر، دولت کی ریل پیل......پھر اس فیصلے کو کرنے میں آپ کو ہماری زندگی کی مشکلات بھول گئیں؟ کیا آپ وہ ہی نہیں کرنے جا رہے ہیں جو آپ کے والد نے ہمارے ساتھ کیا......؟‘‘ بی بی جان غم و غصے سے بولتی چلی گئی تھیں۔
’’کمی ہے بی بی جان! ہم جس سرکل میں اٹھتے بیٹھتے ہیں وہاں کے لیے مس فٹ ہیں زیتون بانو......خوب صورتی ان کی ہر کمی دور نہیں کر سکتی......پندرہ سال میں ایک بچہ ہی لائی ہیں وہ ہماری زندگی میں......ہم جانتے ہیں اکلوتے ہونے کا

درد اور ہم نہیں چاہتے عثمان بھی اس تکلیف سے گزرے...... ہمیں یاد ہے کہ کس طرح ہم حسرت زدہ نظروں سے دیکھتے تھے ان بچوں کو جن کے بہن، بھائی ہوتے تھے اور آپ تو جانتی ہیں کہ زیتون اب ماں بھی نہیں بن سکتی ہیں۔ ہم ایک بیٹی کے لیے ترس رہے ہیں۔'' ان کی آنکھوں میں ضبط کے باعث سرخی آ گئی۔ بی بی جان نے بڑھ کر انہیں سینے سے لگا لیا اور ان کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

''ہم بات کریں گے زیتون بانو سے۔'' بی بی جان نے فیصلہ کن انداز میں کہا...... وہ اس وقت صرف ایک ماں تھیں۔ خالہ، نہ ساس نہ ہی عورت...... صرف اور صرف ماں۔

زیتون بانو میکے میں داخل ہوتے ہی سب کو سلام کر کے سیدھی ماں کے کمرے میں چلی گئیں۔ عصمت آرا نے بیٹی کو اچانک سامنے دیکھ کر ہاتھ میں اٹھائی کتاب کو سائڈ پر رکھ کر بیٹی کے لیے بانہیں وا کر دیں۔ زیتون بے تابی سے ماں کے بازوؤں میں سما گئیں اور پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگیں۔ عصمت آرا بیگم نے دھیرے، دھیرے ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔

''میں کیا کروں اماں جان؟ آپ ہی بتا دیں؟'' ان کے لہجے میں صدیوں کی تھکن تھی۔

''صبر کرو زیتون ''صبر'' اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں...... آپ کا میکا کمزور نہیں ہے لیکن مشکل تو یہ ہے کہ روایات الگ نہیں ہیں۔ تمہارے ابا حضور کس طرح روکیں فرحان میاں کو، وہ خود بھی تو ہم پر سوتن لائے ہیں ناں...... وہ بھی تو ہم سے بہت محبت کرتے تھے اور ہم تو دیوانے رہے ان کے لیکن غالب کی محبت میں ان کو چھوڑ نہیں پائے۔ محبت کے جتنے بھی ناز اٹھا لو یہ عزت پر برا وقت ضرور لاتی ہے پھر انا بچتی ہے نہ ضد...... نہ میکے کا غرور...... نہ ماں ہونے کا مان...... تم بھی بس صبر کر دیا چھوڑ دو محبت کو...... بولو کر سکو گی؟'' عصمت آرا نے سوالیہ انداز میں بیٹی کو دیکھا۔

''نہیں کبھی نہیں...... خواب میں بھی نہیں......

اماں جان میں آغا کے بغیر دوسری سانس نہیں لے سکتی ہوں......'' وہ ہراساں ہوئی ہرنی کے مانند تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆☆☆

مزمل خان نے بخت آور کی زمینوں کا پانی کاٹ ڈالا تھا۔ اور بخت آور، چوہدری حاکم کا مزارع تھا فوری فیصلے کرنے کا عادی، غصے میں سوجھ بوجھ کھو دینے والا۔ اس بار بھی یہی ہوا معظم جس کے حکم پر پانی کاٹا گیا تھا۔ اس کو بخت آور نے گولیوں سے چھلنی کر ڈالا تھا۔ دو گاؤں میں سوگ کی کیفیت تھی۔ مزمل خان نے پولیس کو بیچ میں آنے ہی نہ دیا تھا۔ سیدھا، سیدھا معاملہ پنچایت پر ڈال دیا تھا۔

☆☆☆

''کیا بات ہے شیراز احمد تم بہت پریشان لگ رہے ہو؟'' صاحبہ مرزا نے حیرت سے شیراز احمد کے سراسیمہ انداز کو دیکھا۔ جب سے گاؤں سے فون آیا تھا شیراز احمد جو صاحبہ مرزا کا کولیگ تھا مسلسل پریشان تھا۔

''جی مس مرزا! ہم گاؤں والوں کی سادگی بہت خوب صورت نظر آتی ہے۔ لہلہاتی فصلوں کے پیچھے جس پانی کی آبیاری کا عمل دخل ہوتا ہے، وہ کتنی جانیں لے لیتا ہے اس کا علم شاید بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ میرے بابا کو بھی اس پانی کے زہر نے زہریلا کر دیا لیکن اس کو بھگتنے والی ہو گی اب ایک معصوم جان...... مجھے جلد گاؤں جانا ہے۔'' شیراز احمد کے وجیہہ چہرے پر پریشانی کے سائے اندھیرا کیے ہوئے تھے۔

''میں کچھ مدد کر سکتی ہوں آخر اتنے عرصے کی دوستی ہے ہماری۔'' صاحبہ مرزا کے لہجے میں خلوص ہی خلوص تھا۔

شیراز نے کچھ سوچتے ہوئے صاحبہ کو دیکھا۔ ''شاید آپ ہی کو میری مدد کرنا ہو گی۔'' وہ تھکے، تھکے لہجے میں اس پُروقار عورت کو دیکھ رہا تھا جو اس کی دوست تو تھی لیکن اس کی زندگی کی ساتھی نہ بن سکی تھی۔ اس سے پہلے فرحان آغا کی پُروقار وجاہت نے صاحبہ مرزا کو اپنا

اسیر بنالیا تھا۔

☆☆☆

''آغا میں۔۔آپ کو دوسری شادی کرنے کی اجازت دے سکتی ہوں مگر مجھے میری اس کمی کا احساس تو دلا دیں جس نے ہم دونوں میں تیسرے فرد کی گنجائش نکالی۔'' اس نے والہانہ نظروں سے آئینے میں نظر آتے آغا کے عکس پر نثار ہوتے ہوئے کہا۔ فرحان آغا کی اس کی طرف پشت تھی۔ انہوں نے چاہتے ہوئے بھی پلٹ کر زیتون بانو کو نہیں دیکھا۔

''کمی شاید تم میں نہیں ہو۔ زیتون جانی! مجھے ہی کچھ زیادہ کی احتیاج ہے۔ تم جانتی ہوناں کہ میں تمہیں خاندان کی محفلوں میں کس فخر سے لے کر جاتا ہوں جہاں تم سب میں منفرد لگتی ہو حوروں جیسی، تم لوگوں کی سادہ گفتگو زیورات سے لے کپڑوں اور کپڑوں سے بچوں تک ہوتی ہے۔ تم پوچھتی تھی ناں کہ میں تمہیں بزنس سرکل میں نہیں لے کر جاتا تو جانتی ہو کیوں؟ تم کرسکتی ہو تیسری دنیا کے مسائل پر بات...... سیر حاصل بحث...... تم سیاست پر بات تو کیا ڈھنگ سے سیاسی لیڈرز کے نام بھی نہیں جانتی ہوگی۔ تم بتاسکتی ہو کہ شیئر مارکیٹ میں مندی کے رجحان کی وجوہات کیا ہیں۔ کیا تم جنگ عظیم کے نقصانات کا اندازہ لوگوں سے ڈسکس کرسکتی ہو اور وہ بھی رواں انگریزی میں۔'' زیتون بانو ہق دق فرحان آغا کی باتیں سن رہی تھیں۔ اتنی خامیاں اور وہ خود کو مکمل سمجھتی رہیں۔ کتنی بے خبر تھیں وہ۔ بے خبری سے آگاہی کے سفر میں اب بحث کی گنجائش اگرچہ بالکل نہیں بچی تھی لیکن بہت دیر بعد زیتون بانو نے زبان کھولی تو حیران ہونے کی باری فرحان آغا کی تھی۔

''اور اب میں عثمان کے بعد آپ کو اور اولاد بھی نہیں دے سکتی۔ یہ سب سے بڑی خامی ہے ناں مجھ میں آغا...... یہ مت پوچھیے گا کہ ہمیں کیسے اور کب پتا چلا۔ میں خود ہی بتا دیتی ہوں اس دن بی بی جان کے ساتھ ہونے والی آپ کی باتوں کا حرف، حرف میں سن چکی ہوں...... سو میں زیتون بانو بقائمی ہوش وحواس آپ کو اپنی رضامندی سے دوسری شادی کی اجازت دیتی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر رکی نہیں تیزی سے بیڈ سے اتریں اور کمرے سے نکلتی چلی گئیں۔ ان کے تیزی سے اٹھنے پر چوڑی کی کھنک اور پائل کی جلترنگ نے ایک ساز بجایا تھا اور دور جاتے ان کے قدموں نے پیچھے فرحان آغا کو سناٹوں کے حوالے تو کیا ہی لیکن جلد ہی وہ سناٹا صرف باہر رہ گیا۔ فرحان آغا کے اندر تو صاحبہ مرزا کی مغرور ناک میں چمکتی ہیرے کی لونگ کی روپہلی چمک نے نور ہی نور بکھیر دیا تھا۔

☆☆☆

بستر پر پڑے بے بس وجود نے بمشکل گردن گھما کر اپنی دائیں سمت دیکھا...... پچھلے ایک گھنٹے سے وہ جانماز پر جھکتے اور ماتھا ٹیکتے اس سفید پوش وجود کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا تھا۔ اب وہ وجود ہاتھوں کے پیالے میں لگاتار آنسوؤں کی تسبیح گرا رہا تھا۔ اچانک ہاتھوں سے نظر ہٹا کر اس نے اس بے بس وجود کی طرف دیکھا۔

''کچھ چاہیے؟ کپڑے بدل دوں۔ کوئی حاجت ہے؟'' وہ وجود لگاتار سوال کررہا تھا اور اس بے بس کی آنکھوں میں نفرت کے ناگ ڈسنے کو مچل رہے تھے۔ اس نے ایک بار پھر بمشکل گردن کا رخ موڑ کر اظہار نفرت کیا۔ لیکن وہ سفید پوش وجود تیزی سے اپنے ہاتھوں سے اسے ٹٹولنے لگا۔

☆☆☆

''مخمل تم اپنا سامان اکٹھا کرلو، ہم آج رات کی تاریکی میں شہر نکل جائیں گے اور میں سختی سے کہہ رہا ہوں کہ یہ تیاری بہت خفیہ رہنی چاہیے۔ ماں یا بابا کسی کو اس کی خبر نہ ہو۔'' وہ سرگوشی میں کہتا باہر نکل گیا۔ پیچھے مخمل نے ڈھیلے ہاتھوں سے اپنی چیزوں کو سمیٹنا شروع کیا۔ بیگ میں کپڑے ڈالتے ہوئے اس کی نظر ست رنگی چوڑیوں پر پڑی جو سانول نے بڑی چاہ سے اسے دی تھیں ابھی تو اس نے پہنی بھی نہیں تھیں، اس نے ان کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور پھر جلدی سے انہیں اپنے بیگ میں ڈال دیا۔ اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

خاموشی سے نکاح کے بندھن میں بندھنے والی صاحبہ مرزا کو صلاح الدین مرزا نے بہت بے دلی سے... بی بی جان اور فرحان آغا کے ساتھ رخصت کیا۔ گرچہ بی بی جان نے خاندانی روایات کو قائم رکھتے ہوئے زرو جواہر میں کمی کی نہ ہی عروسی لباس کم قیمت تھا۔ اس معاملے میں انہوں نے زیتون بانو اور اس کے درمیان کسی قسم کی بے انصافی روا نہ رکھی تھی۔ محبت سے اسے گاڑی میں بٹھایا اور گھر میں بھی اس کا استقبال پوری طرح محبت و روایت کے سنگم میں کیا۔ پھولوں کی پتیاں بھی واریں اور رسمیں بھی کرنے میں ہرگز کوتاہی نہیں برتی۔

نکاح سادگی سے کرنے میں سراسر صاحبہ کے والد کی مرضی تھی۔ وہ سراسر اس شادی کے مخالف تھے۔ شادی سے پہلے اسی بات پر صاحبہ سے ان کی بہت بار بحث ہوئی لیکن جس طرح کی پرورش انہوں نے صاحبہ مرزا کی کردی تھی اب ان سے دُگنے دلائل صاحبہ کی پوٹلی سے برآمد ہوجاتے تھے۔

''سوچ لو بیٹی صاحبہ......! ایک شادی شدہ مرد کبھی پوری محبت نہیں دے سکتا۔ بٹا ہوا مرد ہوتا ہے وہ۔'' ان کے لہجے میں دبی، دبی سرد مہری تھی۔

''پاپا مرد تو شادی شدہ نہ ہو تو بھی بٹا ہوا ہی ہوتا ہے، کوئی خانہ ماں کا تو کوئی بہن کا......کوئی بھائی کا کوئی دوستوں کا اور پھر بعد میں اولاد کا بھی۔'' وہ تواتر سے بولتی چلی گئی۔

''لیکن میں نے صرف بیوی کی بات کی ہے، اس کا تو بیٹا بھی ہے۔'' انہوں نے کوشش مزید کی تھی۔

''پاپا جانی اس کی گارنٹی کون دے سکتا ہے کہ اگر میں کسی غیر شادی شدہ مرد سے شادی کروں گی تو وہ بعد میں دوسری شادی نہیں کرے گا۔ میں اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں یہ بات کہ اسرار تو ہم بھی اپنے اندر رکھتے ہیں۔'' صاحبہ نے استہزائیہ انداز میں مرزا صاحب کو دیکھا۔ انہوں نے ایک سرد نظر صاحبہ پر ڈالی اور کمرے میں لٹکی پینٹنگ پر نظر جمادی۔ جس میں ایک

عورت ایک ننھی بچی کو سینے سے لگائے رو رہی تھی۔

☆☆☆

زنجیر کی کھن، کھن اور گھٹی، گھٹی تکلیف دہ چیخوں کا سلسلہ رک نہیں رہا تھا۔ بی بی جان کا دل ان آوازوں کے ساتھ گویا پگھل رہا تھا لیکن وہ ایسے بیٹھی تھی جیسے بہری ہو۔

''دلہن! وہ انسان ہے جیتی جاگتی......اتنا ظلم مت کرو......زنجیر کیوں ڈال دی تم نے......آزاد کردو اس کو ہمارا تو کلیجا منہ کو آتا ہے۔'' بی بی جان کے لہجے میں آزردگی تھی۔

''یہ اسی کے لیے ضروری ہے بی بی جان...... ورنہ وہ خود ہی کو نقصان پہنچالے گی اور زنجیر اتنی لمبی ہے کہ وہ آرام سے واش روم تک بھی جاسکتی ہے، میں تو اس کو مینٹل اسپتال منتقل کرنا چاہتی تھی، یہ تو نواب صاحب کو ہی منظور نہیں تھا۔'' اس نے اپنی ساڑی کا پلو اپنے کندھے پر نفاست سے سیٹ کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

بی بی جان نے تاسف سے اسے دیکھا اور اسی تاسف سے سر ہلا دیا۔ ''ہر شخص اپنے ہی بوئے کو کاٹ رہا ہے نہ جانے اب دلہن بیگم کو کیا بھگتنا ہوگا......'' وہ محض سوچ کر کانپ گئی تھیں۔

☆☆☆

صاحبہ مرزا نے نواب ولا میں پہلا قدم رکھا تو سب نے استقبال کیا۔ صرف ایک زیتون بانو تھیں جو رو، رو کر بھی اب تھک چکی تھیں۔ ستون کی آڑ میں کھڑی سرخ ساڑی میں ملبوس اس طرحدار عورت سے اپنا تقابل کر رہی تھیں کچھ بھی ایسا نہ تھا جو ایک دن کی دلہن میں ہوتا ہے اور نہ ہی حسن اتنا خیرہ کُن تھا جس سے زیتون مالا مال تھیں۔ لیکن کچھ نہ سمجھ میں آنے والا خاص جوہر تھا جو صاحبہ کی شخصیت میں موجود تھا۔ اور وہ تھا اس کا خود اعتماد روپ......وہ سر اٹھائے پُرتمکنت ملکہ کی طرح تھی۔ اس کے چلنے کے انداز میں بھی کشش تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ میں ایک گریز اسے خاص بنا رہا تھا۔

تو یہ تھی وہ خامیاں جنہوں نے آغا کو اس سے دور کردیا تھا یا یہ تھی صاحبہ مرزا کی خوبیاں جنہوں نے آغا کو

اس سے قریب کر دیا تھا۔ گالوں پر پھیلتے آنسوؤں کو زیتون بانو نے دھیرے سے صاف کر دیا۔

☆☆☆

صاحبہ جو آفس سے اٹھنے والی تھی اور فرحان آغا کو فون بھی کر دیا تھا کہ آج ہم ڈنر باہر کرنے والے ہیں لیکن جلدی، جلدی چیزیں سمیٹ کر دراز لاک کرتے ہوئے فون کی گھنٹی بجنے پر اس نے جلدی سے ریسیور اٹھایا اور دوسری طرف سے آنے والی مخمل کی آواز پر اس کا سارا دھیان مخمل کی باتوں پر لگ گیا۔ چہرے پر گہرے سائے لہرائے۔

''اوہ......! میں آ رہی ہوں، تم جلدی سے اپنا سامان سمیٹ لو......'' صاحبہ مرزا نے ریسیور رکھ کر تیزی سے چابیاں اٹھائیں اور میکے کا رخ کیا۔

☆☆☆

''کیسی ٹھنڈی اور سرد مہر عورتوں سے واسطہ پڑ گیا ہے ہمارا۔'' فرحان آغا نے صاحبہ کے حصے کی تلخی بھی زیتون بانو پر اتاری۔

''کیا امید رکھتے ہیں آپ مجھ سے؟ آپ کی خوشی پر اجازت کی مہر لگا کر صاحبہ مرزا کو آنے تو دیا آپ کی زندگی میں، اب راحت کا سامان اور بھی ہے آپ کے پاس، مجھ سے توقعات میں اضافہ کرنے کی غلطی مت کیجیے گا۔'' زیتون کے لہجے میں تلخی ہی تلخی تھی۔

''مت بھولیں کہ آپ اب بھی ہماری زوجیت میں ہیں......اور ہمارے حقوق و فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی پر جوابدہ ہیں۔'' فرحان آغا کے انداز میں جھنجلاہٹ اور غصہ تھا۔

''نہیں بھولے اسی لیے آپ کے گھر میں ہیں۔ ورنہ شاید ہماری جگہ اب یہ کرایا یہ گھر نہ ہوتی۔'' وہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دینے لگیں۔ ''ہم آپ کے حقوق و فرائض ادا کر تو رہے ہیں۔''

''اس طرح ہوتی ہے ادائیگی حقوق، آپ کو اب نہ ہم سے محبت ہے نہ ہماری ضرورت......'' انہوں نے زیتون بانو کے حسین چہرے کو سختی سے تھام کر جھٹکے سے چھوڑ دیا۔

''آغا محبت کو الزام مت دیں۔ محبت تو دلوں میں بستی ہے۔ روحوں سے بندھی رہتی ہے، ضرورت اور محبت کے درمیان فرق ہی تو سمجھ نہ پائے آپ...... بت یا مورت میں ہی نہیں آپ بھی ہیں۔ بت صرف وہ نہیں ہوتے جو مندر میں سجائے جاتے ہیں۔ دل میں بھی بت خانے ہوتے ہیں جن میں پتھر کے صنم بستے ہیں۔ پوجا صرف مندروں میں ہی نہیں کی جاتی ہے، یہ دل کافر ہوتے ہیں فرعون سے محبت کرتے ہیں اور میں وہ کافر ہوں جو آپ کو پوجتی ہوں۔ اتنی محبت اپنے اللہ سے کرتی تو ولی ہو جاتی پر یہ بے مہر دل......'' زیتون کی آنکھیں لبالب بھر گئی تھیں۔

''بند کریں اپنے فلسفے اور چادر تان کر سو جائیں۔'' آغا نے ایک بے بس نظر زیتون پر ڈالتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل کر ملحقہ اسٹڈی کا رخ کیا۔ دو بیویوں کے شوہر ہوتے ہوئے وہ تنہا اسٹڈی میں رکھے صوفہ کم بیڈ پر جا کر لیٹے تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور لگی۔ اتنے عرصے کی شادی میں زیتون بانو نے تو بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ نیند میں خراٹے لیتے ہیں۔ اپنے کمرے میں سگار سلگانا بری بات ہے، یہ باتیں تو صاحبہ مرزا نے انہیں بتائی تھیں۔ شادی کے دو ماہ بعد ہی صاحبہ کی نزاکت و نفاست پسند طبیعت کو ان کی کتنی خامیاں نظر آ گئی تھیں اور وہ بہت سکون سے ان کو باور کروا رہی تھی کہ وہ ضرورتاً اپنے بیڈ روم میں رہے گی ورنہ وہ اپنا بیڈ روم الگ کرنا چاہتی ہے۔ اس نزاکت و نفاست نے ہی تو انہیں متاثر کیا تھا اور آج اسی کے ہاتھوں وہ تنگ آ کر بیڈ روم اس کے حوالے کر کے زیتون بانو کے کمرے کو رونق بخشنے آ گئے تھے لیکن وہ بھی ان دو ماہ میں ان سے قلبی طور پر بھی کوسوں دور ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

اس سے پہلے کہ مخمل کو ونی کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا۔ شیراز احمد اپنی لاڈلی بہن کو صاحبہ کے حوالے کر گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے آخری سانس تک اس راز...... کو راز ہی رکھنا تھا کہ مخمل کہاں ہے اور اس نے مخمل کو سختی

سے منع کیا تھا کہ وہ کوئی ایسی بیوقوفی نہیں کرے گی جس کی وجہ سے کسی کو بھی علم ہو کہ مخمل کہاں پر ہے۔ راتوں رات چوروں کی طرح وہ مخمل کو مرزا ہاؤس پہنچا کر گاؤں واپس چلا گیا تھا۔ لیکن والدین لاعلم کیسے رہ سکتے تھے۔ بس اتنا اختیار اس کے پاس تھا کہ وہ ماں، بابا کو بھی یہ کبھی نہ بتاتا کہ مخمل ہے کہاں پر...... لیکن......!

''پتر تم بتادو کہ مخمل کہاں ہے...... انجام کا تجھے علم ہے، دوسری صورت میں خون کے بدلے خوں بہا...... تم یا میں دونوں میں سے کسی کو بھی اپنی جان دینا ہوگی۔'' بخت آور نے کوئی تیسری بار ایک ہی سبق دُہرایا۔

''بابا! پہلی صورت میں میری بہن جیتے جی مرجاتی۔ ونی ہو جاتی، جانتے تھے ناں آپ...... اس کا نکاح نہیں ہوتا، مزمل خان کا حجرہ سجاتی وہ۔'' وہ ہلکا سا غرایا۔

''شیراز تجھے پڑھا لکھا کر غلطی کی میں نے، مجھے یہ احساس نہ دلا۔'' بخت آور چنگھاڑا...... ''تمہیں یہ نظر نہیں آتا کہ کیا جواب دوں گا سب کو مخمل کہاں گئی، کس کے ساتھ گئی۔ یوں بے عزتی سے تو اس کا ونی ہو جانا بہتر تھا۔''

''بس بابا جان...... اور جس طرح آپ کی عزت بچ رہی ہے یا جان اس سے بہتر ہے کہ ہم مر ہی جائیں...... ہم اپنی عورتوں کو اپنی جان کی قیمت چکانے کے لیے ہی پیدا کرتے ہیں کیا......؟ سمجھ نہیں آتا، کیسی بے غیرتی ہے یہ...... اپنی جان بچانے کے لیے اپنی عزتوں کو غیروں کے حوالے کردیں۔'' وہ دونوں بحث کررہے تھے۔ اور حکیماں بی بی سوکھی آنکھوں سے دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ بات شیراز احمد کی بھی درست تھی لیکن کل کا دن اس کی گود خالی کرنے والا تھا یا اس کو بیوہ کرنے والا...... وہ اس سورج کے نکلنے سے خوفزدہ تھی۔ کاش آج کی رات رک جاتی قیامت تک کے لیے...... لیکن سورج کو نکلنا تھا اور وہ نکلا بھی...... فیصلہ بھی ہوا...... بے عزتی بھی...... شیراز نے لب نہ کھولے اور خون کے بدلے خون تو بہنا تھا۔ اور خون بہہ بھی گیا تھا۔ لیکن سانول کا......

☆☆☆

صالحہ کی طبیعت پچھلے کئی دنوں سے خراب تھی۔ اور اس خرابی طبیعت سے وہ بخوبی آگاہ تھی۔ وہ کوئی پہلی بار ماں نہیں بننے جارہی تھی۔ اس کی پہلی شادی اسفند سے ہوئی تھی لیکن دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ اس کی نزاکت و نفاست کو برداشت کرنا اسفند کے لیے بہت ناممکن امر تھا۔ وہ اپنی مردانگی کی توہین برداشت نہیں کرپایا تھا۔ اور بہت جلد ان دونوں میں علیحدگی ہوگئی تھی۔ اس شادی سے فرحان آغا بخوبی آگاہ تھے لیکن وہ ماں بھی بن چکی ہے یہ بھید کھولنا صالحہ نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس جیسی پریکٹیکل خاتون کو اس سے کوئی مطلب نہیں تھا کہ فرحان کو زندگی کے کسی بھی موڑ پر اس بات کا پتا چلتا تو وہ...... دو لفظ بول کر کندھے اچکا دیتی۔ ''سو واٹ......'' لیکن یہ بھید اس نے اسفند کو پانے نہ دیا تھا کہ وہ ایک گڑیا سی بچی کا باپ ہے۔ وہ اپنی ذات کو پہلی ترجیح دینے والی عورت تھی۔ اس نے چھ سالہ بچی کو لندن بھیج دیا تھا خود سے دور گھر سے دور...... کیا ہوا جو اس نے آغا کو اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔ وہ برتی ہوئی عورت تھی تو آغا بھی برتا ہوا مرد تھا۔ وہ بچی کی ماں تھی تو کیا آغا ایک بچے کا باپ نہ تھا۔ لیکن اس وقت اس کو جس بات کی پریشانی تھی وہ تھا مخمل کو نواب ولا میں لانا۔

''پاپا...... میں نے شاید زندگی میں ایک نیکی کرنے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے علم نہ تھا کہ آپ یوں کر کے میری نیکی کو مٹی میں ملادیں گے۔'' مخمل کو گلے سے لگائے وہ اس کی پیٹھ پر تسلی کے لیے ہاتھ پھیر رہی تھی اور مرزا صلاح الدین مخمل کو خون آشام نظروں سے گھور رہے تھے۔

''تم اس لڑکی کی باتوں پر بھروسا کررہی ہو جس کو تم ٹھیک سے جانتی بھی نہیں؟ اور میں تمہارا باپ جس کی تم بیٹی ہو اس کا کردار تمہاری نظر میں اتنا گر گیا۔ تف ہے ایسی اولاد پر۔'' مرزا صاحب نے ملامت بھری نظروں سے صالحہ کو دیکھا۔

''میرا دن میں دس طرح کی عورتوں سے واسطہ پڑتا ہے جو کسی نہ کسی مرد کے ظلم یا ہوس کا شکار ہو چکی

ہیں، ایک این جی او چلانے والی عورت ہوں میں...... ایک لڑکی کی آنکھوں میں پوشیدہ خوف کو پڑھنا جانتی ہوں پاپا...... آئی نو کہ آپ ممی کے بعد ولیوں کی زندگی نہیں جی رہے ہیں لیکن یوں گھر کے اندر آپ اس معصوم لڑکی کو ہراساں کریں گے، میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'' اس نے تاسف سے سر ہلایا۔

''بس بہت ہو چکا...... تم اس گندگی کو بھی اپنے ساتھ نواب ولا لے جاؤ اور بھول جاؤ کہ تمہارا کوئی باپ بھی تھا۔ دوسری صورت میں اسے وہیں بھیج دوں گا جہاں سے آئی تھی۔'' مرزا صاحب نے منہ سے کف اڑاتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

''اوکے...... یہ ہے تو یہی سہی...... میں اس کو اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں اور آپ بھی یہ بھول جائیے گا کہ آپ کی کوئی بیٹی بھی تھی۔''

☆☆☆

شیراز احمد نے تھک کر آنکھیں موند لیں تو ماضی پوری جزئیات کے ساتھ آنکھوں کے پردے پر متحرک ہوگیا۔ وہ مخمل کو صاحبہ کے حوالے کر کے جلد از جلد گاؤں واپس پہنچنا چاہتا تھا۔ اور پہنچ بھی گیا تھا۔ ذہنی طور پر وہ اپنے آپ کو قربان ہونے کو تیار بھی کر چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے معاملات میں قانون سے مدد لینے کا خیال بھی سراسر بیوقوفی تھا۔

پنچایت تو نام کی تھی، فیصلے بڑوں کے ہی چلنے تھے لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ حالات اس طرح بھی بدل جائیں گے۔ وہ اس بات سے بھی ناواقف تھا کہ مخمل اور سانول ایک دوسرے کو چاہتے ہیں...... لیکن یہ ہرگز نہیں جانتا تھا کہ چھوٹا خان ''اسلم خان'' سانول اور مخمل کو کئی بار اکٹھے مل کر باتیں کرتے دیکھ اور سن بھی چکا ہے۔ اور یہ ساری سازش بھی اس کی سوچی سمجھی تھی۔ وہ بخت آور کے غصے سے بھی واقف تھا اور مخمل کے حسن پر بھی اس کی نظر تھی۔ اس نے جان بوجھ کر معظم کو قربانی کا بکرا بنایا تھا۔ اور چوہدری حاکم کی زمینوں کا پانی کٹوا دیا تھا۔ اور بخت آور کا ردِعمل اس کے حسب منشا ہی تھا...... وہ جانتا تھا کہ بدلہ لینے کے لیے پنچایت کو مخمل کو ونی پر مجبور کرنا ہے لیکن معظم کے گھر کے لیے نہیں اپنی عیاشی کے لیے۔ لیکن سانول کو اس سب میں گھسیٹنے کا موقع اسے ایک اور صورت مل گیا۔ عین جس رات مخمل غائب ہوئی۔ سانول بھی گاؤں میں نہ تھا...... وہ بیچارہ بے خبر زمین کے لیے کھاد لینے شہر گیا تھا اور دو دن بعد واپس آیا تو اسلم خان نے بھری پنچایت میں مخمل کے غائب ہونے کا الزام اسی پر لگا دیا۔

''یہ بے غیرتی اس سانول کی ہے پنچ حضرات یہ بہت عرصے سے مخمل پر نظر رکھے تھا۔'' اس نے پنچوں کی

طرف دیکھ کر دعویٰ کیا۔
''میری بیٹی پر الزام مت لگاؤ خان، وہ بالکل بھی ایسی نہیں ہے۔'' بخت آور نے خون آشام نظروں سے اسلم خان کو گھورا۔
''چاچا غصہ کرنے سے سچ بدل نہیں جائے گا۔ پوچھ اس سانول سے..... قرآن پر ہاتھ رکھ کر بتائے کہ یہ نہر کنارے تیری بیٹی کے ساتھ ڈھلے شام کیا کرنے جاتا تھا۔'' اسلم خان نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا تو شیراز احمد نے غصے سے کھولتے ہوئے اٹھ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔
''ایک بھی لفظ منہ سے مزید مت نکالنا ورنہ میں ابھی تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔ اس بھول میں مت رہنا کہ میری تعلیم میری غیرت کو کھا گئی ہے۔'' بخت آور نے جلدی سے شیراز کو بدقت اسلم سے الگ کیا۔ لیکن پنچایت نے شیراز احمد کو احاطے سے نکل جانے کا حکم ضرور دے دیا۔ چوہدری اور خان کے کارندوں نے اس کو گھسیٹ کر ڈیرے پر بند کر دیا۔
پنچایت نے بار، بار سانول سے پوچھا کہ اس نے مخمل کو کہاں رکھا ہے لیکن اسے کچھ علم نہ تھا اور اگر علم ہوتا تو بھی وہ کبھی نہ بتاتا کیونکہ وہ مخمل کو دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا اور اس کی خاموشی نے اس کو خون میں نہلا دیا۔ پنچایت نے اس کو موت کی سزا سنا دی۔
بخت آور کے چہرے پر درد کے بجائے مکاری بھری مسکراہٹ تھی۔ کیوں نہ ہوتی؟ اس کے ساتھ، ساتھ شیراز کی جان بھی بخش دی گئی تھی۔ صرف چند بیگھا زمین دینا پڑی تھی۔ خون کے بدلے خون تو بہہ چکا تھا۔ اور مخمل جب بھی مل جاتی تو اس کو ونی کیا جاتا یا سنگسار..... بخت آور کو یہ فیصلہ قبول تھا۔
دو دن بعد جب شیراز کو ڈیرے سے آزاد کروا کر وہ لایا تو بہت خوش تھا۔ شیراز چاہتا تھا کہ وہ سچ بتا دے کہ سانول کے ساتھ نہیں گئی تھی اس کی بہن..... وہ معصوم تو اپنے بھائی کی پناہ میں گھر سے گئی تھی لیکن بخت آور نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔
''جو ہونا تھا ہو گیا..... تمہارے سچ بولنے کا مطلب یہ ہے کہ تم مخمل کو واپس لاؤ گے یا خان کے کارندے اسے ڈھونڈ لائیں گے..... سانول تو واپس نہیں آجائے گا تمہارے اعتراف کرنے سے بلکہ تم اور میں بھی قتل ہو جائیں گے پتر.....''
''تو کیا میں بزدلوں کی طرح تماشا دیکھتا رہوں بابا..... ایک معصوم انسان قتل ہو گیا.....'' اس نے ضبط سے مٹھیاں بھینچیں۔
''ابھی تو وہ لوگ مخمل کا سراغ سانول کے ٹھکانوں سے لگا رہے ہیں اگر تم نے سچ اگلنے کی ٹھان لی ہے تو پھر مان لے اس کے بعد تم نے جہاں بھی مخمل کو چھپا رکھا ہے وہاں سے وہ اسے تیرے ذریعے ہی ڈھونڈ دیں گے۔ بتا منظور ہے یہ سودا۔'' بخت آور نے اس کی کمزوری پر ہاتھ ڈالا تھا۔
شیراز کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ چارپائی پر مضبوطی سے جمے ہاتھوں نے ایک دم چارپائی پر پکڑ ڈھیلی چھوڑ دی۔

☆☆☆

''پاپا کیا بات ہے اتنی سردی میں آپ کے ماتھے پر پسینہ..... طبیعت تو ٹھیک ہے ناں آپ کی؟'' ماہِ کامل نے شیراز کے ماتھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا تو شیراز نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں۔
ماہ کامل کا معصوم چہرہ اسے ماضی سے حال میں لے آیا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مخمل کہیں اوجھل ہو گئی۔ صاحبہ سی نزاکت لیے ماہِ کامل آنکھوں میں محبت کا جہان آباد کیے اس کے سامنے کھڑی تھی اور اس میں یہ نزاکت کیوں نہ ہوتی، صاحبہ کی بیٹی جو تھی۔ صاحبہ کی پناہ میں محفوظ مخمل کا قرض چکانے کا حق اس کی بیٹی کو باپ کی شفقت دے کر شاید وہ چکا بھی سکا تھا یا نہیں..... کوشش ضرور کر رہا تھا۔

☆☆☆

''نوراں تو جانتی ہے ناں تجھے کیا کرنا ہے؟'' زیتون بانو نے دھیرے سے نوراں کی مٹھی میں کچھ منتقل

کرتے ہوئے کہا۔
''جی بی بی! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس دوائی کو کسی نہ کسی طرح صاحبہ بی بی کے شکم میں اترنا ہے پر کیسے؟ یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔'' نوراں نے مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔
''دیکھو لو! میں تمہیں اتنا مال دوں گی کہ تمہاری نسلیں سنور جائیں لیکن اگر کام نہ ہوا تو یاد رکھنا کہ......''
زیتون کے لہجے میں سفاکی اتر آئی تھی۔ حسین چہرہ اس وقت بے تحاشا کریہہ ہو گیا تھا۔
''آپ فکر مت کریں...... چھوٹے نواب کا کوئی شریک اس دنیا میں نہیں آ پائے گا......'' وہ کہہ کر اجازت طلب نظروں سے زیتون کو دیکھنے لگی۔ زیتون نے بے نیازی سے ہاتھ اٹھا کر اسے اجازت دی...... تو وہ پلٹ کر کچن کی طرف چل دی۔ یہی درست وقت تھا کیونکہ اسی وقت صاحبہ مرزا کو باقاعدگی سے دودھ کے ساتھ دوا لینی ہوتی تھی۔ اور تھوڑی ہی دیر میں دودھ کا گلاس صاحبہ کی سائڈ ٹیبل پر موجود تھا۔

☆☆☆

فرحان آغا نے محمل کو غور سے دیکھا۔ جوانی کا بانکپن، چہرے پر تازگی، فیروزی رنگ کے دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ کھلا پڑا تھا۔ آغا کو حیرت تھی کہ اس سے پہلے وہ محمل کو اس طرح سے کیوں دیکھ نہ پائے تھے۔
وہ عثمان کے ساتھ لان میں کرکٹ کھیل رہی تھی۔
بار، بار سرکتے دوپٹے کو اس نے گلے اور کمر میں ترچھا ڈال کر گانٹھ لگائی اور بال کروانے کو ہاتھ فضا میں اٹھائے تو ''سن روم'' میں بیٹھے فرحان آغا کی دل کی دنیا میں ہیجان برپا ہو گیا۔ وہ اندر سے سارا منظر تمام تر دلکشی سمیت دیکھ رہے تھے جبکہ باہر لان میں موجود محمل کو علم بھی نہیں تھا کہ آغا کی نظریں اس کا طواف کر رہی ہیں۔

☆☆☆

محمل کو لانے کے بعد صاحبہ نے ایک پُرسکون سانس خارج کی ہی تھی کہ سکینہ نے اسے بی بی جان کا پیغام دیا۔ وہ انہیں اپنے کمرے میں بلا رہی تھیں۔

ہری مرچیں

☆ کنوارے کی ایک دن کی زندگی...... شادی شدہ مرد کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔
☆ ساس کو آنچ نہیں۔
☆ ساس دیکھو ساس کی مار دیکھو۔
☆ کسی دشمن کو بد دعا دینے کو دل چاہے تو کہہ دیں کہ اللہ کرے تمہاری ساس تمہارے پاس مستقل طور پر رہنے کے لیے آجائے۔

مرسلہ: شہناز رانا، گوجرانوالہ

''جی بی بی جان...... کوئی خاص بات تھی کیا؟'' وہ مؤدب انداز میں اجازت لے کر بی بی جان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بولیں۔
''چھوٹی دلہن......! یہ لڑکی آپ پوری طرح سوچ سمجھ کر گھر لائی ہیں۔'' انہوں نے تسبیح کو ایک طرف رکھ کر صاحبہ کو استفہامیہ انداز میں دیکھا۔
''اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا بی بی جان۔ ہمیں یہی مناسب لگا۔'' اس نے الجھن بھری نظروں سے ان کو دیکھا۔
''ہماری اجازت نہ سہی...... مشورہ تو لے لینا چاہیے تھا آپ کو۔ ہو سکتا ہے ہم اس کی اجازت آپ کو دینا پسند نہ کرتے۔'' بی بی جان کے لہجے میں ہمیشہ والی شفقت مفقود تھی۔
''مجھے نہیں لگتا کہ اپنے گھر میں کسی کو لانے کے لیے ہمیں کسی کی اجازت کی ضرورت ہے۔'' صاحبہ کے لہجے میں تلخی اُنڈ آئی۔
''میرا تجربہ کہتا ہے صاحبہ دلہن! آپ خسارے کا سودا کر بیٹھی ہیں۔ کہیں کچھ ایسا نہ کر بیٹھی ہوں جو آپ کو زندگی بھر کا پچھتاوا بخش دے۔'' اب کے بی بی جان نے اس پر ایک ترس بھری نظر ڈالی۔
''ایک بے ضرر لڑکی سے کیا تحفظات ہیں آخر آپ کو اور رہی بات خسارے کی تو آپ سے بہتر کون جانتا ہے بی بی جان کے جو خسارہ میرے حصے میں آیا

ہے اس سے اور بڑے خسارے کیا ہوں گے۔ جو میں لٹا چکی ہوں اس سے زیادہ کتنا لٹاؤں گی۔'' مضبوط شخصیت کی مالک صاحبہ کا لہجہ ٹوٹتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں گیلی نہیں ہوئی تھیں لیکن اس کا لہجہ نم نم تھا۔

''ہم نے آپ کے خسارے کو مقدور بھر بھرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس وقت آپ ہماری بات سمجھ نہیں پا رہی ہیں۔ آپ کو لگتا ہے کہ آپ زندگی کے جوئے میں سب گنوا چکی ہیں...... لیکن آپ خود بھی نہیں جانتیں کہ زیست کے چکر میں کون سے موڑ پر کیا چیز آپ کے لیے ایک بار پھر اتنی نایاب ہو جائے کہ آپ کو پچھلا خسارہ اس کے سامنے بہت کم لگے ....''

بی بی جان نے ان کو تنبیہ بھرے انداز میں کہا۔

''بی بی جان، ہم شاید اصل موضوع سے ہی ہٹ گئے ہیں۔ آپ ہمیں بتائیں کہ کیا ہم اس لڑکی محمل کو حالات کے حوالے کر دیں۔ اس کی زندگی کو خطرہ ہے۔ کیا آپ ہماری جگہ ہوتیں تو اسے چھوڑ دیتیں؟''

''ہم جو آج دیکھ رہے ہیں اگر چند سال پہلے بھی اسی نظر سے دیکھتے تو ہاں...... چھوڑ دیتے۔'' بی بی جان نے دم بھر کو رک کر سفا کی سے کہا۔

''اوہ...... جانتی ہیں آپ کے جواب سے ہمارے دماغ میں کیا خیال آیا...... سمندر کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اس کا کھارا پانی پیاسے کی پیاس بجھانے سے قاصر ہی رہتا ہے اور کنواں کتنا بھی چھوٹا ہو اس کا پانی اعلیٰ ظرف ہوتا ہے، پیاس بجھا دیتا ہے۔'' وہ تاسف بھرے لہجے میں بی بی جان سے مخاطب ہوئی۔

''درست کہا آپ نے...... لیکن کبھی سمندر کا سینہ چیرتی کشتی میں لمبا سفر کر کے دیکھیے گا پتا چلے گا کتنے بھید چھپائے بیٹھا ہے۔ کتنا اسرار ہے اس کی وسعتوں میں...... بہرحال آپ کی مرضی ہے...... کل کو یہ بے ضرر لڑکی کسی ضرر کا باعث بنے تو سود و زیاں کا کھاتا مت کھولیے گا...... اپنے دلائل کو سامنے رکھ کر آگے بڑھ جایئے گا۔'' بی بی جان نے تسبیح اٹھا کر آنکھیں بند کر لیں اور ہلکی سی پشت بیڈ کے کراؤن سے لگا لی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ مزید بحث کے موڈ میں نہیں ہیں۔

صاحبہ مرزا نے ایک الجھن بھری نظر ان پر ڈالی اور سر جھٹک کر وہی ملکہ کا سا کرّوفر چال میں لاتے ہوئے گردن اٹھا کر باہر کی طرف بڑھی۔

☆☆☆

درد کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ صاحبہ کا سارا جسم پسینے سے بھر گیا تھا۔ اب جبکہ اس ننھی سی جان کے اس دنیا میں آنے کو ایک ماہ رہتا تھا اور آٹھویں مہینے میں یہ لیبر پین کچھ اچھی علامت نہیں تھی۔ پہلے تو وہ ہلکے سے درد کو نظر انداز کرتی رہی ہیں لیکن اب درد برداشت سے باہر ہو چکا تھا صاحبہ نے زور سے سکینہ کو آواز دی اور جب تک سکینہ کمرے تک پہنچی صاحبہ لہرا کر گرتی چلی گئی۔ اس کے بعد وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ فرحان آغا گھر پر ہی تھے جلدی سے بازوؤں میں اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور اسپتال کے لیے روانہ ہوئے۔

زیتون بانو نے ایک بار آغا کی بانہوں میں صاحبہ مرزا کو دیکھا تو سرتاپا سلگ گئیں لیکن دوسرے لمحے صاحبہ کے پیلے پڑتے چہرے کو دیکھ کر ایک فاتحانہ مسکراہٹ ان کے لبوں پر آ گئی۔

''آغا تم نے صاحبہ کو میرے ساتھ شراکت دے دی لیکن عثمان کو کسی سے شراکت نہیں سہنے دوں گی۔'' انہوں نے ضمیر سے اٹھتی ملامت کو اس تاویل سے دبانے کی کوشش کی۔ اور جلدی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ یہ جانے بغیر کہ اب زندگی بھر ان کی روح انہیں کچوکے لگاتی رہے گی۔ اور وہ عمر بھر اس ایک گناہ کی سزا ڈھوتی رہیں گی۔

☆☆☆

''یہ ظلم ہے آغا آپ ایسا نہیں کر سکتے؟ بار، بار میرے ساتھ ہی یہ حق تلفی کیوں؟'' زیتون بانو کی آواز بلند ہو گئی تھی۔

''آپ جانتی بھی ہیں حق تلفی کیا ہوتی ہے۔ آپ کو شرم آنی چاہیے اپنے عمل پر...... آپ نے قتل کیا ہے، کوکھ اجاڑی ہے ایک عورت کی جو میری زوجیت میں

ہے اس کو بنجر کر دیا ہے اب اس کی سزا یہی مناسب ہے کہ آپ آج کے بعد عثمان کی ماں نہیں کہلائیں گی اور نہ ہی عثمان آغا کی پرورش کا حق ہم آپ کو دیں گے۔ گھر کی اقدار اجازت نہیں دیتیں ورنہ ہم آپ کو سزائے موت دلواتے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے عدالتوں میں ہمارے گھر کی عورتوں کے نام اور کردار اچھالے جائیں۔ ہم آپ کو چھوڑ دیتے ہمیشہ کے لیے...... لیکن بی بی جان نے جو وعدہ آپ سے کیا تھا ہم اس وعدے کو نبھانے کا عہد کر چکے ہیں۔ شکر منائیں آپ اسی گھر میں ہیں۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ آپ عثمان کو دیکھنے سے بھی محروم ہو جائیں؟"

زیتون بانو سن کھڑی تھیں۔ جلدی سے آگے بڑھ کر فرحان آغا کے پاؤں تھامے لیکن وہ ان کے ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھ گئے۔

زیتون بانو نے دالان کے کونے میں خاموش بیٹھی بی بی جان کو شکوہ بھری نظروں سے دیکھا۔ صاحبہ اسپتال سے واپس لوٹی تھیں تو دو بری خبریں لے کر کہ وہ بچی کی ماں بننے سے محروم رہ گئی تھیں اور دوسری خبر اس سے بھی تکلیف دہ تھی کہ وہ اب کبھی ماں بن ہی نہیں سکتی تھیں۔

زیتون بانو نفرت کی آگ میں جھلس کر جو کر چکی تھیں۔ اب اس پر پچھتا بھی رہی تھیں، یہ پچھتاوا ان کو چین نہیں لینے دے رہا تھا وہ جلے پیر کی بلی کی طرح اندر باہر گھوم رہی تھیں۔ اور بی بی جان ان کی بے چینی کو تاسف سے دیکھ رہی تھیں۔ اور ان کی آنکھوں میں چھپے چور نے ماضی کی عفت آرا کو ان کے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ یہ غلطی جو زیتون نے کی تھی وہ اس کو فوراً پہچان اسی وجہ سے گئی تھیں کیونکہ وہ خود ان غلطیوں کو ایک بار نہیں بار، بار دُہرانے کا بوجھ دل پر لیے پھرتی تھیں۔ راتوں کو رو، رو کر مصلے گیلے کر کر کے بھی ان کے دل سے پشیمانی نہیں جاتی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا ان کی سوکنیں بانجھ نہ تھیں بلکہ عفت آرا (بی بی جان) نے انہیں یونہی بانجھ بنا دیا تھا۔ لیکن زندگی کے اس حصے میں آ کر اپنے اعمال کے ترازو میں وہ جتنی بھی عبادت ڈالتی تھیں ان کے گناہوں کا پلڑا ہمیشہ بھاری ہی رہتا تھا۔ وہ اندر ہی اندر سلگتی تھیں لیکن ان کی انا انہیں اعترافِ جرم سے روکتی رہی اور زندگی کے اس موڑ پر جب وہ خاندان، برادری اور اپنے بیٹے، بہوؤں میں اتنی قد آور شخصیت کی مالک بن چکی تھیں۔ اپنی زندگی کا تاریک پہلو دکھانا ناممکن امر بن چکا تھا لیکن اب جبکہ وہ جانتی تھیں زیتون بانو کو انہیں پہلے موڑ پر ہی اعتراف کرنے پر مجبور کرنا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ جس سولی پر وہ عمر بھر لٹکی تھیں اب زیتون بھی اس کا حصہ بنے...... روز جینا اور روز مرنا آسان ہرگز نہیں تھا۔

"زیتون مجھے تم سے ہرگز یہ امید نہیں تھی۔" انہوں نے دانستہ لہجے میں دبدبہ پیدا کیا۔

"کیا، کیا میں نے بی بی جان......؟ صاحبہ کے نصیب میں بچہ نہ تھا تو میرا اس میں کیا قصور......؟" کہنے کو تو زیتون نے کہہ دیا لیکن جھوٹ نے ان کو نگاہیں جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"تم انکار کر کے اپنے کیے ہوئے گناہ سے نظر نہیں چرا سکتی ہو۔ میں جانتی ہوں تم نے کیا، کیا اور کس کے ذریعے کیا۔ لیکن زیتون بانو تم یہ جان لو کہ اس جھوٹ کا حساب تم نے ساری عمر چکانا ہے، پل، پل مرنا ہے...... ہم انسان آدھے فرشتے ہوتے ہیں آدھے ابلیس...... لیکن جب ہم ابلیس کو اپنے اوپر حاوی کر لیتے ہیں تو ہر جرم، ہر گناہ ہمارے لیے بہت چھوٹا ہو جاتا ہے لیکن جب ہمارے اندر کا معصوم فرشتہ اس گناہ پر ہمیں سرزنش کرتا ہے تو ہم عمر بھر کے لیے اپنی نظر میں ہی مطعون ٹھہر جاتے ہیں۔"

"مجھے نہیں پتا ہے کہ آپ کو کیسے سب معلوم ہوا لیکن یہ سب کر کے میں خود بھی عذاب ہی میں ہوں...... بی بی جان۔" اس نے اضطراب سے دونوں ہاتھوں کو مسلتے ہوئے اعتراف کیا۔ گویا ہار مان لی۔

"تمہیں اس سب کا اعتراف کرنا ہوگا زیتون...... جلد یا بدیر فرحان آغا کو اس کا علم تو ہو ہی جائے گا تو بہتر ہی ہوگا کہ تم خود انہیں بتا دو...... اگر تم اس احساسِ جرم

کو کم کرنا چاہتی ہو تو عمل بھی کرنا ہوگا...... معافی دینا ہی مشکل نہیں ہوتا، میں مانتی ہوں...... معافی طلب کرنا بھی دقت طلب ہے۔ لیکن ذات کی تکمیل کے لیے عمل کے پل صراط پر سے گزرنا پڑتا ہے اور عمل کے پل صراط پر سے سچائی کی لاٹھی کے بغیر گزرنا ناگزیر ہے۔ اس لاٹھی پر آگے نفرت کے کانٹوں سے ہاتھ لہولہان بھی ہوجائیں تو سفر نہیں رکتا۔ اب تمہارا فیصلہ ہے کہ تم عمر بھر اس جھوٹ کے تازیانے سہنا چاہتی ہو یا سچ بول کر اپنا گناہ بخشوانا چاہتی ہو۔'' زیتون بانو نے لحظہ بھر کو بی بی جان کو دیکھا جیسے ان کی آنکھوں میں اپنا آپ تلاش کر رہی ہوں، بی بی جان نے نگاہیں جھکالیں۔

اس کے اعترافِ جرم پر فرحان آغا کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا، انہیں اپنی یہ نورِ نظر بیوی اس وقت دنیا جہان کی ہر غلیظ چیز سے زیادہ مکروہ لگ رہی تھی لیکن وہ اس کے اعتراف سے پہلے ہی بی بی جان سے یہ وعدہ کر چکے تھے کہ وہ زیتون بانو سے اپنا ازدواجی بندھن نہیں توڑیں گے اور قانونی چارہ جوئی بھی نہیں کریں گے۔ لیکن وہ بھی نواب فرحان آغا تھے انہوں نے زیتون کے بیٹے عثمان کو صاحبہ کے حوالے کر کے ایک طرح سے اس کے نقصان کی تلافی کی تو دوسری طرف زیتون بانو کو اس کے کیے کی ایسی سزا دی جو موت سے بھی بدتر تھی۔

☆☆☆

صاحبہ کو پہلے پہل عثمان کو دیکھ کر زیتون بانو کی سفاکی یاد آتی تو اس کا دل چاہتا کہ وہ زیتون بانو کو بھی اسی کرب سے گزارے...... وہ عثمان کو ختم کردے لیکن جانے کب وہ معصوم فرشتوں سا بچہ اس کے لیے آکسیجن کی طرح ضروری ہوگیا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا وہ پوری طرح عثمان میں مگن ہو کر دل جمعی سے اس کی پرورش میں مصروف ہوگئی۔

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ماں کی دن رات جانفشانی سے کی گئی تربیت نے عثمان کی شخصیت میں شہزادوں جیسی آن بان پیدا کردی لیکن اب اس کی زندگی کا محور و مرکز عثمان ایسا بنا کہ کب فرحان آغا کسی اور راہ کے مسافر بن گئے اسے علم بھی نہ ہوسکا۔

☆☆☆

محمل ''نواب محل'' میں ہراساں ہرنی کی طرح رہ رہی تھی۔ اسے انتظار تھا کہ سانول جلد اس کے بھائی سے بات کر کے اس کو اپنا لے گا۔ تب وہ اپنی ایک چھوٹی سی دنیا بسا لے گی۔ لیکن سارے سپنوں کا تاج محل اس وقت زمیں بوس ہوگیا جب اسے علم ہوا کہ سانول تو یہ دنیا ہی چھوڑ چکا ہے۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو بھائی' وہ شیراز سے لپٹ کر رو دی۔ اس دن کے بعد شیراز سے اس کی ملاقات آج نواب محل میں ہوئی تھی۔ وہ بھی رات کے اندھیرے میں چھپ کر یہاں آیا تھا۔ اور اس کے جانے کے بعد گاؤں میں کیا ہوا تھا اس نے محمل کو سب بتایا تھا۔

''تمہیں اپنے آپ کو سنبھالنا ہوگا۔'' صاحبہ نے اس کو اپنے ساتھ لگا کر تسلی دی تھی۔ ''اب شیراز بھی یہاں نہیں رہ سکتا۔ یہ بھی برطانیہ جا رہا ہے۔'' صاحبہ نے گویا دھماکا کیا تھا۔ وہ ہق دق شیراز کا منہ دیکھ رہی تھی۔

''ہاں موی! اب میں گاؤں نہیں جارہا، بابا مجھ پر دباؤ ڈالتے ہیں کہ بتادوں تم کہاں روپوش ہو۔ ان کے اندر کا ضدی دیہاتی اپنے آپ کو ہر صورت محفوظ دیکھنا چاہتا ہے۔ جیسے ہر مردانہ سوچ کا حاوی معاشرہ عورت کو ڈھال بناتا ہے ایسے ہی وہ بھی تمہیں ان کے حوالے کر کے چین سے سونا چاہتے ہیں۔ اور میں یہ سب برداشت نہیں کرسکتا۔ اس سے پہلے کہ وہ سب مجھ سے بابا کی طرح سوال کرنا چھوڑ دیں اور اپنے مالکوں کی وفاداریوں میں مجھے بھی ان کے حوالے کردیں۔ مجھے ایک کمزور مرد کی طرح یہی مناسب لگا کہ میں یہ ملک ہی چھوڑ دوں......'' اس کی بات کے اختتام سے پہلے ہی محمل نے زار و قطار رونا شروع کردیا تھا۔

''تو میرا کیا ہوگا بھائی؟ میں کہاں جاؤں گی؟''

''تم کہیں نہیں جاؤ گی تم اس وقت تک یہیں رہو گی جب تک میں تمہیں وہاں بلانے کے انتظامات نہ کرلوں جہاں میں خود جارہا ہوں، اس وقت تک تم اس

گھر کی چار دیواری سے قدم بھی باہر نہیں نکالو گی...... مجھ سے وعدہ کرو......" وہ روہانسا ہوا۔

"آپ بے فکر رہیں شیراز...... محمل یہاں پوری طرح محفوظ رہے گی، یہ میرا وعدہ ہے...... اور آپ کو وہ وعدہ یاد ہے ناں جو آپ نے مجھ سے کیا ہے۔" صاحبہ کے انداز میں بے چینی تھی۔

"بالکل صاحبہ جی...... ! مجھے آپ کے احسان کا قرض چکانا ہے، چاہے میری عمر اس میں تمام ہو جائے۔ ماہِ کامل میرے لیے محمل سے کم ثابت نہ ہو گی ان شاء اللہ......"

☆☆☆

گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے نیلی جھیلوں میں آنسوؤں کا جہان آباد کیے وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر یوں ساکت بیٹھی تھی جیسے کوئی مجسمہ ہو۔ دالان سے باہر آتے فرحان آغا نے اس کی طرف دیکھا جو اُن کی آمد سے بالکل بے خبر تھی۔ جیسے وہ اس کارِ جہاں کے ہر عمل سے لاتعلق ہو۔ اس کی گھنی سیاہ پلکیں ساکت تھیں۔

فرحان آغا دھیرے، دھیرے چلتے ہوئے اس کے پاس آئے۔ اور پھر زندگی میں پہلی بار وہ زمین پر بیٹھنے کو جھکے ہی نہیں اس کے برابر بیٹھ بھی گئے۔ ان کے پاس بیٹھنے پر وہ چونکی اور دھیرے سے کھسک کر پرے ہوئی۔

"نواب صاحب آپ...... آپ کب آئے اور آپ یوں نیچے کیوں بیٹھے؟" وہ ٹپٹا گئی تھی۔

"ہمارے خیال میں اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اور آج ہمیں محسوس ہوا۔ کہ زمین پر بیٹھنا بھی کوئی برا تجربہ نہیں بلکہ یوں ڈوبتے سورج اور ڈھلتی دوپہر کا سرمئی شام سے ملاپ کا منظر کافی دلچسپ ہے جس کو یہاں بیٹھ کر دیکھنا بڑا ہی خوب صورت عمل ہے۔"

انہوں نے محمل کی طرف ایک محبت بھری نظر ڈالی اور محمل جو سانول کی موت کے بعد بے حد ڈپریشن میں تھی، اس محل جیسے گھر میں تنہا اِدھر اُدھر بھٹکتی پھرتی تھی۔ صاحبہ جو عثمان کی مصروفیات میں اس کو یوں بھول گئی تھیں جیسے وہ کوئی شوپیس ہو۔ عثمان بھی جب سے صاحبہ کی نگرانی میں گیا تھا۔ وہ بھی اب صاحبہ کی طرح ڈسپلین کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ جو محمل کے ساتھ کرکٹ کھیلتا تھا اب وہ بھی ان آداب کے منافی ہو گیا تھا جو صاحبہ نے اس کو سکھائے تھے۔ صاحبہ نے یہاں کے لوگوں کے ساتھ تعلقات رکھنے کے لیے محمل کے لیے کچھ حدود متعین کی ہوئی تھیں۔ اور محمل کو پناہ دینے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ صاحبہ یا اس کے لاڈلے بیٹے کے ساتھ اتنی بے تکلفی کی حق دار ہو سکتی تھی۔ لیکن اسے خبر نہ تھی کہ تقدیر نے اسے صاحبہ کے مدِمقابل لا کھڑا کرنے کا فیصلہ کر ڈالا ہے۔ کہانی ایک بار پھر دُہرائی جانے لگی تھی۔ سب کردار بدل گئے تھے۔ سوائے فرحان آغا کے۔ اور مرد کے پاس تو ہر بار کے لیے جواز دینے کے لیے ایک زنبیل موجود رہتی ہے۔ آغا کے شب و روز محمل کے گرد منڈلانے میں گزرنے لگے اور کم عمر محمل رشتوں سے دوری، تنہائی اور غم کے ان لمحات میں آغا کی طرف سے ملنے والی دلجوئی اور توجہ کو اپنا حق سمجھ کر وصولنے لگی تھی۔

اس بار زیتون بانو نے کچھ خاص احتجاج نہ کیا۔ وہ بارہا آغا کو محمل کے ساتھ ہنستے، کھلکھلاتے دیکھ چکی تھی۔ کبھی لان میں رکھی چیئرز پر بیٹھے محمل کے سنہری بالوں کو سنوارتے تو کبھی اس الھڑ جوان لڑکی کے ساتھ باہر آتے جاتے۔ لیکن اس نے احتجاج نہیں کیا گو وہ آغا کے چہرے پر آتے رنگ سے آشنا تھی۔ لیکن وہ تو محبت میں پہلے بھی شراکت کا درد سہہ کر پتھر ہو چکی تھی۔ اس وقت بھی وہ لان کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ جب سے صاحبہ نے اعلیٰ تعلیم کے نام پر عثمان کو ملک سے باہر بھیجا تھا وہ اور بھی بجھ گئی تھی وہ جو کبھی کبھار عثمان کا چہرہ دیکھ لیتی تھی۔ اب محض اس کی جدائی میں تڑپتی تھی۔

☆☆☆

اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو چاند کی روشنی میں الٹ پلٹ کر دیکھتی نہ جانے وہ کن سرابوں کے سفر میں تھی۔

دھیرے، دھیرے چلتی صاحبہ مرزا اس کے پاس آکر تھم گئی۔ سر اٹھائے بغیر بھی وہ جان گئی تھی کہ صاحبہ مرزا ہے، اس کے آنے سے پہلے اس کے پرفیوم کی خوشبو اس کے

آنے کا پتا دے دیتی تھی۔ صاحبہ نے اس کے مدِ مقابل ستون سے ٹیک لگا کر دونوں بازو سینے پر لپیٹ لیے۔

''تم جانتی ہو زیتون...... ! آغا ایک بار پھر تم پر سوتن لا رہے ہیں؟'' صاحبہ نے سرد لہجے میں خاموشی کو توڑا۔

''مجھ پر نہیں صاحبہ مرزا، آپ پر...... ہم پر تو سوتن کا عذاب پرانا ہو چکا ہے۔ میں اس دور سے گزر چکی ہوں۔ اب کی بار یہ درد آپ کا ہے، ہمیں اس میں شامل مت کیجیے گا۔ ہم تو آپ کے ہاتھوں اپنی آخری متاع بھی کھو چکے ہیں۔'' زیتون بانو کے لہجے میں درد چیخ رہا تھا۔

''مت بھولیں زیتون آپ نے ہمارا نا قابلِ تلافی نقصان بھی کیا ہے۔ ہم وہ وقت نہیں بھولے ہیں۔ اگر آپ اس وقت ہمارا وہ نقصان نہ کرتیں تو آج آغا کے پاس ایک اور عورت لانے کے مضبوط جواز نہ ہوتے۔''

''جانتی ہوں ان مردوں کو...... جو کچھ میں نے کیا، اس کا اعتراف اور اس کے لیے آپ سے معافی طلب کرتی ہوں، عثمان سے دستبرداری کوئی بھی چیز آپ کے خسارے کی تلافی نہیں بن سکتی یا کم از کم میرے کیے کو بھلانے کو کافی نہ تھی۔'' زیتون نے کڑی نظروں سے صاحبہ کے چہرے کو دیکھا۔

''ہاں نہیں تھی کافی...... اگر کافی ہوتی تو آغا ہماری تذلیل نہ کرتے...... یہ نہ کہتے کہ ہم عثمان کو، اس کا بھائی، بہن نہیں دے سکتے۔ آپ جانتی ہیں کہ میری گود میں آنے والی اولاد جو دنیا سے رخصت ہوئی وہ صرف آپ کی وجہ سے...... آپ کے حسد نے مار ڈالا اسے۔ آج اس کی کمی کا رونا رو رہے ہیں آغا...... انہیں بیٹی چاہیے...... وہ کہتے ہیں کہ وہ بیٹی کی شدید خواہش کو پورا کرنے سے قاصر عورت کے لیے اپنی خواہش سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔'' صاحبہ مرزا بلبلا اٹھی۔ ایک چٹان جیسی عورت بھربھری مٹی کی طرح ڈھیر ہوئے جا رہی تھی۔

زیتون بانو نے اچنبھے سے دیکھا صاحبہ مرزا اور آنسو؟ کیا یہ عورت جس کی نزاکت، مضبوطی کا جواز لے کر آغا نے اس سے شادی کی تھی آج وہ آکر سامنے کھڑا ہوتا تو زیتون سراپا سوال ہو جاتی۔ کیا فرق تھا آج اس میں اور صاحبہ مرزا میں ایک جیسی بے حال...... سوگوار، دھاڑیں مارتی عورتوں میں کون سا فرق تھا۔

''مردوں کو جواز کی ضرورت نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی جواز بنانے کی صاحبہ مرزا...... اسے اپنی خواہش کو پورا کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ اگر یہ جواز نہ بھی ہوتے تو بھی وہ کچھ اور جواز دیتا۔ کیوں...... جانتی ہیں؟ اس لیے کیونکہ وہ مرد ہے، با اختیار ہے، کچھ بھی نہ ملے تو وہ شریعت کا بات بڑھائے گا لیکن اپنی ہوس کو خواہش سے حق تک ضرور لے جائے گا۔ ایک مرد جو صاحبِ حیثیت ہے جس کی وجاہت میں کمی ہے نہ دولت میں...... بے فکر ہے وہ کب، کب کس، کس کے دل پر پاؤں رکھ کر آگے بڑھ رہا ہے اس سے اسے کوئی غرض نہیں ہوتی۔'' زیتون بانو تھکے، تھکے انداز میں بولتی چلی گئیں۔

''لیکن میں بے اختیار نہیں ہوں...... مجھے آغا پر اختیار نہ سہی لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ میں اسی گھر میں رہ کر آپ کی طرح اس کی نئی بیوی کو برداشت کرتی رہوں...... مجھے میری تعلیم، میری دولت، سہارا دے گی، مجھے کسی مرد کے سہارے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔'' صاحبہ نے ستون کا سہارا چھوڑ کر بے دردی سے اپنے آنسو پونچھے اور ایک ترحم بھری نظر زیتون پر ڈالی۔ ''مجھے یہاں نہیں رہنا۔'' کہہ کر وہ رکی نہیں اور مضبوط قدموں سے چلتی دالان کی طرف بڑھ گئی۔

''تو فرق یہ تھا آغا......'' صاحبہ سمجھتی ہے کہ اس کی دولت اس کی تعلیم اس کی طاقت ہے وہ جہاں چاہے جا سکتی ہے اسے سوتن کو برداشت کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ با حیثیت ہے لیکن وہ نہیں جانتی یہ سب تو وہ بھی کر سکتی تھی۔ وہ عثمان کو بھی بہ آسانی اپنا ہتھیار بنا سکتی تھی۔ چھین سکتی تھی وہ عثمان کو آغا سے چھین سکتی تھی۔ چھوڑ جاتی وہ اس گھر کو...... دولت کی اس کو بھی کمی نہ تھی۔ کتنی غافل تھی صاحبہ، کتنی علم والی لاعلم تھی کہ زیتون کو محبت کی زنجیر سے رہائی ممکن نہ تھی۔ کیسے بتاتیں کہ وہ پانی کے بن مچھلی کی طرح آغا کے بغیر جی

نہیں سکتی تھیں. وہ محبت کے لیے زندہ تھیں اور محبت نے ہی انہیں مار ڈالا تھا۔ وہ سسک پڑی تھیں۔

☆☆☆

''صاحبہ آپ ہماری زوجیت میں ہیں۔ ہماری مرضی کے بغیر آپ کہیں نہیں جاسکتیں۔'' فرحان آغا نے غراتے ہوئے کہا۔

''میں نہ تو کوئی لونڈی ہوں نہ ہی غلام نہ ہی آپ کی رشتے کی کزن کہ آپ کی زیتون بانو کی طرح کے بیک گراؤنڈ کی وجہ سے اپنا استحصال سہتی رہوں...... اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں دوسری عورتوں کو انصاف دلاتی ہوں تو پھر اپنے لیے زندان کا انتخاب کیسے کروں گی۔'' جواباً صاحبہ نے بھی فراٹے سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

''آپ جانتی بھی ہیں آپ اپنے شوہر سے مخاطب ہیں، یہ کون سا طریقہ ہے بات کرنے کا...... آپ کی تہذیب وتمدن کہاں چلا گیا۔ جس سے متاثر ہو کر ہم نے آپ کو اپنی زندگی میں شامل کیا تھا۔'' آغا کے انداز میں بھرپور طنز تھا۔ ''یہی فرق آپ کو میری زندگی میں لایا تھا۔ اس وقت آپ میں اور زیتون بانو میں رتی برابر فرق نہیں محسوس ہو رہا ہے۔ سمجھیں آپ......''

''فرق ہے آغا...... بس آپ اس کو جانچنا نہیں چاہتے ہیں۔ ہم جیسی پڑھی لکھی، روشن خیال عورتوں کے بارے میں آپ کی معلومات ادھوری ہے یا آپ جان بوجھ کر اگنور کر رہے ہیں۔ ہم اپنی زندگی میں اپنی ترجیحات پر چلتی ہیں۔ آپ نے ہمیں پابند کرنے کی کوشش کی تو ہم خلع کا حق رکھتے ہیں۔ ورنہ ہم ایک پڑھی لکھی مغربی سوچ کی عورت کی طرح آپ کو گنجائش دے دیتے ہیں۔ آپ سے سپریشن (علیحدگی) اختیار کیے لیتے ہیں۔'' وہ نخوت سے بولی۔

''آخر آپ کو اعتراض کیوں ہے، مخمل کو آپ ہی لے کر آئی تھیں نواب ولا میں...... وہ آپ کی چہیتی تھی۔ آپ کی جگہ نہیں لے گی، محض ہماری خواہشات پوری کرے گی۔ بے شک اس سے پیدا ہونے والی ہماری اولاد کی پرورش بھی آپ ہی کے ہاتھوں ہوگی۔ ان ہی پڑھے لکھے ہاتھوں سے۔''

''واہ نواب صاحب واہ! تو آپ ہمیں اس گھر کی ایک پڑھی لکھی میڈ کا درجہ دے چکے ہیں اور آپ ہم پر سوتن بھی لا رہے ہیں تو کس کو ہمارے ہم پلہ بھی نہیں۔ ایک جاہل گنوار مزارع کی بیٹی جس کو ترس کھا کر اپنے گھر میں پناہ دینے لائے تھے۔'' صاحبہ نے استہزائیہ انداز میں تالی پیٹتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔

''آپ جو مرضی کرلیں۔ لیکن ہماری بات یاد رکھیں کہ اس گھر کی دہلیز سے باہر پاؤں نکالنے کا مطلب ہوگا۔ عثمان آپ کا کچھ نہیں لگتا۔'' آغا نے ترپ کا آخری پتا شو کر دیا اور صاحبہ کی پیلی پڑتی رنگت اور ڈھیلے پڑتے ہاتھوں نے یہ بتا دیا کہ وہ بازی جیت چکے ہیں۔

''اسی دن کا ڈر تھا صاحبہ بہو ہمیں...... آپ ہماری...کو کھ جنی نہیں ہیں لیکن میں بھی عورت ہوں...... عورت کا دکھ جانتی ہوں...... آپ سے پہلے زیتون کے دکھ کو بھی بانٹا ہے لیکن وہ تو ایک کمزور عورت تھیں اور بے خبر بھی...... اپنی طاقت اپنے حسن اور بچپن کی محبت اور خاندان کی پشت پناہی کو سمجھتی رہی تھیں لیکن آپ؟ آپ کس زعم میں رہیں۔'

''کیا میں......؟ کیا بی بی جان میں بھی عورت ہوں گوشت پوست سے بنی ہوئی۔ دل سے بیاہ کر لائے تھے مجھے اتنے لوگوں کی موجودگی میں۔ زیتون کا جانتے ہوئے ہم نے سمجھوتا کیا تھا۔ لیکن نکاح نامے میں ہرگز یہ نہیں لکھا تھا کہ میں ان کو مزید شادیوں کی اجازت بھی دوں گی۔'' صاحبہ نے جارحانہ لہجے میں احتجاج کیا۔

''دھیرے بہو بیگم! آپ یہ مت بھولیں آپ ہم سے مخاطب ہیں اور یاد کریں جب یہ مخمل نامی حسین فتنہ آپ خود اس گھر میں لے کر آئی تھیں۔ تو میں نے آپ کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ لیکن اس وقت آپ پر اپنے دوست کی مدد کا بھوت سوار تھا۔ اب اپنی خوبیوں پہ حاوی ہوتا مخمل کا کم عمر حسن دیکھ لیں اور سچ مانیں تو معاملہ فہم اور دور اندیش تو آپ بھی نہ نکلیں۔''

بہترین انسان...... دلشاد نسیم، لاہور

جب میں نے لکھنا شروع کیا اس وقت پرچہ معراج صاحب کے ہاتھ سے ہو کے نکلتا تھا۔ یہ وہ سنہرا دور تھا جس نے بہت سی نامور افسانہ نگاروں کی آبیاری کی۔

معراج صاحب بذاتِ خود ایک بہترین انسان تھے اور سچ تو یہ ہے کہ ہم جیسے نئے لکھنے والوں کو بہت کشادہ دلی سے ویلکم کہتے۔ بغیر کسی سفارش اور بنا کسی مشکل کے اچھا افسانہ پرچے کی زینت بن جایا کرتا تھا۔ میرا پہلا ناول پاکیزہ ہی میں چھپا۔ اور یہی نہیں کئی یادگار افسانے بھی۔ معراج صاحب کو دنیا سے گئے دو سال ہو چکے ہیں مجھے یقین ہے ان کا لگایا ہوا پیڑ جس کا نام پاکیزہ ہے پھلتا پھولتا رہے گا اور ہمیشہ برگدی چھاؤں دیتا رہے گا ان شاء اللہ۔

اللہ تعالیٰ معراج صاحب کو اپنی رحمتوں میں رکھے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

بھائی معراج رسول...... حدیث اختر، بہاول پور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترجمہ: اسی خاک سے ہم نے تم سب کو پیدا کیا اسی میں ہم تم کو لوٹائیں گے اور اسی میں سے تم کو نکال کھڑا کریں گے آخری بار (بروز قیامت) یہ ہے وعدہ ازل سے۔" (سورۂ طٰہٰ آیت 55 پارہ نمبر 16)

دو سال ہو گئے پیاری آپی عذرا کیا واقعی؟ یا دو صدی.. جدائی کا زہر پیتے گزر گئیں...... ہمارے گھر بھائی

بی بی جان نے توقف کیا۔

"میں جاننا چاہوں گی کہ میری کم فہمی کیا ہے۔" صاحبہ کی آنکھوں میں تحیر تھا۔

"آپ نے غور کیا کہ اگر زیتون بانو کا حسن...... خاندان، خون کا رشتہ، بچپن کی منگیتر ہونا بھی آغا کو آپ سے شادی کرنے سے نہ روک پایا اور معذرت کہ وہ بہت سی باتوں میں آپ سے بڑھ کر تھی تو آج جب آپ دونوں کے حسن پر بھاری پڑتا حسن اور نوجوانی آغا کے سامنے ہے۔ زیتون کی آغا سے بے پروائی بھرا احتجاج اور آپ کی نزاکت بھری علیحدگی نے آغا کو آپ دونوں سے دور کیا ہے تو آپ دونوں بھی اس کی ذمے دار ہیں۔"

صاحبہ نے بی بی جان کو جواب میں کچھ نہیں کہا لیکن اس کے چہرے پر پڑے بل اس بات کی نشانی تھے گویا اس کو بی بی جان کی باتیں سخت ناگوار گزری ہیں۔

☆☆☆

اُدھر محمل نے خوب صورت سرخ لباس زیب تن کیا اِدھر زیتون بانو نے سفید لبادہ اوڑھ لیا۔ لیکن اس دل کا کیا کریں۔ وہ تو پہلے بھی اس جیسی ہی ایک رات کے کرب سے گزری تھیں پھر آج دوبارہ کیوں درد کے صحرا میں ننگے پاؤں تھی۔ چوڑیوں سے ہاتھوں کو آزاد کرتے لمحے بھر کو انہیں رکنا پڑا۔

"زیتون آپ کی گوری کلائیوں میں چوڑیاں کتنی جچتی ہیں۔ انہیں کبھی خالی مت رکھیے گا چاہے ہم ہوں یا نہیں۔"

"اللہ نہ کرے آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں آغا......" اس نے بے تابی سے فرحان آغا کے لبوں پر کپکپاتا ہاتھ رکھا۔ فرحان آغا نے دھیرے سے اس کے نازک ہاتھوں پر بوسہ دیا اور اس کے ہاتھوں میں پڑی... روپہلی چوڑیوں سے کھیلنے لگے بار، بار ان کی کھنکھناہٹ سے لطف اندوز ہوتے۔

"اُف توبہ! آپ تو ابھی تک بچے ہیں آغا۔" وہ کھلکھلائی۔

"اچھا تو ہم بچے ہیں، بڑے نہیں ہوئے ہمیں ثابت کرنا ہی پڑے گا کہ ہم بچے نہیں ہیں۔" وہ اس کی طرف جھکے۔

سی کی آواز سے سسکاری زیتون کے منہ سے

معراج رسول کب آئے جب سے ہوش سنبھالا اپنے اباجی کو سسپنس اور جاسوسی کا قاری پایا۔
چینی نکتہ چینی.. کی مٹھاس پائی پہلے والد خود لطیفے یا کوئی اور اچھی بات سناتے پھر ہم نے خود پڑھنا شروع کردیا۔ پابندی صرف اتنی تھی کہ اپنی پڑھائی کا حرج نہ ہو گھر کا جو بھی کام امی جی کہیں وہ پورا کرنا.. تب ہم کہتے تھے معراج چچا کی چینی۔
پاکیزہ بھی ان کا نام دیکھ کر لینا شروع کیا.. پہلے دوست کے ساتھ شیئر کر کے پھر سن ترانوے میں میاں صاحب نے گھر پر لگوادیا تو پاکیزہ ہماری ماں، بہن دوست اور ناصح بن کے آج تک ساتھ ہے، بہت ساتھ نبھایا تو اس سب کا کریڈٹ میں اپنے بھائی یعنی معراج رسول (چچا، ماموں سب محترم رشتے ان کے ساتھ) کو دیتی ہوں پھر پیاری عذرا آپی اور ساری پاکیزہ ٹیم کو ہمیشہ جو دعا مانگی اب بھی وہی مانگتی ہوں.. اے ربِ کریم ان رسالوں کو چھاپنے، جاری کرنے والے کو ہر اس اچھی بات کا بہترین اجر عطا فرما جو ان سے سیکھ کر ہم برائی سے بچے یا کسی مشکل کو حل کیا، آسانی پائی......ان کو ان کی فیملی اور کام میں معاون تمام ساتھیوں کو اپنی خوشنودی سے سرفراز فرما، آمین......

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم

تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

کبھی بات ہوئی نہ ملاقات پھر بھی دعاؤں میں شامل تو یہی رشتہ آپ سے باپ بھائی جیسا تعلق بناتا ہے جنت الفردوس آپ کا گھر ہو شفاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو ملے اور دیدار الٰہی سے آپ نفع پائیں آمین......

خارج ہوئی اور انہیں ماضی کے خوب صورت لمحات سے مستقبل میں کھینچ لائی۔ چوڑی ٹوٹ کر کلائی میں لگی تھی اور خون کی ایک لکیر ہاتھ اور باقی بچی چوڑیوں کو بھگو رہی تھی۔ زیتون بانو بے حسی سے بہتے خون کو دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

کیا سوچا تھا اور کیا ہوا، کمرا تو وہ بھی بے حد خوب صورت تھا۔ جس میں صاحبہ نے اس کو لا کر ٹھہرایا تھا لیکن آج جس کمرے کی مسہری پر وہ بیٹھی تھی وہ تو کسی محل کی ملکہ ہی کا ہو سکتا تھا۔ قیمتی اشیا ڈیزائنر پردے، مہنگا فرنیچر اور ان سب پر سے گزرتی اس کی نظر ڈریسنگ ٹیبل میں نظر آتے اپنے سراپے پر پڑی۔ سرخ کامدار لہنگے اور زیوروں سے لدی وہ اپنے آپ پر فخر کرتی اپنے نصیب پر نوافل ادا کرتی لیکن چھم سے اس سارے منظر پر کالی گھنیری پلکوں والی کشادہ آنکھیں چھا گئی تھیں۔

’’محمل تم مجھے چھوڑو گی تو نہیں ناں......‘‘ سانول کی گہری نظریں اس کے گورے رنگ کو گلابی کر رہی تھیں۔

’’تو یہ ہر بار کیوں پوچھتا ہے سانول! میں تجھے کیوں چھوڑوں گی، اس بار تو اپنے خاندان کے کسی بڑے کو بابا کے پاس بھیج دے پھر ہم ایک ہو جائیں گے تیرا یہ ڈر بھی جاتا رہے گا۔‘‘ محمل نے نیچی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

’’ڈر ہی تو جاتا نہیں ناں پگلی......اب کچھ کرنا ہی ہوگا بس مسئلہ ہی یہی ہے کہ میرے بڑے اس دنیا میں نہیں ہیں۔ دور کے چچا، تایا، ہوں یا ماموں سب اپنی بیٹیوں کے لیے آس لگائے بیٹھے ہیں۔ میرے لیے تیرا ہاتھ مانگنے کیوں جائیں گے تیرے بابا کے در پر...... ان کو تو میں اپنا داماد نظر آتا ہوں۔‘‘

’’مت ڈر سانول! تو خود بابا سے بات کر لے بس شیراز لالا کو آنے دے، کوئی مار تھوڑی دیں گے بابا، مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں اماں...... بابا......‘‘ وہ چہکی۔

’’تیرے لیے اگر مار بھی ڈالیں تو بھی چلے گا محمل......‘‘ وہ اس کی نیلی آنکھوں کی جھیل میں ڈوب اور ابھر رہا تھا۔

''اُف تو تم نے میرے لیے خود کو مار ہی ڈالا سانول...... آج میں پرائی بھی ہوگئی۔ کیسے آرام سے شیراز لالا نے مجھے فون پر یہ کہہ ڈالا... کہ محمل تو فرحان آغا سے نکاح پر راضی ہو جا، اسی میں تمہاری بہتری ہے۔'' وہ اور بھی سوچتی لیکن فرحان آغا اپنی بھرپور وجاہت لیے کمرے میں داخل ہوئے۔ خوشی اور راحت و آرام بھری زندگی نے آج بھی ان کو بڑھاپے کی طرف بڑھنے سے جیسے روکا ہوا تھا۔ بڑھتی عمر نے گویا ان کی شخصیت میں چار چاند لگا دیے تھے۔ اس وقت بھی خوب صورت... شیروانی میں ان کا لمبا قد نمایاں ہو رہا تھا۔ انہوں نے بھرپور نظروں سے محمل کو دیکھا...... تیسری بیوی تو عورت نہیں کوئی سنگ مرمر کی حسین مورت تھی انہیں لگ رہا تھا کہ وہ تو ہاتھ لگتے ہی میلی ہو جائے گی۔ اس وقت زیتون کی خوب صورتی اور صاحبہ مرزا کی ذہانت سب کہیں پس منظر میں کھو گئی تھیں۔

وہ دھیرے، دھیرے مسہری کے قریب آئے اور مسہری پر بیٹھ کر ہاتھ میں پکڑی انگوٹھی کی مخملی ڈبی کھول کر اس میں جھلملاتی ہیرے کی انگوٹھی محبت سے محمل کی مخروطی انگلیوں کو چوما اور انگوٹھی پہنا دی۔ محمل نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اسے احساس ہوا کہ اماں ٹھیک کہتی تھیں کہ نکاح کا بندھن بندھتے ہی شوہر ساری دنیا سے پیارا لگنے لگتا ہے۔ اس کے کورے، کنوارے جذبوں کو سانول نے نہیں فرحان آغا نے خراج دینا...... تھا، وہ ان کی محبت کی بارش میں بھیگنے لگی۔ فرحان آغا کو محبت نچھاور کرنے کا ہنر آتا تھا رات بھیگ رہی تھی اور محمل کا دل دھڑکنا بھول رہا تھا۔

☆☆☆

بے چینی سے کمرے میں ٹہلتی صاحبہ بار، بار اپنا ماتھا مسل رہی تھی ۔ ''تو یہ تھی آغا تمہاری محبت......؟ محمل کو تو کچھ کہنے کا فائدہ ہی نہیں تھا اس کے پاس تو کوئی چوائس ہی نہیں تھی لیکن مجھے یقین ہے آغا وہ تمہیں شوہر مان لے گی لیکن تم سے محبت کبھی نہیں کرے گی۔

کبھی نہیں...... اگر محمل نہ ہوتی تو کوئی اور ہوتی...... بہر حال آغا تم ڈال، ڈال پھرنے والے پنچھی ہو۔ بھونرے...... جیسی فطرت ہے تمہاری لیکن میں بھی صاحبہ مرزا ہوں۔ تم سمجھتے ہو کہ میں عثمان کی محبت میں یہاں رک گئی ہوں یہ ہرگز نہیں...... میں صاحبہ ہوں...... مجھے اپنی بیٹی کی اپنی کوکھ سے پیدا کی بیٹی کی محبت پابند نہ کر پائی تو عثمان تو میری سگی اولاد بھی نہیں ہے۔ اب میں تمہارے ساتھ اسی گھر میں رہ کر وہ کروں گی جس کا تم نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ یہ صاحبہ مرزا کا تم سے وعدہ ہے بلکہ اپنے آپ سے وعدہ ہے۔''

☆☆☆

فرحان آغا کو محمل کیا ملی گویا وہ دنیا جہان سے بیگانہ ہو گئے۔ ڈھلتی عمر میں کم عمر رفاقت یونہی زنجیر کر لیا کرتی ہے۔ جلد ہی وہ ان کو ایک بیٹے کا پھر سے باپ بنا گئی۔ پوتے کی پیدائش پر بی بی جان کے انداز میں بھی تھوڑی لچک پیدا ہوئی اس کا نام انہوں نے بڑے چاؤ سے عفان آغا رکھا۔

عفان کی پیدائش کے کچھ دن بعد صاحبہ مرزا ایک عرصے بعد محمل کے آمنے سامنے کھڑی تھی۔ دونوں بازوؤں کو سینے پر باندھے وہ ٹکٹکی باندھے محمل کو دیکھ رہی تھی۔

''تم کیا سمجھتی ہو کہ میں نے تمہیں معاف کر دیا۔'' صاحبہ نے ہونٹ کچلتے ہوئے زہر خند لہجے میں محمل کو دیکھا۔

''آپ ادھر بیٹھ کر باتیں کریں صاحبہ آپی......'' محمل نے بے بسی سے صاحبہ کی طرف دیکھا۔

''مجھے آپی مت بولو۔ میں چاہوں تو تمہارے دشمنوں کو بہت پہلے سے خبر کر دیتی لیکن تم نے جو احسان فراموشی کا مظاہرہ کیا ہے، میں اتنی آسانی سے تو تمہیں چھوڑنے والی نہیں ہوں...... میں چاہتی ہوں تم پل، پل سسکو...... روز نئی موت مرو......'' صاحبہ کے لہجے میں سفاکی اتر آئی تھی۔

محمل کے ہاتھ پاؤں سرد ہو رہے تھے۔ صاحبہ کی آنکھوں سے جھانکتی سفاکی نے اسے پریشان کر ڈالا تھا،

وہ جانتی تھی کہ وہ محفوظ نہیں ہے۔ شیراز بھائی بھی صاحبہ ہی کی وجہ سے اسے اپنے پاس بلانے سے قاصر تھے۔ وہ خود بھی انہیں چاہتی تھی کہ اس کے ساتھ، ساتھ شیراز بھی دشمنوں کے ہاتھ لگ جاتا...... یہی تو دھمکی دی تھی صاحبہ نے اسے کہ وہ شیراز کے پاس جانے کا سوچ گی بھی تو...... وہ ہی نہیں شیراز بھی جان سے جائے گا۔ زندگی کی آزمائش تھی کہ ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔

''کبھی، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زندگی کے پل صراط پر توازن رکھنے کو ہمیں پاؤں اپنے دل پر جمانے پڑتے ہیں۔ اسے اب یہیں جینا تھا۔ دو سوتنوں کی نفرت بھری نظروں کا سامنا کرتے یا فرحان آغا کی دل بستگی کا سامان کرنے کو...... اس نے ایک بے بس نظر سے عفان کو دیکھا تو اسے محسوس ہوا جیسے زندگی نے جینے کا ایک بڑا مقصد اس کو سمجھا دیا ہو۔ اس نے جھک کر عفان کو اٹھایا اور سینے سے لگا کر سسکنے لگی۔

☆☆☆

کروٹ پر کروٹ بدلنے کے باوجود نیند تھی کہ آنکھوں کا راستہ بھول بیٹھی تھی۔

ہماری آنکھیں دھواں ہوگئی ہیں
ایک کھارا سا کنواں ہوگئی ہیں
بہنے لگی ہیں لہو کی صورت
رکتی نہیں پل بھر کو رواں ہوگئی ہیں
پہلے تھے تم ہی جہاں ان کے
اب یہ خود اک جہاں ہوگئی ہیں

''زندگی کو فطرت کے مطابق گزارنے میں ہی عافیت ہے۔ غیر فطری انداز میں جب تم فرحان کو اپنی زندگی سے نکال بیٹھی ہو تو یہ راتوں کی بے چینی کیوں زیتون؟''

''میں نے آغا کو اپنی زندگی سے نہیں نکالا خود کو ان سے الگ کیا ہے بی بی جان! صاحبہ کے ساتھ زیادتی مجھے سونے نہیں دیتی...... اور آغا تو اب میری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے صاحبہ سے معافی بھی مانگی تھی بی بی جان...... لیکن اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ معاف بھی نہیں کرے گی اور بددعا بھی نہیں دے گی۔ اس کا حساب اس نے وقت پر چھوڑ دیا۔ میں کیا کروں جو میرے دل کو چین آجائے بی بی جان...... آپ ہی کچھ بتادیں۔''

''اللہ سے لو لگالو بیٹا...... اس حاصل اور... لاحاصل کی کھوج سے نکل آؤ گی۔ جب تم اللہ کو دل کا مہمان بناؤ گی تو دنیا خود ہی تمہاری ہوجائے گی۔'' بی بی جان نے نم آنکھوں سے اس کی اجڑی حالت کو دیکھا۔ کیسے چہچہاتی رہتی تھی زیتون بانو، فرحان آغا کے سنگ...... کتنی محبت تھی دونوں میں، سر سے پیر تک سولہ سنگار کیے اس نوابزادی کے حسن کا کوئی مول نہ تھا۔ کیسا بے مول کردیا حالات نے۔

''میں کوشش کروں گی بی بی جان لیکن میرا دل سجدے میں بھی بے سکون رہتا ہے۔ مجھے محمل کا فرحان کی زندگی میں شامل ہونا بھی برا نہیں لگا...... بی بی جان میں تو ہر حالت میں اپنے آغا سے محبت کرتی ہوں...... عثمان کی یاد بے کل کرتی ہے لیکن یہ وہ واحد سزا ہے جو شاید میرے گناہ کی بھرپائی کردے۔'' اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے بی بی جان کے سینے میں منہ چھپالیا۔

بی بی جان نے اپنے براق دوپٹے سے اپنے آنسوؤں کو صاف کیا۔ ایک ماں، ایک خالہ ایک عورت ٹوٹ رہی تھی دوسری عورت کے غم میں یا اپنے ہی عکس میں اپنے گناہوں کو یاد کرکے۔

☆☆☆

گزرتے وقت نے بہت کچھ بدل دیا تھا لیکن وقت نہیں بدلا تھا تو شیراز کے لیے...... پانچ وقت کا نمازی شیراز زندگی کے فطری تقاضوں کو غیر فطری انداز سے گزارتا چلا آرہا تھا۔ کئی ایما...... لینڈز کیتھرین اس کی زندگی میں آئی اور گئی تھیں۔ اپنی اسی روش کی وجہ سے ماہ کامل کو ہاسٹل میں داخل کروادیا تھا۔ ویک اینڈ پر وہ آتی تو وہ ہر اس چیز کو چھپاتا جو اس کے دماغ میں بنا اس کے پاپا کا بت توڑ دیتی۔ آج بھی وہ آئی ہوئی تھی۔ اپنے ساتھ اپنے یونیورسٹی فیلو عثمان آغا کو لے کر۔

''پاپا میں عثمان کو آپ سے ملانا چاہتی تھی۔ میں

زندگی میں آگے بڑھنا چاہتی ہوں، آج تک میں نے آپ سے کچھ بھی نہیں چھپایا ہے۔ یہ بھی چھپانا نہیں چاہتی، مجھے یقین ہے آپ کو میری پسند پر بالکل اعتراض نہیں ہوگا۔''

شیراز نے سرتاپا عثمان آغا عرف مانی کو دیکھا۔ فرحان آغا کی کاربن کاپی تھا وہ۔ ویسا ہی دراز قد، سرخ و سفید رنگت پر گہرے رنگ کی آنکھیں جو گھنی پلکوں سے مزین تھیں۔ بھرے، بھرے ہونٹوں کے اوپر مونچھیں اور ہلکی سی داڑھی کے ساتھ وہ ایک خوب صورت نوجوان تھا۔ اعتراض کی گنجائش کہاں تھی۔ لیکن گنجائش نکالنی تھی انکار کی کیونکہ سب کچھ اتفاقاً نہیں ہوتا کچھ اتفاقات میں کچھ شاطر دماغ لوگوں کی تدبیر کا بھی ہاتھ ہوتا ہے اور وہ چھپے ہاتھ صاحبہ کے علاوہ اور کس کے ہو سکتے تھے۔ اور شیراز نے دل ہی نہیں دماغ بھی صاحبہ کے ہاتھ گروی رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

کھلکھلاتے ہوئے عفان کو فرحان آغا نے جھک کر پیار کیا۔ آج اس کو اسکول جاتے ہوئے چھ ماہ ہو چکے تھے اور پہلے دن سے لے کر اب تک وہ روزانہ مخمل کے ساتھ ہی اسکول جانے کی ضد کرتا تھا۔ آج فرحان آغا نے اس کو خود اسکول لے جانے کی ضد کی تو عفان نے مخمل کا بھی ہاتھ تھام لیا کہ دونوں کو لے کر جانا ہے لیکن فرحان آغا نے مخمل کی حالت کے پیشِ نظر اسے آنکھ کے اشارے سے مسکرا کر منع کیا۔ وہ جلد ایک بار پھر ماں بننے والی تھی۔ اور اس بار باخبر تھے کہ آغا ایک بیٹی کے باپ بننے والے ہیں ان کی دیرینہ خواہش جلد پوری ہونے والی تھی لیکن عفان تھا کہ مان کے نہیں دے رہا تھا۔

بالآخر ان کو عفان کی ماننی ہی پڑی انہوں نے مخمل کو بازو کے گھیرے میں لیا اور دھیرے سے گاڑی میں بٹھایا۔ گاڑی بہت آہستگی سے اسکول کی طرف رواں دواں تھی۔

☆☆☆

صاحبہ نے اپنے موبائل پر بات کرتے ایک مصروف نظر سے ان کے مخمل کے ساتھ التفات کو دیکھا...... فرحان آغا کو دیکھ کر نفی میں سر ہلایا اور موبائل پر موجود دوسری طرف موجود شخص کو منع کرنا چاہا لیکن پھر کچھ سوچ کر اللہ حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

نواب ولا میں ایک کہرام کا عالم تھا۔ ہر آنکھ آنسوؤں سے نم تھی۔ آج عفان آغا کو اسکول لے جاتے ہوئے کچھ لوگوں نے ان کی گاڑی پر اندھا دھند فائرنگ کر دی تھی۔ ننھے عفان اور ڈرائیور تو موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے تھے۔ جبکہ فرحان آغا اور مخمل موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ بی بی جان تو صدمے کی شدت سے بے ہوش ہو گئی تھیں۔ جبکہ زیتون بانو کی چیخیں چھت کو ہلا رہی تھیں۔ دل دہلا رہی تھیں۔

ایک صاحبہ تھی جو ہر آئے گئے کو دیکھنے کے ساتھ، ساتھ ہر طرف کا دھیان رکھے ہوئے تھی۔ چہرے پر تاسف اور آنکھوں میں اترے آنسوؤں کو دھکیل کر وہ اپنے اعصاب کو یکجا کر رہی تھی۔

''مام ایسے موقع پر میری موجودگی وہاں ضروری ہے۔'' عثمان بے تابی سے فون پر صاحبہ سے مخاطب تھا۔

''بالکل بھی نہیں مائی سن...... مجھے لگتا ہے یہ مخمل کے دشمنوں کی کارروائی ہے۔ اور میں نہیں چاہتی کہ وہ تمہیں بھی اپنے انتقام کا نشانہ بنائیں۔'' وہ دہل کر بولی۔

''لیکن میرا مخمل مام کے دشمنوں سے کیا تعلق، وہ مجھے کیوں نقصان پہنچائیں گے؟'' عثمان کے لہجے میں بے تابی تھی۔

''مخمل کے ساتھ نہ سہی' فرحان آغا سے تو دشمنی بن گئی تھی ناں...... نہ وہ اس عورت سے شادی کرتے نہ آج یہ سب ہوتا۔ میں مخمل کو سیدھا، سیدھا گاؤں والوں کے حوالے کر دیتی۔ پر اب اسی حوالے سے مجھے تمہارے لیے بھی تحفظات ہیں عثمان۔ تم پاکستان نہیں آؤ گے جب تک میں نہ کہوں...... تم سن رہے ہو ناں...... جب تک میں نہ کہوں...... اور اپنا بہت خیال رکھنا، اوکے......''

''لیکن آپ اکیلے یہ سب کیسے ہینڈل کریں گی مام۔'' عثمان کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''تمہاری مام ایک مضبوط عورت ہے تم اچھی طرح جانتے ہو عثمان...... میں یہ سب ہینڈل کرسکتی ہوں۔ ٹیک کیئر اینڈ اللہ حافظ'' اتنا کہہ کر صاحبہ نے فون آف کر دیا۔

☆☆☆

چاندنی بوا مسلسل زیتون بانو کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن وہ تھی کہ ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھیں۔

''میرے آغا کو بچالو...... نہیں تو کم از کم مجھے اسپتال لے جاؤ...... میں تو ان کی اولین چاہت ہوں، مجھے ان سے الگ نہیں رہنا۔ اگر انہیں کچھ ہوا تو میں بھی نہیں بچوں گی۔ آخر وہ مجمل ہی کیوں؟''

''چپ کر جائیں زیتون بانو! سب فیصلوں میں ہر بار آپ ہی پہل کرنے والی نہیں ہیں اور نہ ہی اپنی طرف سے قیاس آرائیاں کریں...... مت کریں یہ جاہل عورتوں جیسا واویلا...... جو ہونا ہوگا آپ کی چیخ و پکار سے رکنے والا نہیں۔''

''یہ تمہاری وہ بددعا ہے صاحبہ جو تم نے شاید مجھے دی بھی نہیں...... میں اپنے آغا کو کھونے جا رہی ہوں...... لیکن تم مجھے اب بھی معاف کر دو کہ یہ نقصان تو تمہارا بھی ہے۔ تم بھی تو ہاتھوں کی مہندی کھو دو گی۔ صاحبہ مجھے معاف کر دو۔'' زیتون بانو نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

''ہٹ جاؤ بیوقوف عورت...... یہ وقت ان باتوں کا نہیں...... مجھے عفان کی تدفین کا انتظام کروانا ہے تعزیت کو آنے والوں کو دیکھنا ہے اور اسپتال بھی جانا ہے۔'' اس نے زیتون کو پرے دھکیلا اور باہر کی طرف بڑھ گئی۔

زیتون بانو کا دھیان عفان کی ویران پڑی میت کی طرف گیا وہ دھیرے، دھیرے آگے بڑھی۔ ابھی اس کو غسل دیا گیا تھا۔ ننھا سا بچہ کسی فرشتے کی صورت خاموش وساکت پڑا تھا۔ زیتون بانو جو چپکے، چپکے اس کو دیکھا کرتی تھیں اور اس میں عثمان کی جھلک ڈھونڈتی تھیں۔ آج وہ بھی جا رہا تھا ہمیشہ کے لیے...... وہ بے تابی سے آگے بڑھیں اور عفان کو بے تابی سے اپنی چھاتی سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

☆☆☆

''پاپا آخر آپ کو اعتراض کیا ہے عثمان آغا سے میری شادی کرنے پر......'' وہ جھنجلائی۔

''کہنے کو تو میرا انکار ہی تمہارے لیے کافی ہونا چاہیے تھا۔ لیکن وضاحت سننا چاہتی ہو ماہِ کامل تو سنو...... میں نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے دور جاؤ۔ میں تنہا نہیں رہنا چاہتا۔ جو بھی تم سے شادی کرے گا اسے اپنی فیملی کو چھوڑ کر ہمارے ساتھ رہنا ہوگا......'' وہ ایک طرح رٹا رٹایا سبق جو صاحبہ نے اس کو پڑھایا تھا وہ پڑھ رہا تھا لیکن درحقیقت وہ ہر دو صورت میں یہی چاہتا تھا۔ اس لیے بھی کہ وہ واقعی اب اکیلا نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اور اس لیے بھی کہ صاحبہ نے جس طرح اس کی زندگی کو مہرہ بنایا تھا۔ فرحان آغا کو اس پر ترجیح دی تھی اور فرحان آغا سے اس سے بڑا انتقام ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کی اولاد کو اس سے الگ کر دیا جائے۔

''لیکن پاپا...... ! کوئی اپنی فیملی کو کیسے چھوڑ سکتا ہے۔'' ماہِ کامل نے تاسف سے شیراز کو دیکھا۔

''بالکل ویسے ڈارلنگ ڈاٹر۔ جیسے میں نے پوری عمر تمہیں دے ڈالی کسی کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کیا، یہ سوچ کر کہ تمہیں توجہ کی کمی نہ ہو اس لیے تم اپنے فیصلے میں آزاد ہو...... لیکن یاد رکھنا کہ اگر تم اپنی مرضی سے شادی کرتی ہو تو میری طرف پلٹ کر مت دیکھنا۔'' شیراز احمد نے فیصلہ کُن انداز میں ہاتھ اٹھایا۔ گویا اب تم جا سکتی ہو کا اشارہ تھا۔

☆☆☆

''میرے خیال میں اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے اگر ماہِ کامل کے فادر تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں تو تمہیں مان جانا چاہیے...... مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں، وہ کون سا تمہیں ہم سے ملنے سے منع کر رہے ہیں صرف چاہتے ہیں کہ تم لندن میں ان کے ساتھ ہی رہو۔'' صاحبہ نے عثمان کو تسلی دی تھی۔

''لیکن مام! پاپا اور بی بی جان کو اعتراض ہوا

تو؟'' عثمان نے اعتراض اٹھایا۔
''ہاں ڈیئر! ان کو اعتراض ہوگا لیکن تم فی الحال ان سے کوئی ذکر نہیں کروگے اور نہ ہی میں ان کو کچھ بتانے والی ہوں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو ناں۔'' صاحبہ نے اپنی بات پر دباؤ ڈالا۔
اور وہ تو تب سے صاحبہ ہی کی سن رہا تھا۔ جب سے اس کو فرحان آغا نے صاحبہ کی گود میں ڈالا تھا۔ کب فرحان آغا بھی اس کی پہلی ترجیح نہ رہے تھے اسے پتا بھی نہیں چلا تھا۔
یوں ایک خوب صورت شام میں لندن کی سرد فضا میں وہ اور ماہِ کامل ایک رشتے میں بندھ گئے تھے۔ زندگی اتنی خوب صورت ہوگئی تھی کہ عثمان کو ماہِ کامل کے سوا کچھ بھی نظر آتا تھا نہ یاد......

☆☆☆

اسپتال کی ٹھنڈی راہ داری میں رکھی کرسی کی پشت سے آرام سے ٹیک لگائے صاحبہ ڈاکٹر کی منتظر تھی۔ آج تیسرا روز تھا اس حادثے کو وقوع پذیر ہوئے۔ فرحان آغا اور مخمل دونوں آئی سی یو میں تھے۔ مخمل کے شکم میں پلتی ہوئی بچی کو آپریشن کر کے ڈیلیور کروایا گیا تھا لیکن وہ چند سانسیں بھی نہ لے پائی اور عفان کی طرح اس دنیا کو خیر باد کہہ گئی۔ مخمل کی حالت بھی تسلی بخش نہ تھی۔ دماغ کی اندرونی چوٹوں کی وجہ سے وہ خطرے سے باہر نہ تھی۔ گولیاں لگنے سے زیادہ ڈرائیور کے مرنے کے بعد گاڑی کے خوفناک ایکسیڈنٹ نے اسے نقصان پہنچایا تھا۔ لیکن فرحان آغا ہنوز کوما میں تھے۔ ان کی زندگی مسلسل خطرے میں تھی۔ صاحبہ کا اطمینان قابلِ دید تھا۔ وہ اس وقت بھی فون پر مصروف تھی۔
بندے کی سرشت میں ہی شاید حسد شامل ہے صرف اس کے اظہار کے طریقے مختلف ہوتے ہیں...... کوئی رو دھو کر ضد کر کے اس کا اظہار کرتا ہے تو کوئی لڑ جھگڑ کر احتجاج اور کچھ زہریلے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس کو خاموش انتقام کی شکل دیتے ہیں۔ اور یہ سب سے زیادہ خطرناک صورتِ حال ہوتی ہے۔

محبت یا نفرت کے بیچ بھی ایک جذبہ ہوتا ہے جسے شاید آج تک کوئی نام نہیں دے سکا ہے صرف محسوس کی جانے والی ایک کیفیت میں انسان اور شیطان میں بہت کم فرق رہ جاتا ہے۔ صاحبہ اسی دن سے اس جذبے کے زیرِ اثر تھی جب فرحان آغا مخمل کو اپنی زندگی میں شامل کر بیٹھے تھے۔ صاحبہ جیسی انا پرست عورت یہ بات کیسے ہضم کر سکتی سو اس نے زندگی کی بساط پہ سارے مہروں کو اپنی مرضی سے برتنا شروع کر دیا تھا۔ ایک خوفناک کھیل جس کا انجام بھی وہ اپنے ہاتھوں سے لکھنا چاہتی تھی۔ زیتون نے جو اس سے کیا تھا اس کا بدلہ وہ اس کی غلطی سے بڑھ کر لے رہی تھی۔ اتنے سالوں سے زیتون، عثمان کی شکل تو کیا آواز سے بھی... ناآشنا ہوگئی تھی۔ شیراز کے ساتھ مل کر اس نے عثمان کی شادی بھی اپنی اس بیٹی سے کروادی تھی جو اس کی پہلی شادی کی نشانی تھی۔
اتنے سالوں سے وہ نہیں بھلا پائی تھی مخمل کے ساتھ فرحان آغا کا التفات...... اس کے بیڈ روم کے ساتھ والا بیڈ روم ہی مخمل کو ملا تھا۔ راتوں کی خاموشی میں مخمل کی کھنکتی ہنسی سن کر اس کے سینے پر سانپ لوٹ جاتے۔ وہ ہر پل اس ہنسی کے لیے آنسوؤں کا کنواں کھود رہی تھی۔
فرحان آغا کی کبھی کبھار کی پیش قدمی کو اس نے کبھی رد نہیں کیا تھا۔ وہ بلا کی اداکارہ تھی۔ انتہا کی منصوبہ ساز...... وہ نہ تو زیتون بانو تھی نہ ہی مخمل...... مخمل کس گنتی میں آئی تھی۔
''واہ فرحان آغا رقیب چنا بھی تھا تو میرے برابر کا تو چنتے......'' صاحبہ کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

''آغا آپ میری غلطی کو معاف کیوں نہیں کر دیتے...... جانتی ہوں اولاد کا قتل ناقابلِ معافی ہوتا ہے۔ میں نے صاحبہ کے شکم میں موجود آپ کی اولاد کو ختم کروایا۔ لیکن میں خود اس گناہ کے بوجھ سے روز مرتی ہوں، روز جیتی ہوں آپ نہیں جانتے کہ میں کس کرب سے گزر رہی ہوں......'' زیتون بانو نے بہت

بیتابی سے فرحان آغا کے ٹھنڈے یخ ہاتھوں کو تھام کر آنکھوں سے لگایا۔

اوں ہوں......اور غوں غاں کی آوازوں سے زیادہ فرحان آغا کے بس میں کچھ نہ تھا وہ اپنے ہاتھوں کو زیتون کے ہاتھوں سے آزاد کروانے کے لیے مزاحمت بھی کرنے کے قابل نہ تھے ان کے بس میں صرف اتنا تھا کہ آنکھوں میں نفرت کا شدید تاثر لیے وہ ہلکا سا گردن کو موڑ لیتے۔

زیتون بانو نے ان کی آنکھوں سے جھانکتی نفرت کو دیکھا اور دوسرے پل آغا کے ہاتھوں پر ان کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

جب سے آغا اسپتال سے واپس آئے تھے اسی حالت میں تھے ان کا کوما سے باہر آنا ایک معجزہ تھا لیکن ان کی معذوری ایک بددعا کی طرح ان پر مسلط تھی اور زیتون بانو نے تب سے لے کر اب تک آغا کو اپنے ہی کمرے کا مکین بنا رکھا تھا۔ دن رات ان کی دیکھ بھال وہ خود کرتی تھیں۔ اور اس خدمت میں وہ اپنے آپ کو بھلا بیٹھی تھیں۔ آغا بستر پر تھے لیکن آج بھی وہ سفید براق کرتے پاجامے میں صاف ستھرے اگر نظر آتے تھے تو محض زیتون بانو کی خدمت کے سبب......بی بی جان کو ان کی خدمت بھی نظر آرہی تھی اور اپنے معذور بیٹے کی تکلیف کے ساتھ، ساتھ اس حالت میں بھی اس کی ضد اور اکڑ بھی۔

انہیں لگتا.... کہ ان کو اپنی سوکنوں کے ساتھ کیے کی سزا آخری سانس تک بھگتنی ہے۔ تب ہی تو وہ اتنی سخت جان تھیں کہ نہ تو عفان کی طرح موت کی آغوش میں گئی تھیں اور نہ ہی محمل کی طرح ہوش وحواس سے بیگانہ ہوئی تھیں۔ انہیں اپنی سوتن زینت آرا کے الفاظ آج بھی یاد تھے۔

''تم پل، پل سسکو گی عفت بیگم......میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے تمہارے خلاف لیکن یہ مت بھولنا اللہ تو سب دیکھ رہا ہے۔ میری بددعا ہے کہ تم موت مانگو تو تمہیں موت نہ ملے اور تم اپنے ایک، ایک رشتے کا عذاب سہو......اپنی آنکھوں سے دیکھو اور کچھ بھی تمہارے بس میں نہ ہو۔'' بی بی جان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے سوتے پھوٹ پڑے۔

''لوزینت بیگم تمہاری بددعا پوری ہوئی ہمارے بس میں کچھ بھی نہیں......کچھ بھی نہیں۔''

☆☆☆

محمل بھی طویل وقت اسپتال میں گزار کر واپس نواب ولا آتو گئی تھی لیکن اپنے ہوش وحواس کھو کر دیوانگی کی کیفیت میں بعض اوقات تو اس پر شدید دورے پڑتے تو وہ پاس پڑی ہر چیز کو توڑ ڈالتی خود کو نقصان پہنچاتی اور کبھی اپنے پاس موجود ملازمہ کو جکڑ لیتی......وہ سب بھول چکی تھی بس ایک لفظ اس کی زبان پر رہتا تھا۔ ''سانول''۔

وہ اس درجہ خطرناک ہوچکی تھی کہ صاجبہ نے اسے تہ خانے کے ایک خالی کمرے کے اندر زنجیروں سے بندھوا دیا تھا۔

عثمان ایک بار پاکستان آیا تو واپس جا کر اس نے پلٹ کر نہ دیکھا۔

''وہ تو میرے علاوہ کسی سے رابطے کا بھی روادار نہیں ہے۔ یہ تو ہم ہیں جو وقتاً فوقتاً اس سے ملنے چلے جاتے ہیں۔ وہ تو فرحان آغا کی محمل سے شادی کو ابھی تک معاف نہیں کر پایا۔'' صاجبہ بیگم نے مبالغہ آرائی کی حد سے گزرتے ہوئے بی بی جان کو خاموش کرا دیا۔ پوتے کی یاد تو ستاتی تھی۔

بی بی جان خالی، خالی نظروں سے صاجبہ کو دیکھتی ہی رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

''ذرا دھیرے، دھیرے چلو ماہِ کامل۔'' عثمان نے ماہ کامل کے کندھوں پر دھیرے سے ہاتھ رکھتے ہوئے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔ وہ جب سے اس خوشخبری سے واقف ہوئے تھے تو تب سے ہی دونوں کے پاؤں زمین پر نہیں تھے۔ ماں بننے کی سرشاری اس کے روم، روم سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ

جلد از جلد پاپا کو یہ خوشخبری دینا چاہتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ پچھلے کچھ ماہ سے پاپا (شیراز) کی طبیعت کی خرابی شاید اس خوشخبری سے کچھ دور ہو جائے گی۔

شیراز اپنی رپورٹ سامنے رکھے سوچوں میں گم تھا۔ اتنے سالوں کی ریاضت میں اس کے حصے کیا آیا تھا۔ خانہ بدوشی...... بے وطنی، دربدری، ماں، باپ کی موت پر ان کی میت کو بھی کندھا نہ دے سکا...... اور یہ سب جس کے لیے جھیلا آج ایک طرف اس کی لرزہ خیز موت کی خبر اور دوسری طرف اس کی رپورٹس جن میں HIV پازیٹو نے اس کو سن کر دیا تھا۔

وہ اس وقت اپنے آپ سے سوال جواب میں مصروف تھا۔ زندگی کے سود و زیاں میں اس نے کب کون سا قدم کس کے لیے اٹھایا۔ خود احتسابی کے اس عمل میں اسے محسوس ہوا اس کے کسی بھی عمل میں شاید اخلاص نہ تھا۔ چاہے وہ صاحبہ کی محبت تھی یا اس کی اپنی محبت میں ناکامی پر فرحان آغا سے انتقام لیتا رہا تھا۔ اگر وہ اپنی بہن عمل سے مخلص ہوتا تو فرحان آغا سے اس کی شادی پر احتجاج تو ضرور کرتا۔

جب محمل دیوانگی کا شکار ہوئی تب بھی اس نے محمل کو اپنے پاس علاج کے لیے نہ بلایا...... آخر وہ کون سی قوت تھی جس کے زیرِ اثر وہ صاحبہ کی ہر بات پر عمل کرتا گیا۔ اپنی تمام عمر اس کی بیٹی کو پالتے گزار ڈالی۔

☆☆☆

سکینہ نے جب ہانپتے ہوئے آکر بی بی جان کو یہ خبر سنائی کہ تہ خانے والی بی بی تو رات جانے کس پہر اللہ کو پیاری ہوگئی ہیں تو بی بی جان نے یا اللہ کہہ کر سینے پر ہاتھ رکھا، اٹھنے کی کوشش کی تو جسم نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ وہ اب عمر کے ایسے حصے میں تھیں کہ جب توانائیاں ساتھ چھوڑ چکی ہوتی ہیں۔ کسی کی دعا یا بددعا کا اثر تھا جو اُن کی زندگی ڈور کھینچے چلی جا رہی تھی۔

صاحبہ نے بی بی جان کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ وہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی جلدی، جلدی ناشتا کرنے میں مصروف تھی۔ سکینہ کے انکشاف پر ایک لمحے کو اس کے ہاتھ رکے اور پھر وہ دوبارہ سے چائے کا مگ اٹھا کر کھڑی ہوگئی۔

”شور مت مچاؤ سکینہ...... جلد یا بدیر سب کو مرنا ہے اس کے لیے تو اچھا ہو گیا ناں، تم جاؤ اس کے غسل کے لیے دوسری ملازماؤں کو بھی بلواؤ......“ صاحبہ نے اس طرح آرام سے کہا جیسے وہ معمول کی کسی دعوت یا روزانہ کے کھانے کا مینیو بتا رہی ہو۔

اس نے فون کان سے لگایا لیکن دوسری طرف سے ریکارڈنگ چلتی سن کر شیراز کے لیے پیغام چھوڑ دیا۔

”جانتے ہو آغا تمہاری محبوبہ آج اس جہان سے رخصت ہوگئی، تم کیوں اتنے سخت جان ہو...... کس خوش فہمی میں زندہ ہو...... انگلی تک تو اٹھا نہیں سکتے ہو...... اگر ابھی کوئی مکھی تمہارے منہ پر آکر بیٹھ جائے تو اس کو اڑا نہیں پاؤ گے۔ پھر کیوں زندہ ہو؟ ہاں! بولو کیوں زندہ ہو...... کبھی، کبھی دل چاہتا ہے تمہارا گلا گھونٹ دوں لیکن نہیں...... اچھے لگتے ہو یوں سزا پاتے، بڑے ہی اچھے لگتے ہو زیتون پر بوجھ بنتے۔ کرلو ایک اور شادی چار کی اجازت تھی ناں بلکہ اب تو محمل بھی گئی دو اور کرلو...... یا گھونٹ دوں تمہارا گلا......“ اس نے جھک کر دونوں ہاتھ آغا کے گلے پر رکھے تو فرحان آغا نے سفید پڑتے چہرے کے ساتھ آنکھیں بند کرلیں۔ زیتون نے باتھ روم سے نکل کر باہر آتے خوفزدہ انداز میں صاحبہ کے جنونی انداز کو دیکھا تو جلدی سے آگے بڑھ کر صاحبہ کے ہاتھوں کو پکڑ کر دور جھٹکا اس کوشش میں اس کی سانسیں بے ترتیب ہوگئیں۔

”بے فکر رہو.... زیتون بانو! ابھی نہیں ماروں گی میں آغا کو ابھی اس کی سزا ختم ہوئی ہے نہ تمہاری...... بھگتو اس معذور شخص کو اور کاٹو دن رات کی بامشقت زندگی......“ وہ استہزائیہ انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

☆☆☆

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو شیراز احمد......؟“ صاحبہ نے حیرانی بھرے انداز میں کہا۔

''بالکل وہی جو میں نے سنا...... تم نے تو میرے لیے پیغام چھوڑ دیا تھا کہ میری محمل اب اس دنیا میں نہیں رہی ہے۔ یہ کب بتایا کہ اس کا جسم ظلم سے نیل و نیل ہے۔ اس کے ہاتھوں، پیروں میں جو زیور تم نے چڑھائے تھے ان کے زخموں میں زہر پھیل گیا تھا۔ وہ اس لیے مرگئی ہے۔ یہ کب بتایا تھا کہ اس کو تہ خانے کی بندشوں میں قید رکھا تھا تم نے...... اگر میں تمہارے گھر کے نمبر پر فون نہ کرتا تو مجھے کیا پتا چلتا کہ تم نے محمل کو ایک جانور سے بھی بدترین سلوک کا مستحق ٹھہرایا۔''

''کس نے کہا تمہیں یہ سب......'' اس کے لہجے میں پھنکار تھی ایک ناگن کی سی۔

''مجھے خود نہیں معلوم کہ مجھ پر احسان کرنے والی وہ ہستی کون تھی لیکن اللہ تعالیٰ اس ہستی کی ساری مشکلیں آسان کرے، یہ میری دلی دعا ہے۔'' یہ کہہ کر شیراز نے فون بند کردیا۔ دروازے کے پیچھے کھڑی زیتون بانو نے اپنے سینے سے تھوڑا بوجھ سرکتا محسوس کیا۔ لیکن ایک پچھتاوا ساتھ رہا کہ کاش وہ پہلے موقع پاتے ہی شیراز کا نمبر صاحبہ کے فون سے لے لیتی تو شاید محمل کو بچالیتی۔ یہ تو اس وقت جب صاحبہ نے وحشت میں آغا کا گلا پکڑ رکھا تھا اور جاتے ہوئے اپنا فون وہاں بھول گئی تھی تو زیتون نے اس کے فون سے محمل کے بھائی کا نمبر نکال کر محفوظ کرلیا تھا۔ اتنا تو وہ کرسکتی تھی۔ ساری حقیقت بتا کر شیراز سے التجا کی تھی کہ وہ مت بتائے کہ اسے اس گھر میں سے خود کسی نے فون کر کے یہ سب بتایا ہے۔

☆☆☆

وہ اپنے دونوں ہاتھ گود میں دھرے سکتے کی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ عثمان آغا کا چہرہ بھی سفید پڑ چکا تھا۔ شیراز کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ اور وہ اکھڑی، اکھڑی سانسوں کے درمیان ماہِ کامل اور عثمان آغا کو صاحبہ مرزا سے فرحان آغا، زیتون اور محمل تک کی تمام داستان سنانے کی کوشش کررہا تھا۔ ماہِ کامل کو تو اس جملے نے ہی مار ڈالا تھا کہ وہ شیراز احمد کی حقیقی بیٹی نہیں ہے۔ کتنی سفاک عورت ہے اس کی ماں...... سوچ کر ہی اس کی روح کانپ جاتی تھی۔ عثمان کی تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی جواب دے گئی تھی۔ اس نے ٹائی ڈھیلی کی اور تیزی سے اسپتال کے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ خالی، خالی نظروں سے دیکھتی ماہِ کامل پتھر کے بت کی طرح ساکن تھی۔ لیکن انجانی سی گھبراہٹ نے اس کے جسم و جاں کا احاطہ کرلیا تھا۔

☆☆☆

کپکپاتے ہاتھوں سے فون گرا تو بی بی جان نے پریشانی سے صاحبہ کو دیکھا جس کا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ کچھ پوچھنے کی ہمت وہ اپنے اندر نہ پاتی تھیں۔ اگر یہ گھبراہٹ شیراز احمد کی موت سے مشروط ہوتی تو وہ دو ہفتے قبل ہوتی جب اسے شیراز کی موت کی خبر ملی تھی اور بڑے ہی سکون سے صاحبہ مرزا نے شیراز احمد کو بے وطنی میں دفن کردینے کا حکم دے دیا تھا۔

''کیا ہوا دلہن......؟'' بدقت بی بی جان کے حلق سے آواز نکلی۔

''لٹ گئے، ہم لٹ گئے بی بی جان...... ہمارا عثمان اس دنیا میں نہیں رہا، ایک بار پھر ہم بانجھ ہوگئے...... ایک اور ایکسیڈنٹ ہمارا اثاثہ لے اڑا۔'' زیتون جو دالان میں قدم رکھ چکی تھی تیزی سے کمرے کی طرف پلٹی...... اس کے وجود میں تو گویا بجلی بھر گئی تھی۔

☆☆☆

''چلو اٹھو فرحان آغا! مجھے میرا بیٹا لا کر دو...... میرے جرم کی سزا دینے والے تم تھے ناں...... اب اپنے جرم کی سزا پاتے مجھے کیوں ایک بار پھر اس جرم کی دُہری سزا مل رہی ہے۔ عثمان تو میرا کوکھ جنا تھا۔ نقصان صرف تمہارا کیوں نہ ہوا...... میرا جوان بیٹا اس دنیا سے کیوں چلا گیا۔ تم نے اسے دوسرے ملک رکھا...... دوسری عورت کی گود میں ڈال دیا، مجھے منظور تھا۔ یہ منظور نہیں ہے کہ وہ اس دنیا میں ہی نہیں رہے۔'' زیتون اپنے بال نوچ رہی تھی۔ ساتھ، ساتھ فرحان کے سینے پر دوہتڑ بھی لگا رہی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ وہ تو عثمان کی موت کی خبر سنتے ہی سزا جیسی زندگی سے آزاد ہوگیا تھا۔ اس جہانِ رنگ و بو سے دور جا چکا تھا۔

☆☆☆

دو میتوں کے ایک ساتھ حویلی سے اٹھنے پر کہرام مچ گیا تھا۔ بی بی جان بھی یہ صدمہ سہہ نہ سکی تھیں۔ زیتون نے خشک آنکھوں سے میتوں کو اٹھتے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں تو اس تیسری میت کی منتظر تھیں جن پر اسے آنسوؤں کے دریا بہانے تھے۔ لیکن وہ تو یہاں تھا ہی نہیں۔ وہ تو پردیس کی خاک میں خاک ہو گیا تھا۔ اس کا جگر گوشہ اس کا عثمان مر کر بھی اس سے دور تھا۔ اس کی کوکھ میں آگ لگی تھی۔ پانی ڈالنے والے ہاتھ کہیں نہ تھے۔

☆☆☆

دیے کی ٹمٹماتی لو پر ٹکی اس کی نظریں دھندلا رہی تھیں۔ لیکن نظروں کا ارتکاز برقرار تھا۔ یہ دیا ہی تھا جو زندگی کا احساس دلاتا تھا۔ کہیں دور سے آتی آذان کی آواز سے اندازہ لگایا کہ شاید فجر ہو گئی تھی۔ روشنی، اندھیرے کو شکست دینے والی تھی لیکن اس زندان سے کہیں دور...... دونوں ہاتھ تو نہ اٹھے لیکن دونوں آنکھیں اوپر کو اٹھ گئی تھیں۔

☆☆☆

زیتون نے صاحبہ کے فالج زدہ وجود کو نفرت سے دیکھا لیکن پھر آگے بڑھ کر اس کے غلاظت زدہ وجود کی صفائی میں جت گئی۔ صاحبہ مرزا کے مفلوج وجود نے حرکت نہ کی لیکن اس کی آنکھوں میں ہزار سوال تھے اگر زیتون بانو اس سے نفرت کرتی تھی تو اسے ملازماؤں کے رحم و کرم پر کیوں نہیں چھوڑ دیتی۔ اور اگر محبت ہے تو اس تنگ و تاریک تہ خانے میں اسے کیوں رکھا ہوا ہے جہاں اسے محمل کی بے بسی مجسم نظر آتی تھی۔ یہ تو وہ جانتی تھی کہ وہ اسے مارے گی کبھی نہیں، وہ اسے اذیت دے رہی تھی۔ مرنے سے وہ محتاجی کی اذیت سے نکل آتی۔ اس اندھیر... کوٹھڑی میں تو وہ روز بروز گل سڑ رہی تھی۔ زیتون نے اس کو صاف کیا اور اپنا کام مکمل کر کے وہ کمرے میں موجود واحد ایزی چیئر پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کی سانسیں پھول گئی تھیں جیسے وہ درست کر رہی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ جب تک صاحبہ مر نہیں جاتی اس کا یہ کام انہیں ہی کرنا ہے۔ وہ حویلی کے تمام ملازمین بدل چکی تھیں۔ اب رکھے ملازمین کو انہی کی آنکھوں سے دیکھنے اور انہی کے کانوں سے سننے کی عادت تھی۔ وہ سب ان کے وفادار لوگ تھے۔ زیتون بانو نے سوالیہ نظروں کا ارتکاز اپنے چہرے پر محسوس کیا تو بے ساختہ صاحبہ کے چہرے پر نظر پڑی۔

''صاحبہ تم سمجھتی تھیں کہ تم ایک ہوشیار، پڑھی لکھی عورت ہو، تم نے اس حویلی کی تمام روایات کو توڑ دیا اور بیک وقت پہلی اور تیسری بیوی سے انتقام بھی لے لیا۔ تم نے نوابوں کے گھرانوں کی خاندانی پہلی بیوی کی حیثیت کو اس زعم میں توڑ دیا کہ تم ایک طاقتور، روایت شکن عورت ہو تو صاحبہ یہ تمہاری بھول تھی۔ عورت ہر روپ میں عورت ہی ہوتی ہے۔'' زیتون بانو لحہ بھر کو رکیں۔

''ایک روایت پرست عورت قدیم موم بتی جیسی ہوتی ہے، جلتی ہے، پگھلتی ہے اور اپنے ہی جلتے ہوئے بدن سے پگھلتے آنسوؤں پر پاؤں جما کر خود کی جگہ بناتی ہے۔ جبکہ ایک روایت شکن عورت بھی جدید دور کی موم بتی ہی ہے۔ جلتی ہے، پگھلتی ہے لیکن گھلتی تو ہے پھر سے جلائی جاتی ہے پھر سے پگھلتی ہے اس کی تو جگہ بھی نہیں بدلتی ہے۔ کچھ بھی ہے ہر صورت عورت روشنی ضرور دیتی ہے۔'' زیتون بانو نے اپنی بات جاری رکھی۔

''تم نے کیا سوچا تھا تم ہی محمل کے پچھلوں کو اطلاع دے کر ان پر حملہ کروا سکتی ہو۔ ایک ڈائن کی طرح اس کے بچوں کو مروا سکتی ہو۔ صاحبہ بیگم میں جو خیر کے رستوں کی مسافر بن گئی تھی تم نے ہی مجھے ایک بار پھر شر کے راستے کی مسافر بنایا۔ میں مرتے دم تک اس گھر سے نہیں جانے والی۔ میرے عثمان کو بھی تم نے ہی مروایا تھا ناں تم میں ممتا ہو ہی نہیں سکتی۔ تم جیسی عورت کرائے کی ماں بھی نہیں بن سکتی۔ تم نے کبھی میرے عثمان سے محبت کی ہی نہیں...... کی تو بس مجھ سے نفرت اور اس میں اتنی آگے بڑھ گئیں کہ تم سارے کا سارا خاندان کھا گئیں۔'' زیتون بانو بولے جا رہی تھیں۔

صاحبہ کے منہ سے غوں، غاں کی بے ربط آوازیں نکل رہی تھیں اور اس کی آنکھوں میں زیتون کی باتوں

سے انکار تھا لیکن زیتون اس کی طرف دیکھ کب رہی تھیں ۔۔۔ ان کی نگاہیں تو ایک نقطے پر مرکوز تھیں۔

''تم نے سوچا نہیں کہ میں بھی ایک طاقتور خاندان کی بیٹی ہوں۔ ماہِ کامل کو مروانا میرے لیے بھی بائیں ہاتھ کا کھیل ثابت ہوا۔ تمہاری ساری منصوبہ بندیاں خاک میں مل گئیں۔ دھری کی دھری رہ گئیں اور...... اور یہ جو تم مری نہیں یہ خبر سن کر ادھ مری پڑی ہو بستر پر تو یہ بھی قدرت کا انتقام ہے کہ تم فرحان آغا کی بے بسی کو جان سکو......'' وہ دھیرے، دھیرے اٹھ کر صاحبہ کے بیڈ کے قریب آئیں۔

''نہیں جینا چاہتی ناں تم ایسی زندگی...... ماہِ کامل کے بغیر نہیں جینا چاہتی ناں......'' یہ کہتے ہوئے زیتون بانو نے بے دردی سے صاحبہ کے سر کے نیچے رکھا سرہانہ اٹھا کر اس کے منہ پر رکھا اور آہستہ، آہستہ دبانے لگیں۔ صاحبہ کی سانسیں رکنا شروع ہوئیں تو اس کے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے۔ موت کے خوف سے اس کی آنکھیں ابلنے لگیں۔ دباؤ بڑھا تو زیتون نے ہاتھ اٹھا لیے سرہانہ اٹھا کر پھینک دیا۔ وہ گہری، گہری سانس لے رہی تھیں۔ ''یاد کرو اب کہ تم نے فرحان آغا کو ایسی ہی اذیت سے دوچار کیا تھا۔ تمہارے گناہوں کا کوئی حساب بھی ہے بھلا۔'' زیتون بانو نے نفرت سے اس پر تھوکا اور پیٹھ پھیر کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئیں۔ سیڑھیوں کی طرف جاتا ان کا سفید پوش وجود ساری تلخی اس زندان میں چھوڑ کر جا رہا تھا اب ان کے چہرے پر نرم سی مسکراہٹ تھی، ایک رحم دل نواب بیگم...... بی بی جان کی پرچھائیں جو ساری حویلی پر راج کرتی تھیں۔ زندان سے نکل کر جو حویلی سے ہٹ کر ایک کباڑ والے کمرے کی نیچے بنا ہوا تھا وہ خراماں، خراماں حویلی کے دالان میں داخل ہوئیں تو ننھا حسان بھاگ کر اس سے لپٹ گیا۔

''آپ کہاں چلی گئی تھیں بی بی جان میں، آپ کو تلاش کر رہا تھا۔'' ڈھائی سالہ بچہ بی بی جان کے گال پر پیار کر رہا تھا۔

''کہیں نہیں گئی تھی میری جان، یہیں تھی اور آپ اتنی جلدی کیسے جاگ گئے، آپ کی ماما جانی کہاں ہیں؟ کیا سو رہی ہیں؟''

''نہیں بی بی جان، میں جاگ گئی تھی بس حسان کے لیے فریش جوس نکال رہی تھی۔'' وہ ہنسی۔

''کتنی بار کہا ہے ماہِ کامل آپ کام مت کیا کریں...... اتنے نوکر کس لیے ہیں...... آپ دلہن ہیں اس حویلی کی مالکن ہیں۔'' زیتون بانو نے محبت سے کہا۔

''پیا بن کیسی دلہن کیسی سہاگن بی بی جان۔'' ماہِ کامل کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ آنسوؤں سے اس کی آنکھیں لبریز تھیں۔ ''ہم عورتوں کا پیار بھی عجیب ہوتا ہے ناں بی بی جان...... میری ماما جانی نے کتنے ظلم کیے، کتنی سفاکی دکھائی لیکن اولاد کی محبت کیسی ہوتی ہے، عثمان کی موت کا صدمہ وہ برداشت نہ کرسکیں اور دنیا چھوڑ دی۔''

''چھوڑو بیٹا چل کر ناشتا کرتے ہیں۔'' زیتون بانو نے نظریں چرائیں۔

''نہیں بی بی جان، میری ماما کی شخصیت بہت عجیب تھی جیسے کوئی نفسیاتی گرہ ہو جو کھل نہ پائی ہو۔''

''بیٹا یہ دنیا گورکھ دھندا ہے، کبھی کسی کوزہ گر کو دیکھا ہے جو مٹی کے برتن بناتا ہے۔ بے ڈھب مٹی کو چاک پر دھرتا ہے اور پھر وہ مٹی کا تودہ اپنی مرضی کی شکل میں ڈھال لیتا ہے۔'' ماہِ کامل نے دلچسپی سے ان کی جانب دیکھا۔

''جی دیکھا ہے، آرٹس کالج میں دیکھا ہے۔''

''تو بیٹا پھر اس تودے کی قسمت کے کوزہ گر کا دھیان بٹ گیا تو وہ کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ اور اگر پورا دھیان لگا تو وہ خوب صورت برتن بن جاتا ہے۔ صراحی، گلدان اور سب سے خوب صورت مٹی کا آب خورہ پیاس بجھانے والا کارآمد برتن...... کیا میٹھا پانی ہوتا ہے اس آب خورے کا۔''

''لیکن انسانی کوزہ گر بے دھیان ہو سکتا ہے بی بی جان...... اللہ تعالیٰ تو نعوذ باللہ بے دھیان نہیں ہوتا ناں...... وہ تو ہر انسان کو ایک مکمل، کارآمد انسان بنا کر

بھیجتا ہے۔ یہ تو انسان خود اپنی سرشت سے اپنی حرکتوں سے اپنی ہیئت تباہ کر دیتا ہے بیکار بنا دیتا ہے۔ صرف اور صرف اپنے شر سے اسے اختیار ہے کہ کارآمد بن جائے نیکی سے خیر سے، اللہ تو ہر ایک کو نیکی کی فطرت دے کر بھیجتا ہے ناں۔" صبح کی کی گئی ماہِ کامل کی باتوں نے زیتون بانو کو رات بھر نہ سونے دیا۔ صبح انہیں اپنے اندر کا شر نکال کر صاحبہ کو فوری اسپتال منتقل کرنا تھا۔ ماہِ کامل کو صاحبہ سے ملوانا تھا۔ اور دونوں سے معافی بھی مانگنی تھی۔ کیسے وہ بی بی جان کے کہنے پر شر سے خیر کی طرف بڑھ گئیں اور کیسے وہ فرحان آغا کے لیے اپنا آپ وقف کر بیٹھی تھیں جانے کب وہ پھر سے ایک بار پھر شیطان کے چنگل میں واپس پھنس کر شر ہی شر بن بیٹھی تھیں۔ صرف ایک کام ٹھیک ہوا تھا کہ ماہِ کامل کو وہ چاہ کر بھی سچ مچ مروا نہ پائیں صرف ایک خبر ہی صاحبہ تک پہنچوانا کافی رہا۔

ماہِ کامل، شیراز سے صاحبہ کی ساری برائیاں جان کر عثمان کے مرنے کے بعد اس کی میت بھی پاکستان نہ لائی، ماں سے رابطہ بھی نہ کیا۔ اپنے آپ کو گمنام کر لیا۔ اِدھر اس کیفیت اور حالات نے زیتون بانو کو بے شمار فائدہ پہنچایا۔ اور یوں جونہی صاحبہ کو معلومات کرنے پر پتا چلا کہ ماہِ کامل نے خودکشی کر لی ہے۔ (جو دراصل نہیں کی تھی) اس کے بعد صاحبہ، فرحان آغا کی طرح ہی یہ خبر سہہ نہ پائی۔ شدید صدمے کے باعث اب اس کا سارا وجود دوسروں کے رحم و کرم پر تھا۔ زیتون بانو کمرے کی ٹیوب لائٹ پر نظریں جمائے تھیں تو کبھی وال کلاک کو دیکھ رہی تھیں۔ انہیں صبح کا بے صبری سے انتظار تھا۔ اپنے انجام سے بے خبر وہ خیر کو پالینا چاہتی تھیں۔ رات کے اس پہر حسان اور ماہِ کامل کو اٹھانا مناسب نہ تھا۔ تہجد کا وقت تھا وہ نوافل کے لیے اٹھ گئیں تھوڑی سی نیند کے بعد تہجد کے وقت کی نماز پڑھنا ہمیشہ سے ان کی عادت تھی۔

زندگی اڑنے کو بے تاب تھی دیواروں کے ان سنے بین فضاؤں میں گونج رہے تھے۔ مدھم پڑتی دھڑکنیں سینے کی قید میں کسی تھکی ماندی عورت کی طرح منتشر حالات میں بچے کھچے کام سے نبرد آزما تھیں۔ دیواروں پر رات کی سیاہی نصیب پر ملی کالک کی طرح بدنما لگ رہی تھی۔ وحشی ہوائیں ریل کی سیٹی جیسی آواز نکالتی اِدھر اُدھر سر پٹخ رہی تھیں۔ لمحہ بہ لمحہ رات کا اندھیرا سا نجھ سویرے سے گلے ملنے کو مضطرب ہو رہا تھا۔ دھیرے، دھیرے سرکتی کالی رات نے اجالے کی طرف قدم بڑھائے۔ اب اس کی ادھ کھلی آنکھوں سے جھانکتی سفیدی بالکل اس رات سے جھانکتے سویرے جیسی تھی۔ اس کے سینے میں بچی کچھی دھڑکنوں نے حرکت کرنے سے سراسر انکار کر دیا۔ باغی قیدی کی طرح روح نے آزادی کا پروانہ ملتے ہی پروں کو جھاڑا تو اس کے نحیف وجود نے ایک جھٹکا لیا۔ شب نے آخری ہچکی لی تو طاق میں رکھے دیے کی لو نے بھی آخری بار احتجاج کیا۔ اس کے پیٹ میں بھی تیل کا ایندھن شاید ختم ہو چکا تھا۔ وہ دم بھر کو بھڑکا پھر بجھ گیا۔ دھواں فضا میں تحلیل ہوا تو فضا کی طرف سفر کرتے اس نے ایک آخری بار پھیلتے سویرے میں مردہ پڑی زندگی کو تاسف سے دیکھا۔ ادھ کھلی مردہ آنکھوں نے دھوئیں کے ساتھ پرواز کرتی اپنی روح کو دیکھا۔ روح نے ایک آخری ملال زدہ نظر اپنے گناہ و ثواب سے بھرے زندان پر ڈالی اور ایک اونچی اڑان بھر لی۔ قید بری تھی پر صیاد سے اسے انس و محبت ہو چکی تھی لیکن ایک وعدہ جو اسے ہر حال میں پورا کرنا تھا وہ یزدان سے تھا جو ہرگز توڑا نہیں جاسکتا۔ سویرے نے بھی رات کی سیاہی پر قبضہ جمالیا کہ یہ وعدہ بھی یزدان ہی کا تھا۔

زیتون بانو نے زندان میں قدم رکھا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ پلٹ کر انہیں ایک بار پھر خاموشی سے صاحبہ کو اس کی آخری منزل تک پہنچانا تھا۔ لیکن سینے پر دھرا اپنے گناہوں کا بوجھ انہیں ساری عمر ڈھونا تھا۔ خیر و شر کے پلڑے کو پہروں اللہ کی بارگاہ میں معافی کا کشکول دھرے رکھنا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے کیے گئے فیصلوں سے انحراف کی سزا کاٹنی تھی۔

❁❁❁
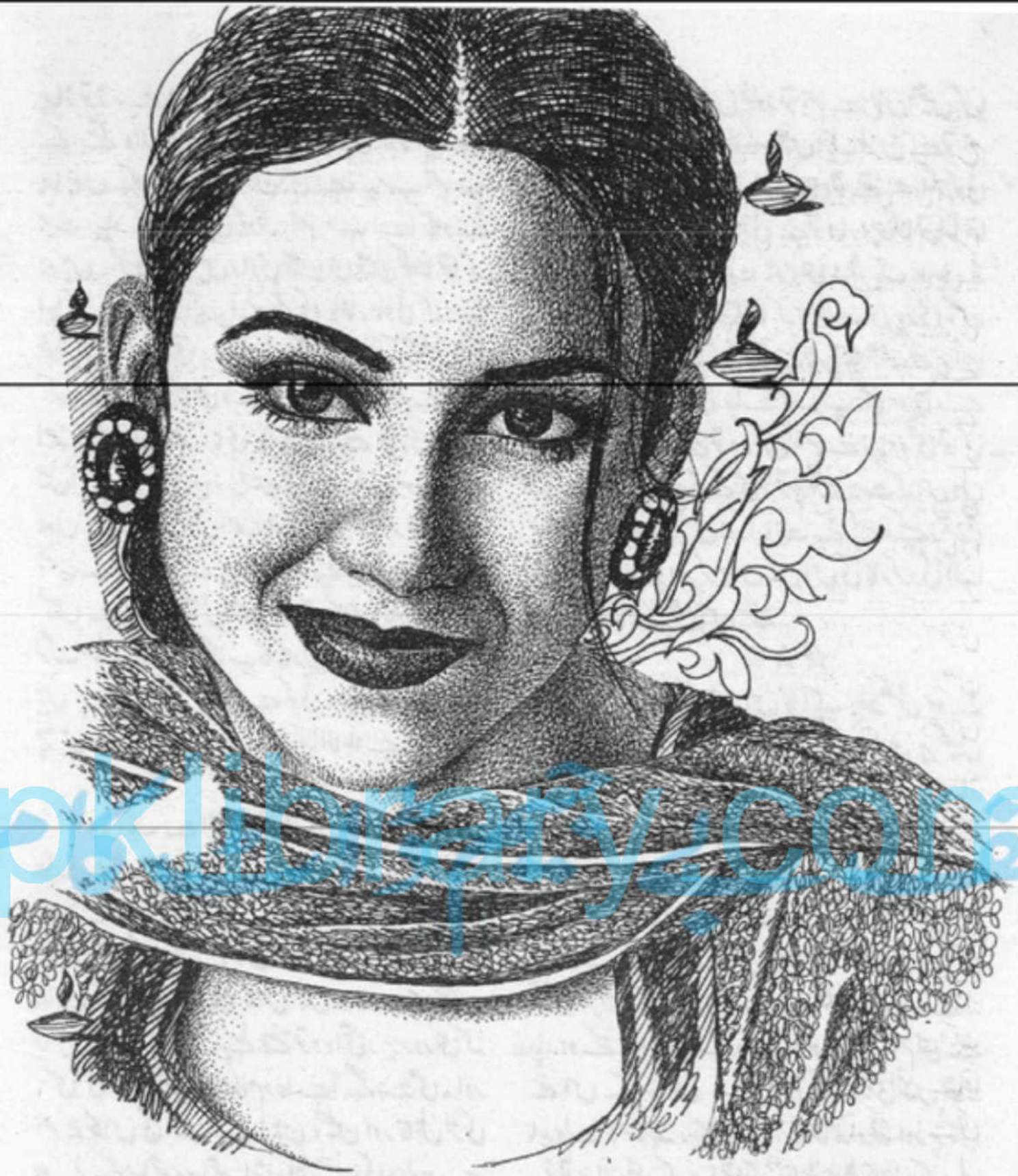
ہمارے حصے کی خوشی

شفا سعید

ہمارا نام زرتاشیہ سلیم ہے اور ہم تھرڈ ائیر کی طالبہ ہیں۔ بقیہ تعارف آگے چل کر بتاتے ہیں۔ پہلے اپنا وہ دکھ بتانا چاہتے ہیں جس نے ہماری زندگی کی تمام خوشیاں نگل لی ہیں۔ کوئی خوشی دل کو خوش ہی نہیں کرپاتی کہ دل کو روگ ہی کچھ ایسا لگا ہے۔ نہیں، نہیں وہ روگ نہیں جو عشق سے لگتا ہے...... عشق و عاشقی سے ہم کوسوں دور ہیں۔ پھر آپ سوچ رہے ہوں گے کہ شاید ہماری کوئی سوتیلی ماں یا باپ ہیں جو ہم پر ظلم کے

پہاڑ توڑ رہے ہیں۔ ایسا بھی کچھ نہیں ہے، مابدولت کے سگے والدین الحمد للہ حیات ہیں اور چار عدد بھائیوں کے ساتھ ایک بہن بھی ہے، یہ سب ہم سے بہت پیار کرتے ہیں کیونکہ ہم سب سے چھوٹے جو ہیں۔ بس کیا بتائیں راوی چین ہی چین لکھتا تھا کہ اچانک زندگی پر ایک ایسے غم کی یلغار ہوئی کہ سب خوشیاں منہ دیکھتی رہ گئیں۔ چلیں اب سسپنس ختم کرتے ہیں اور بتا ہی دیتے ہیں اس غم کا نام ہے موول احمد یہ ''موول احمد'' نامی بلا جب سے ہماری زندگی میں آئی زندگی نری دوزخ بن گئی ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ شاید موول احمد ہماری کوئی خونخوار بھابی ہے جس نے ہم پر ظلم کے پہاڑ ڈھا دیے ہیں تو ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ بلا اصل میں ہماری کلاس فیلو ہے جسے لوگ سنڈریلا، پنکی، گلاب کا پھول اور چاند کا ٹکڑا کہتے ہیں پر ہماری نظر سے اسے کوئی دیکھے تو وہ ڈائن، چڑیل، ڈریکولا... اور نہ جانے کیا الا بلا ہے۔

☆☆☆

وہ ایک بے انتہا خوشگوار دن تھا جب اچانک ہماری خوشیوں پر حملہ ہوا...... اور ''موول احمد'' کسی دوسرے شہر سے مائیگریٹ ہو کر ہمارے شہر آ گئی اور نہ صرف شہر بلکہ ہمارے کالج اور صرف کالج ہی نہیں ہماری کلاس اور ہماری کلاس میں ہمارے ہی بینچ پر دائیں جانب بیٹھ گئی۔ پہلے ہفتے تو وہ اتنی ریزرو رہی کہ کسی بھی کلاس فیلو سے سلام دعا سے آگے نہ بڑھی۔ اور ہم جو کلاس کی سب سے ذہین، فطین اور قابل لڑکی ہونے کے ساتھ، ساتھ ماشاء اللہ حسن کی دولت سے بھی مالا مال تھے اور پورے کالج میں نصابی و غیر نصابی سرگرمیوں کے ساتھ اپنی امارت اور حسن کی وجہ سے بھی مقبول تھے، اس کے دیو مالائی حسن سے تھوڑے خائف ہوئے پر ایک ہفتہ جس طرح وہ دبی، دبی اور چپ، چپ رہی ہمارے سارے خدشے دور ہو گئے۔

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ ہمیں کون سے خدشے تھے اس سے...... ارے بھئی ہم ہر ٹیچر کی دلعزیز شخصیت تھے۔ پرنسپل صاحبہ بھی ہماری صلاحیتوں کی معترف تھیں۔ اور کلاس فیلوز تو ہم سے یوں ملتیں گویا ہم کوئی سلیبرٹی ہوں تو خود سوچیں ایک طرح سے تو ہم اپنی سلطنت کے بے تاج بادشاہ ہی تو تھے...... اگر کوئی نئی اس طرح کی شخصیت آتی ہے تو ہمارا چونکنا تو بنتا تھا ناں کہ کہیں ہماری سلطنت میں ہی نہ شریک ہو جائے مگر اس وقت ہمیں کیا پتا تھا کہ سلطنت ہی پوری چھن جائے گی وہ بھی ایسے کہ ہم تو بے تاج بادشاہ تھے پر اُن کے سر پر تاج بھی سج جائے گا۔ آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ چلو حسین تو وہ شاید ہم سے زیادہ تھی تو کیا ذہانت میں ہم سے آگے تھی؟ تو پوچھیں مت کہ اس دل پر اس بدبخت کے حسن اور ذہانت کے کیسے، کیسے زخم رقم ہیں اور غیر نصابی سرگرمیوں میں اس کی کارکردگی! اُف اللہ......! کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔

☆☆☆

بہر حال کالج میں اس کا ایک ہفتہ مکمل ہونے کے اگلے ہفتے اسپورٹس ویک تھا۔ مابدولت ہر کھیل میں ہمیشہ شریک ہوتے تھے۔ یہ کیا پتا تھا کہ اس بار ہماری ایسی دُھنائی ہو گی کہ اللہ کی پناہ...... بیڈمنٹن کے کھیل پر ہمیں ایسا عبور حاصل تھا کہ آنکھیں بند کر کے بھی شٹل کو ہٹ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے لیکن اس کے مخالف کھیلتے ہوئے اس دن کھلی آنکھوں سے بھی شٹل نظر نہیں آ رہی تھی اور مابدولت شکستِ فاش سے... دوچار ہو گئے۔ اور مقابلہ کروانے والوں کو بھی ہم ہی ملے تھے اس کے مقابل...... خیر قصور اُن کا بھی نہیں تھا۔ مابدولت کا سابقہ ریکارڈ ہی اتنا شاندار تھا اور پرنسپل نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ''ہم تو موول احمد کے لیے فکر مند تھے کہ زرتاشیہ کے ساتھ کھیلتے ہوئے کہیں اسے کوئی انجری ہی نہیں ہو جائے کہ زرتاشیہ اس قدر ایکسپرٹ تھی بیڈمنٹن میں۔''

اب میڈم کو کیا پتا تھا کہ وہ موول احمد کے لیے پریشان ہیں اور موول احمد، زرتاشیہ سلیم کو پنکچر ہی کر ڈالے گی یہ تب کسی کو پتا نہیں تھا۔ وہ پہلا دن اور پہلی شکست تھی۔ پھر تو شکست کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس پہلی شکست پر ہم شرمندہ تو بہت ہوئے

دل بھی ٹوٹا لیکن ہمت جواں تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن چار سو میٹر کی دوڑ کا مقابلہ تھا...... آٹھ ایتھلیٹ میں ہمارے ساتھ وہ ”منحوس“ بھی شامل تھی۔ ہم کالج کے بہترین ایتھلیٹ جانے جاتے تھے اور دوڑتے ایسے تھے جیسے ہمیں دوڑنے کے علاوہ دوسرا کوئی کام ہی نہیں ہو اور بعض اوقات تو اتنا تیز دوڑتے تھے کہ نظروں سے ہی اوجھل ہو جاتے اور اس دن اس منحوس کے ساتھ دوڑتے ہوئے ہم تو نظروں سے اوجھل نہ ہوئے بلکہ ہماری نظروں کے ساتھ دوڑنے والی ساری ایتھلیٹ ہی اوجھل ہو گئیں۔ ہوا کچھ یوں کہ جیسے ہی دوڑ اسٹارٹ ہوئی ہماری نظر ٹریک کے بجائے موِل پر تھی اور موِل وہ ڈائن کہ پلک جھپکتے میں ہی کہیں غائب ہو گئی اور اسے غائب ہوتا دیکھ کر ہماری نظروں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اندھیرا چھٹا تو رزلٹ کا اعلان ہو رہا تھا۔ موِل کا پہلا نمبر تھا اور ہمارا آٹھواں یعنی آخری نمبر...... بس کیا بتائیں‘ وہ اسپورٹس ویک کا دوسرا دن تھا۔ ہم گرتے پڑتے گھر پہنچے اور ایسے بستر پر ڈھیر ہوئے کہ پھر پورا ہفتہ کالج کا منہ ہی نہیں دیکھ سکے۔

☆☆☆

ماما، پاپا، بھیا، بھابی، بہن سب کی جیسے جان پر بن آئی۔ ڈاکٹر قطار کی صورت میں آتے جاتے لیکن انہیں سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ ہمیں ایسا کیا ہوا جو وہ تشخیص ہی نہیں کر پا رہے تھے۔ اب انہیں کیا معلوم کہ ہمیں زندگی میں پہلی بار شکستِ فاش سے دوچار ہونا پڑا تھا وہ بھی کس کے ہاتھوں...... ورنہ تو ہم اور اول نمبر یوں لازم و ملزوم تھے جیسے چولی دامن کا ساتھ...... خیر خود کو کسی نہ کسی طرح سمجھایا کہ وہ جیت گئی تو کیا ہوا ہم آگے زیادہ محنت کریں گے لیکن ہمیں کیا پتا تھا کہ وہ محنت سے بھی آگے کی کوئی چیز ہو تو شاید موِل زیر ہو سکے گی ورنہ محنت بیچاری تو خود اس کے آگے پانی بھرتی نظر آتی تھی۔

☆☆☆

ہم بیماری کے بعد کالج گئے تو پتا چلا کہ ہماری سلطنت پر حملہ ہو چکا ہے اور وہ اس سلطنت کی رانی بھی بن چکی۔ کالج کی ہر ٹیچر، ہر طالبہ یہاں تک کہ پرنسپل کی زبان پر بھی بس ایک ہی نام تھا موِل احمد...... اور صرف موِل احمد عرف ہماری ”خوشیوں کی قاتلہ“۔

جیسے جیسے دن گزرنے لگے اس کی کامیابیوں اور ہماری ناکامیوں کا سلسلہ بدستور جاری تھا کہ ایک دن مضمون نویسی کا مقابلہ ہوا جس میں کالج کی تمام طالبات نے حصہ لینا تھا اور اگر ہم اپنا پچھلا ریکارڈ بتائیں تو اس مقابلے میں بھی ہم ہی اول نمبر قرار پاتے تھے کہ اردو قواعد ہوں یا انگلش گرائمر ہمیں ان پر مکمل عبور ہونے کے ساتھ حالات حاضرہ کا بھی بھرپور علم حاصل تھا تو کبھی کوئی مسئلہ ہی نہیں ہوا۔ پر اس دن معلوم نہیں کیوں صبح سے ہی ہماری ٹانگیں کانپ رہی تھیں، دل گھبرا رہا تھا جیسے کوئی انہونی ہونے والی ہو اور پھر ہمارا ڈر صحیح ثابت ہوا کیونکہ جس عنوان پر مضمون لکھنا تھا وہ عنوان ہی بڑا عجیب و غریب تھا۔ آپ بھی سنیں عنوان تھا۔ ”ہم کیسے خوش رہ سکتے ہیں۔“ اب آپ بتائیں بھلا کہ بندہ کیسے اپنی خوشیوں کا ذکر مضمون میں کر دے کیونکہ میری پہلی خوشی تو یہی ہے کہ موِل احمد اس کالج سے ہمیشہ کے لیے دفع دور ہو جائے اور یقین جانیں ہم نے ذہن پر بہت زور دیا کہ ہماری کوئی اور بھی تو خوشی ہوگی وہ ہی لکھ دیں پر نہ جی ہمارے دل اور دماغ میں جنگ شروع ہو گئی۔ دماغ کہہ رہا تھا کہ موِل کالج سے دفع ہو جائے اور دل کہہ رہا تھا کہ وہ مر ہی جائے تو ٹھیک ہے۔

اب دل و دماغ کی جنگ ایسے ہی جاری تھی کہ مضمون لکھنے کا ٹائم ختم ہو گیا اور ہم منہ دیکھتے رہ گئے۔ ہم نے پیپر پر سوائے اپنا اور اپنی کلاس کے نام اور عنوان کے کچھ نہ لکھا تھا اور نتیجہ تو ظاہر ہے سامنے تھا۔ ہم زیرو بٹا سو تھے جبکہ موِل سو بٹا سو تھی۔ ہاں بھئی وہ کیوں نہ لیتی سو فیصد نمبر اس کے پاس تو خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ اس رزلٹ پر ہماری ٹیچرز نے جو ہمارا حشر کیا وہ تو کیا...... پرنسپل نے نہ صرف خود ہمیں ذلیل کیا بلکہ ہمارے گھر بھی کال کی کہ ہمارے ساتھ خدانخواستہ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہو گیا ہے۔ ویسے بات تو بالکل درست تھی مسئلہ تو دماغی، نفسیاتی،

مزاجی ہر طرح کا تھا۔
خیر یہاں تک کہا گیا کہ اگر زرتاشیہ نے ایسی ہی کارکردگی مسلسل دکھائی۔ تو ہم اسے کالج سے ہی نکال دیں گے پھر گھر میں ہماری جو درگت بنی الامان الحفیظ...... سب کو شک تھا کہ شاید ہمارا کسی کے ساتھ کوئی چکر وکر چل رہا ہے جبھی ہم پڑھائی سے دور بھاگنے لگے ہیں پر ہم کسی کو وضاحت نہیں دے سکے اور بس ٹکر ٹکر سب کی شکل دیکھتے رہے بس معافی تلافی سے کام چلایا اور خود سے عہد کیا کہ آئندہ موحل کے بجائے پڑھائی پر دھیان دیں گے۔ اب تو آپ کو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ ہماری زندگی کیوں دکھوں سے بھر چکی ہے۔ بس آپ اب آگے بھی ساتھ، ساتھ رہیں۔ اور ہمارے دکھ سنتی رہیں اور دیکھتی رہیں آگے کیا بیتنے والا ہے۔

☆☆☆

کالج میں ''پسندیدہ شخصیت کو وش کریں'' اس قدر عجیب مقابلے کے لیے ایک دن مخصوص ہوا اور اللہ جھوٹ نہ بلوائے ہم نے لڑکیوں کو گروہ در گروہ ''موحل احمد'' کو ان ہاتھ کے بنے ہوئے خوب صورت کارڈ وصول کرتے پایا۔ اب تو ہمارے دل نے جلنا کڑھنا بھی چھوڑ دیا تھا کیونکہ ہمارا دل جل، جل کر کوئلے سے راکھ بن چکا تھا۔ ہم اپنے انہی خود ساختہ غموں پر اداس بیٹھے تھے۔ ہم نے کسی کو وش بھی نہیں کیا...... کیونکہ ہم اپنی پسندیدہ شخصیت خود آپ ہی جو ہیں سو کسی دوسرے کو کیوں کرتے۔

☆☆☆

ہم بیٹھے خلاؤں میں تک رہے تھے کہ ہمیں اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ نظر گھما کر دیکھا تو وہ موحل احمد تھی۔ یا اللہ ہم کانپ ہی تو گئے۔ اس نے ہمیں سلام کیا اور جھٹ سے ایک بے انتہا خوب صورت کارڈ ہمارے حوالے کردیا۔ کارڈ ہاتھ سے بنا ہوا تھا اور اتنا خوب صورت تھا کہ ہماری آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ ہمیں لگا شاید اس نے ہمیں یہ کارڈ اپنی پسندیدہ شخصیت تک پہنچانے کے لیے دیا ہے...... ہماری سوالیہ نظریں دیکھ کر اس نے اشارے سے بتایا کہ کھول کر پڑھو تو...... ہم نے کارڈ کھولا تو اس کی خوب صورت ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا۔

''میری موسٹ فیورٹ پرسنالٹی زرتاشیہ سلیم کے نام......

مجھ سے پوچھا کسی نے چپکے سے
تم بتاؤ ذرا پھولوں کو بھلتے دیکھا ہے
چاند پہ آیا جوبن دیکھا ہے
موسم نکھرا، نکھرا سا دیکھا ہے
دل کو خوشیوں سے بھرا دیکھا ہے
آنکھوں میں چمکتے تاروں کو دیکھا ہے
میں نے بولا ہاں دیکھا ہے، دیکھا ہے
کہ میں نے زرتاشیہ سلیم کو جو دیکھا ہے

آپ کی پرستار موحل احمد''

آخر تک پڑھتے، پڑھتے ہماری آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور ہم بے ساختہ موحل احمد کے گلے لگ گئے...... اور یوں لگا کہ ہماری بچھڑی تمام خوشیاں ہمیں واپس مل گئیں۔

اسی دن سے ہم دونوں کی ایسی دوستی کا آغاز ہوا کہ اب ہم ایک جان دو قالب ہیں۔ ہم جو اسے اپنی خوشیوں کی قاتلہ سمجھتے تھے، اس نے ہماری زندگی پہلے سے دگنی خوشیوں سے بھردی اور ہمیں ایک بات کی حقیقت سمجھادی کہ صرف اول نمبر پر رہنا ہی خوشیوں کی ضمانت نہیں ہوتا بلکہ قدرت کے قانون پر قانع رہنا ہی اصل خوشی ہے کہ اللہ نے بہتر سے لے کر بہترین دنیا بنائی ہے۔ ہم اگر قابل ہیں تو کوئی ہم سے بڑھ کر قابل ہوگا۔ یہ قدرت کا قانون ہے تو بجائے دوسروں کی قابلیت سے خائف ہو کر خود پر خوشیاں حرام کرلیں بلکہ اس بات کو تسلیم کر کے ہم اپنے حصے کی خوشیاں وصول کریں...... اور ہمیں یہ افسوس ساری عمر رہے گا کہ ہم نے اس سے دوستی کرنے میں پہل کیوں نہیں کی۔ کاش ہم ہی پہل کر لیتے تو اپنی صلاحیتوں کو منفی سوچ سے زنگ نہ لگاتے۔ مگر وقت ابھی ہاتھ سے گیا نہیں...... اس لیے کہ ہمارے حصے کی خوشی تو خود ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ کیوں دوستو......!

❀❀❀

ع عورت کہانی
امر ماضی

ایک عام تاثر یہی ہے کہ عورت ایک کمزور اور کم تر ہستی ہے... مگر یہی کمزور اور کم تر ہستی صنف مخالف پر کس، کس طرح اثر انداز ہوتی اور وقت پڑنے پر چٹان جیسی مضبوطی بھی دکھاتی ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے شروع ہونے والے اس نئے سلسلے عورت کہانی میں ہماری معروف قلم کار فرحین اظفر نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔

جُداگانہ موضوعات لیے کہانیوں کا نیا سلسلہ آپ جیسے باذوق قارئین کی نذر

''دیکھو صدف! میں نے تمہیں بیٹی کہا ہی نہیں، سمجھا بھی ہے۔ اس لیے میں ہر حال میں تمہاری خیر خواہ ہوں اور تمہارا بھلا چاہتی ہوں۔'' انہوں نے رک کر ایک گہری سانس لی۔

''تم جانتی ہو یہ ورکنگ ویمن ہاسٹلز...... یہاں کی شہرت عام لوگوں کے نزدیک اچھی نہیں ہوتی۔ یہاں رہنے والی ہر عورت، ہر لڑکی کو لوگ بری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کوئی عزت نہیں کرتا۔ حالانکہ پانچوں انگلیاں

برابر نہیں ہوتیں لیکن شاید دنیا کی یہ واحد جگہ ہے جہاں رہنے والی سب عورتیں دنیا والوں کی نظر میں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ لوز کیریکٹر......‘‘ عنایت آپا کے لہجے میں زمانے بھر کی تلخی بھری ہوئی تھی۔ صدف سر جھکائے اُن کی تمہید سن رہی تھی۔

’’لیکن میں جانتی ہوں۔ یہاں اس گندے ماحول اور مشکوک رہائش میں تم جیسی بھی ہوتی ہیں۔ اچھے عادات واخلاق والی معصوم لڑکیاں جنہیں حالات کے تھپیڑے اس نہج پر پہنچا دیتے ہیں کہ ان کے پاس، یہاں رہنے کے سوا اور کوئی آپشن باقی نہیں بچتا...... میں نہیں چاہتی کہ کل کلاں کو تم بھی خدا کی رحمت سے مایوس ہوکر کسی غلط راستے کی طرف قدم بڑھا دو۔ میں اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ برے بھلے کی تمہیں اچھی طرح آگاہی دے دوں۔ آگے تمہارا نصیب......‘‘

صدف جانتی تھی وہ، سچ کہہ رہی ہیں۔ اسے ان کے خلوص سے کہے اِک، اِک لفظ پر یقین تھا لیکن وہ اس لمبی تمہید کا مطلب اب تک سمجھ نہیں پائی تھی۔

’’تم...... زعیم سے کہو کہ تم کو اس طرح بار بار ملنے کے لیے بلانے کے بجائے اپنے گھر والوں سے واضح انداز میں بات کرے...... تمہیں شادی کر کے یہاں سے لے جائے۔ یہ جگہ تم جیسی لڑکیوں کے لیے نہیں بنی بیٹی...... ویسے بھی وہ تو مخلص ہے ناں تمہارے ساتھ تو اسے بھی تمہاری بات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا بلکہ ہوسکتا ہے اگلی بار وہ تمہیں بلائے اور جب تک تم اس سے ملنے جاؤ تو وہ اپنے گھر والوں سے بات بھی کر چکا ہو...... اللہ کرے ایسا ہی ہو۔‘‘ اپنی بات کے اختتام پہ بڑبڑاتے ہوئے ان کے لبوں سے دعا نکلی۔ صدف سر اٹھا کے اِک دم ہی انہیں دیکھنے لگی۔

ان کی آواز میں اس دعا کے وقت جیسے کہ خود ان کو بھی اس کے قبول ہونے میں کچھ تامل ہو، اس وقت جب انہوں نے یہ دعا مانگی۔ ایک بے یقینی کی پرچھائی سی لرزی۔ جس کی کپکپاہٹ کو صدف نے پوری طرح صاف طور پر محسوس کرلیا۔ جبھی وہ حیران نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

آپا کچھ کہتی ہوئی گم صم سی ہوگئی تھیں پھر جیسے انہوں نے خود کو کسی کیفیت سے نکالا اور اس کی طرف دیکھ کے مسکرائیں۔

’’اللہ تمہیں ڈھیروں خوشیاں دے تم جہاں بھی رہو۔ ہنسو بسو، خوش اور مطمئن رہو آمین......‘‘ انہوں نے وارفتگی سے کہہ کے اس کی پیشانی پر ایک بوسہ دیا۔

حدت آمیز نرمی کا خلوص صدف کو اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس ہوا۔

☆☆☆

صدف کی کہانی بھی دوسری لاکھوں لڑکیوں جیسی تھی۔ اس میں کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ ماں کا جلدی انتقال ہوا تو خاندان کی دوسری عورتوں نے ماں بننے کی ذمے داری نبھائی لیکن صرف گھر کے معاملات میں مداخلت کی حد تک...... وہ لڑکپن سے ہی گھر کا فرد کم اور ماسی زیادہ بن گئی۔

ماں کے چلے جانے سے، اولاد کی زندگی میں جو خلا در آتا ہے پھر کوئی دوبارہ اسے پُر نہیں کرسکتا۔ کرنا بھی چاہے تو کر نہیں پاتا...... قدرت نے اس رشتے میں ایک انوکھی انفرادیت رکھی ہے۔ ممتا کبھی باسی نہیں ہوتی۔ اس میں سے ہمہ وقت تازہ مہک آتی ہے۔ اولاد کا تن من، روح اس مہک سے سرشار رہتے ہیں۔ یہ وہ خوشبو ہے جو ہمیشہ اپنی اصل بوتل کی پیکنگ میں اوریجنل ہی اچھی لگتی ہے۔ یہ خوشبو نہ کسی اور شیشی میں انڈیلی جاسکتی ہے نہ پھر اس کا وہ معیار باقی رہتا ہے۔ اس خوشبو سے مہکنے والے اسے کسی اور بوتل میں قبول بھی نہیں کرتے...... اور اگر مل بھی جائے تو اس پر نقلی کا لیبل لگا دیتے ہیں۔

صدف بھی ماں کے مرنے کے بعد کچھ عرصے اسی مہک کی تلاش میں رہی۔ پھر اس نے تھک کے اس کی تلاش ترک کردی۔

باپ کا رویہ ہمیشہ سے نہ سمجھ میں آنے والا تھا۔ یہیں سے اس کی زندگی میں مشکلات کا آغاز ہوا۔ بڑا

بھائی ابھی اتنا سمجھدار نہیں تھا۔ اس کے اندر ایسی حساسیت بھی نہیں تھی۔ جو صدف کے اندر تھی لیکن حالات بدلنے اور بڑی حد تک اپنے مخالف ہو جانے کے بعد وہ جیسے خود اک دم سے بڑی ہو گئی تھی۔

ماں کے انتقال کے فوراً بعد تائی نے جس طرح گھر کا انتظام سنبھالا، اس میں صدف بالکل ایک دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ جس دیوار پر دھوپ دن چڑھے سب سے پہلے پڑتی اور سب سے آخر میں ڈھلتی تھی۔ باپ کو کمائی کی فکر تھی۔ گھر سنبھل گیا تو بچے بھی سنبھل ہی جائیں گے۔ وہ اس خود فریبی میں دوبارہ زندگی کے معمول کی طرف لوٹ آئے۔ بیٹے کو بھی دکان میں ساتھ لگا لیا۔ تائی امی نے اسے مکمل طور پر گھر کے کاموں میں لگا دیا تھا۔

جیسے، جیسے شعور کی منازل طے ہوتی گئیں۔ وہ نہ صرف بہت کچھ ایسا دیکھنے لگی جو اس کے خیال میں دکھائی سب کو دیتا تھا لیکن کوئی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایسا بہت کچھ سمجھنے لگی جو سمجھ سب کو آتا تھا لیکن کوئی سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔ ابا کی دکان اچھی چل رہی تھی۔ گھر بھی انہی کے سہارے تھا اور دکان میں مال روز بروز بڑھ رہا تھا لیکن جو خوش حالی اور آسودگی اسے اپنے گھر میں نظر آنی چاہیے تھی وہ کسی اور گھر میں دکھائی دیتی تھی۔ جو ثمرات اور فیض اسے اٹھانے تھے، اس کا حق دار کوئی اور بن رہا تھا۔ ابا کو کمائی سے مطلب تھا۔ گھر کی فکر سے تائی امی نے آزاد کر دیا تھا اور وہ آزاد کیا بیگانے ہی ہو گئے۔

ایک صدف ہی تھی جو دیکھتی تھی کہ اس کے گھر کے راشن کے ساتھ دگنی مقدار میں تائی امی کے گھر کا راشن آتا اور مہینہ پورا ہونے سے پہلے ہی ختم بھی ہو جاتا۔

تائی امی کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ بھتیجے کو ماں کے جانے کے بعد تیسرا بیٹا بنا لیا اور ایسا بنایا کہ وہ دکان کے علاوہ صرف ان ہی کا ہو کے رہ گیا۔

چھٹی والے دن تائی امی بطور خاص گھنٹوں کے لیے ان کے یہاں آجاتیں۔ پوری فیملی سمیت وہ دس بارہ افراد کے لیے کھانا پکاتی۔۔ سالن، چاول اور میٹھا الگ...... جو تائی امی کو کبھی پسند نہیں آیا۔ وہ اپنی بیٹیوں کے ہاتھ کے ذائقے کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتی تھیں لیکن عجیب بات یہ تھی کہ انہوں نے کبھی نازیہ یا شازیہ سے کھانا پکوا کے دیور اور اس کے بچوں کو اپنے گھر نہیں بلایا۔ ہمیشہ خود ہی آتیں اور کھانے کا انتظام صدف... بیچاری اکیلی کرتی۔

اس کے لیے گھر کے کام کاج ہی بہت تھے کیونکہ ابھی اس نے میٹرک بھی نہیں کیا۔ اس عمر میں لڑکیاں عموماً لاابالی ہوتی ہیں لیکن حالات اس طرح کے ہو گئے تھے کہ اس کے اوپر سنجیدگی کا خول سا چڑھتا جا رہا تھا۔ ابا اپنی بھابی، بھائی اور ان کے بچوں پر کچھ زیادہ ہی جان چھڑکنے لگے تھے۔ اتنی ہی ان کو صدف سے خار آتی تھی۔

وہ تائی امی کی آنکھوں سے دیکھنے، ان ہی کے کانوں سے سننے اور شاید ان ہی کے دماغ سے سوچنے لگے تھے۔ جبھی ان کو صدف کے ہر اس کام میں کیڑے نظر آتے، جو تائی امی کو بھاتا نہ ہو۔ مر، مر کے منت سماجت کر کے اس نے میٹرک کے بورڈ کے فارمز بھجوائے۔ ورنہ گھر میں کسی کو اس کی پڑھائی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی...... اب وہ پہلے کی طرح پڑھ بھی نہیں پاتی تھی۔ اسے پڑھنے کا نہ تو ٹائم ملتا تھا نہ اس کا دماغ ہی پہلے کی طرح چل پاتا۔ دن بھر کے کاموں کی تھکن رات میں جلدی آنکھیں بند کر دیتی اور وہ کتاب گود میں رکھ کے سو جاتی۔

صبح اسکول جانے سے پہلے سب کا ناشتا بنا جاتی، جس کی وجہ سے اکثر اسکول بھی دیر سے پہنچتی اور جس دن تائی امی صبح صبح آجاتیں۔ جس کو وہ نازل ہونا کہتی تھی دل ہی دل میں...... تو پھر اُن کے ناشتے کی تیاری میں اس کے اسکول کی چھٹی ہی ہو جاتی۔

رفتہ، رفتہ اس پر سب رشتوں کی قلعی کھل گئی تھی۔ خود غرضیوں کے پتلے، خوشامد اور جھوٹ کے شہد میں لتھڑے ہوئے دکھائی دیتے۔ وہ روز بروز سمٹتی چلی گی۔ اپنے خول میں بند چپ چاپ، گھر کے کاموں

میں مصروف رہتی یا پھر کبھی کبھار سب سے چھپ کر رو لیتی۔ ماں کو یاد کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی۔

ابا سے تو کبھی ایسی بے تکلفی نہیں تھی لیکن اب تو بڑا بھائی ناصر بھی میلوں کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ بظاہر ایک گھر اور دن رات کے سامنے کے باوجود......

''تم میرے لیے سگے بیٹوں سے بڑھ کے ہو۔ میں تمہاری ماں ہی تو ہوں۔'' یہ وہ سفلی تعویذ تھے۔ جن کا رس جھٹے میں کئی بار تائی امی کے لبوں سے اس کے کان میں ٹپکایا جاتا۔

وہ دیوانہ نہ بنتا تو اور کیا ہوتا...... رفتہ، رفتہ وہ صرف ان کا ہی بیٹا بن کے رہ گیا یوں جیسے صدف سے اس کا ہر رشتہ ناتا ختم ہو گیا۔

انتہائی ضرورت کی بات چیت کے علاوہ وہ اپنی بہن پر ایک نگاہِ غلط ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔

صدف اپنی زندگی کے اہم ترین محرم رشتوں کی اس بے اعتنائی پر دل ہی دل میں گھٹتی رہتی۔

☆☆☆

زعیم اس سے اسی آفس میں ملا تھا جہاں وہ اب ٹیلیفون آپریٹر کی نوکری کرتی تھی۔ وہیں وہ بھی معمولی سا ملازم تھا۔ سلام دعا، علیک سلیک سے بات کچھ آگے بڑھی تو صدف نے اس کو وہیں ٹوک دیا۔

''آپ شاید مجھے کوئی ٹائم پاس لڑکی سمجھ رہے ہیں۔ میں اس طرح کی نہیں ہوں کہ پرائے مردوں سے دوستیاں کر کے اپنی ضرورتیں پوری کرتی پھروں۔'' اس کے لہجے میں کچھ زیادہ ہی تلخی آ گئی تھی شاید...... جبھی وہ گھبرا گیا۔

کچھ دن خاموشی کے بعد پھر ملنے پر اصرار شروع ہوا۔ اس نے عنایت آپا کے سامنے پوری بات رکھی اور ان ہی کے مشورے سے ایک بار...... صرف ایک پہلی اور آخری بار اس سے ملنے گئی۔

صدف کا زعیم کے بارے میں لگایا ہوا اندازہ غلط ثابت ہوا اور یہ گمان بھی کہ وہ اسے کوئی ٹائم پاس لڑکی سمجھتا تھا۔

زعیم اصل میں کسی لڑکی کے ساتھ ٹائم پاس کرنا افورڈ ہی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کی جیب اجازت ہی نہیں دیتی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں اس نے سیدھے سبھاؤ صدف کو پروپوز کر دیا۔ وہ اس کی صاف گوئی پر دنگ رہ گئی۔ اس نے خشک حلق کو تر کر کے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز لبوں تک آ کے دم توڑ گئی...... اسے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ وہ یوں پہلی ہی بار میں اس سے شادی کی بات کر لے گا۔ وہ اسے یونہی دوسرے مردوں کی طرح آوارہ مزاج سمجھ رہی تھی جیسے اس نے اپنی اب تک کی زندگی میں دیکھے تھے۔

''آپ ہر فیصلہ کرنے میں آزاد ہیں۔ ابھی اسی وقت چاہیں تو مجھے ریجیکٹ کر دیں۔ چاہیں تو سوچنے کے لیے وقت لے لیں جتنا آپ چاہیں اور میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ مجھے صرف ہاں میں جواب چاہیے۔ میں کسی بھی بات کے لیے آپ کو بالکل فورس نہیں کروں گا...... میرا ماضی کھلی کتاب کی طرح آپ کے سامنے ہے اور آپ فیصلہ کرنے میں بالکل آزاد......''

اس شام صدف ہاسٹل واپس آئی تو اس کا ذہن پنڈولم کی طرح دائیں بائیں جھول رہا تھا۔

زعیم کا ماضی بھی اس کی اپنی طرح ہی تھا...... بے رنگ، تھکا ماندہ اور اپنوں کی بیگانگی سے مضمحل...... وہ کسی سچے ساتھ نبھانے والے کی تلاش میں تھا۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ ابھی وہ اپنے سگے رشتوں کے درمیان تھا۔ وہی سگے رشتے جنہوں نے اسے جی بھر کے خوار کیا تھا جس لڑکی کو اس نے محبت سے اپنا بنانا چاہا وہ، کچھ عرصے اس کی بن کے اسے بیوقوف بناتی رہی پھر کوئی اور مل گیا تو زعیم کو اس کی غربت کا طعنہ دے کے جان چھڑا لی......

صرف اٹھارہ سال کی عمر میں ملک سے باہر گیا، پیسہ کما کے گھر والوں کی اور اپنی تقدیر بنانے۔ پیچھے گھر والوں نے کچھ جمع نہ کیا۔ صرف فرمائشوں کی فہرستیں مرتب کر کے اسے بھجواتے رہے۔ وہ دس سال وہاں خون پسینہ ایک کرتا رہا۔ یہاں دو بہنوں کی دھوم دھام سے شادی کے بعد چھوٹے بھائی نے اپنا بھی گھر بسا

لیا۔ اپنا کاروبار سیٹ کیا اور جب وہ دس سال کی محنت اور جمع جتھا لے کے واپس آیا تو پتا چلا گھر والے اس کی واپسی تو چاہتے ہی نہیں تھے۔

ماں باپ نے کچھ بھی جمع نہیں کیا تھا سب چھوٹے بہن بھائیوں پر خرچ کر چکے تھے۔ اب بھائی سیٹ تھا۔ بہنیں اپنے گھروں کی تھیں لیکن وہ خود اپنی دس سال پہلے والی جگہ پر کھڑا تھا۔

اتنے برسوں میں اگر گھر والے چاہتے تو بڑا گھر لے لیتے، اس کے نام سے زمین خرید لیتے یا کم سے کم بھائی کے کاروبار میں اس کا حصہ ہی ہوتا لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ بلکہ اس کی بیروزگاری کو دیکھ کے دس دن میں ہی بھائی بھاوج کی آنکھیں ماتھے پر پہنچ گئیں۔ جس بھائی نے دس سال بٹھا کے کھلایا اس کی روٹی دس دن میں ہی بھاری پڑنے لگی۔ اس نے پھر بھی کسی سے گلہ شکوہ نہیں کیا۔ تقدیر کا لکھا جان کر شکر ادا کیا کہ ابھی وہ بالکل کنگال نہیں تھا۔ جو کچھ خود اس نے پس انداز کیا تھا۔ ایک دوست کی مدد سے کاروبار میں لگا دیا۔ ان ہی دنوں جب ابھی وہ سنبھلنے کے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور اپنے سگے رشتوں کو پرایا ہوتے دیکھ کے اندر سے بہت ٹوٹا ہوا تھا...... ان ہی دنوں اس کی زندگی میں ماریہ نے قدم رکھا تھا۔

☆☆☆

میٹرک کے پرچے دیتے ہی تائی امی نے اس کی مزید پڑھائی کو بے مصرف قرار دے دیا۔ صدف ان کی بات اور ان کے ارادے سن کر گھٹن کا شکار ہوگئی۔ ایک اسکول کا ماحول ہی تو تھا جہاں ذرا سا اس کا دل بہل جاتا تھا۔ دوسرے وہ خود بھی تعلیم حاصل کرنے کی شوقین تھی۔ اگر اس کی ماں اتنی جلد چھوڑ کے نہ جاتی تو یقیناً وہ بھی بہت قابل اور لائق لڑکیوں میں شمار ہوتی لیکن اب حالات کچھ اور تھے۔ وہ پڑھنا چاہتی تھی لیکن جانتی تھی کہ اس کا رزلٹ بہت واجبی سا آئے گا اور یوں تائی امی کو اس کی پڑھائی چھڑوانا بہت آسان ہوگا۔

گھر میں ویسے بھی ان ہی کی بات سنی اور مانی جاتی تھی۔ اس نے اپنی اسکول کی سب سے پرانی اور گہری سہیلی سے بھی اس خدشے کا اظہار کر دیا تھا کہ اب مزید آگے پڑھنا شاید اس کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو صدف! پلیز تم پڑھائی مت چھوڑنا...... آج کل میٹرک تک کی پڑھائی بھی کوئی پڑھائی ہوتی ہے...... جانتی ہو ناں لوگ جاہل ہی سمجھتے ہیں میٹرک پاس کو...... تعلیم تو بہت ضروری ہے۔''

ایک سولہ سال کی کچی عمر کی لڑکی اسے اپنے انداز میں اس سے زیادہ کیا سمجھا سکتی تھی۔ وہ بھی صدف کے حالات اور گھر میں اس کی اہمیت سے آگاہ تھی۔

''اگر...... اگر...... تم نے آگے ایڈمشن نہ لیا تو......'' اس نے صدف کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کے دبا لیے۔

''میں بہت اکیلی ہو جاؤں گی۔''

کپکپاتے لبوں سے دنیا کا سب سے انمول خدشہ باہر آگیا۔ صدف نے ڈبڈباتی نظروں سے اسے دیکھا۔ صدف جانتی تھی کرن کا ساتھ اس کے لیے کیسی نعمت غیر مترقبہ تھا۔ اپنے گھر کے گھٹن زدہ ماحول سے نالاں ہو کے وہ اسی کے ساتھ اپنے دل کا غبار نکالا کرتی تھی۔ کرن جیسے اس کے لیے روزنِ زنداں تھی۔ جس کے پار سے آنے والی دھوپ کے چوکور ٹکڑے میں وہ دن کے اجالے جیسی امید جمع کرتی تھی۔ اگر وہ بھی اس سے بچھڑ جاتی تو دو مونہے رویّوں کے ساتھ زندگی کس شکل کی ہو جاتی اسے بخوبی اندازہ تھا۔

''میں بھی......'' اس کے لبوں سے ایک...... بے آواز آہ نکل گئی...... دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کے یوں سسکنے لگیں گویا دائمی جدائی آن پہنچی ہو۔

☆☆☆

زعیم کی زندگی میں ماریہ کی آمد کسی بادِ صبا کے جھونکے سے کم نہیں تھی۔ اپنے گھر والوں کے اجنبی رویّے کی تلافی وہ ماریہ کے خلوص میں ڈھونڈنے لگا۔ ماریہ بھی اس سے التفات جتانے کا کوئی موقع نہیں گنواتی

تھی ..... اس وقت زعیم کے پاس جوانی تھی، تنہائی تھی اور ایک ٹوٹا ہوا دل تھا جسے جوڑنے والا چاہیے تھا۔

ماریہ اس کے لیے وہ سہارا ثابت ہوئی جو خدا نے اس کی کسی نیکی کے صلے میں دنیا میں بھیجا تھا اور جس زمانے میں وہ خود پر جی بھر کے ترس کھانے لگا تھا۔ خود کو دنیا کی بیکار اور لاوارث ترین مخلوق سمجھنے لگا تھا۔ اسی زمانے میں ماریہ نے اسے اپنے ساتھ کا یقین بخش دیا۔

وہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت تھی اور زعیم کو یقین تھا کہ وہی آخری بھی ثابت ہوگی اور آخری سانس تک ساتھ رہے گی۔ وہ ملی بھی ان دنوں میں تھی جب اسے صنفِ نازک کی کمی اشد محسوس ہونے لگی تھی۔ صرف چند مختصر سی ملاقاتوں میں ہی اس نے ماریہ کے سامنے اپنا دل کھول کے رکھ دیا۔ ماضی کی تمام کٹھنائیاں اور مستقبل کے اندیشے اپنے خوابوں سمیت اس کے سامنے جھاڑ دیے۔ اس نے زعیم کو حوصلہ دیا۔ نئی جدوجہد اور اپنی زندگی میں آگے بڑھنے کی خاطر نئے سرے سے ہمت مجتمع کرنے میں مدد کی۔

ایسے وقت میں جب وہ اپنے سگے خونی رشتوں کا تنفر جھیل رہا تھا۔ اس میں اور ماریہ میں قربتیں بڑھنے لگیں۔ ایسے میں کبھی ماریہ اور کبھی وہ خود ہی ایک دوسرے کو سنبھالتے، ان دونوں کی شادی میں ان کی مالی مشکلات حائل تھیں۔ وہ تہ دل سے تمام زندگی اس کا شکر گزار رہتا اور رہنا چاہتا بھی تھا لیکن شاید خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

وہ حالات کی بھٹی سے گزرا ضرور تھا لیکن ابھی اتنا پکا نہیں تھا۔ کچھ نہ کچھ کسر باقی تھی۔

جس دوست کے ساتھ مل کر اس نے کاروبار میں اپنا روپیہ پیسہ سب لگا دیا۔ وہ اسے عین وقت پر دھوکا دے گیا اور تمام سامان بیچ باچ راتوں رات اس کے علم میں لائے بغیر ملک سے باہر بھاگ گیا...... زعیم کو پتا چلا کہ خالی ہاتھ ہونا کہتے کس کو ہیں۔ اسے اب اندازہ ہوا کہ رشتوں کو پرکھنے کے معاملے میں وہ اب بھی اتنا ہی کورا تھا جتنا دس سال پہلے تھا اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ ابھی سچائیاں کچھ اور بھی کھلنی ہیں۔ ابھی دھچکے کچھ اور بھی باقی ہیں۔ خالی ہاتھ رہ جانا اتنا بڑا دکھ نہیں ہوتا شاید۔ جتنا خالی دل رہ جانا......

ماریہ کو اس پر بیتی واردات کا علم ہوا تو فوری طور پر وہ شاکڈ رہ گئی۔ زعیم سمجھتا تھا کہ وہ صدمے میں ہے۔ وہ واقعی صدمے میں تھی لیکن اسے زعیم کو پہنچنے والے دکھ سے زیادہ اس کے مکمل طور پر کنگال ہو جانے کا صدمہ تھا۔ بتدریج اس کا رویہ بدلنے لگا۔ زعیم خود بھی نوکری کی بھاگ دوڑ میں تھا کہ گھر والوں کی.... سرد مہری نے اسے کافی کچھ باور کرا دیا تھا۔ ایسے میں جب ماریہ کی نظریں بدلیں تو اسے یوں لگا جیسے وہ خلا میں معلق رہ گیا ہے۔ زندگی کی سانسیں باقی تھیں تو وہ جی رہا تھا ورنہ اس دوہرے صدمے سے تو جان کی بازی ہی ہار بیٹھتا۔

☆☆☆

دن رات صدف کے لیے مشکل تر ہوتے چلے گئے۔ صرف ایک بار اس نے ابا سے اپنے کالج ایڈمشن کے لیے بات کی۔ یہ امی کے انتقال کے بعد پہلی بار ہوا تھا کہ وہ کسی ضرورت کے لیے ڈائریکٹ ابا سے بات کرنے گئی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ ابا مان جائیں گے لیکن حیرت انگیز طور پر ابا نے اسے مایوس نہیں کیا۔

''تم جتنا چاہو پڑھو، لکھو میری بچی...... میں خود تمہارا ایڈمشن کرواؤں گا۔'' ان کا ہاتھ اس کے سر پر ٹھہرا تو اس میں عجیب سی لرزش تھی۔ جسے صدف نے واضح طور پر محسوس کیا۔ بس چند لمحوں کے لیے اسے تسلی دے کے وہ ہاتھ واپس گود میں رکھ چکے تھے لیکن ان چند لمحوں میں عجیب سا فسوں تھا۔ ایک تحفظ اور مضبوطی کا احساس تو تھا ہی...... لیکن اس سے الگ بھی کچھ تھا۔ کچھ ہٹ کر ایسا احساس جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکی تھی۔ بس ایک اداسی تھی جو ہر وقت ساتھ رہتی تھی اس کی تہ مزید دبیز ہوتی ہوئی لگی تھی ان کے وہ چند لمحے کیا تھے جو ایک واہمے کی طرح اس کے اور اس کے باپ کے

درمیان سے ہو کے گزرے تھے۔

وہ کچھ کہتے، کہتے رک گئی تھی۔ کیونکہ وہ کچھ نہیں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی اور اسے لگا اس بہت کچھ میں سے صرف چند ایک الفاظ چھانٹ کے باپ کی سماعتوں کے سپرد کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ دل میں اپنی حسرت کو سمائے یونہی چپ چاپ اٹھ آئی۔

کمرے سے نکلتے سمے اس نے فقط ایک بار مڑ کے وہاں دیکھا جہاں اس کا باپ سر جھکائے بیٹھا تھا...... وہ ایک بوڑھے ہوتے ہوئے نڈھال اور شکست خوردہ شخص کی طرح نظر آتا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ وہ اپنا بے آواز، تعجب خیز سوال اسی دہلیز پر رکھا چھوڑ آئی۔

وہ چند پل... دھواں ہو گئے تھے جنہیں وہ اپنی بصارتوں میں جذب نہیں کر سکتی تھی۔ وہ لرزتے ہاتھ کی حرارت اور وہ سوال ہمیشہ کے لیے وہیں رہ گئے کیونکہ اگلی صبح کا سورج دیکھنا اس کے باپ کے نصیب میں نہیں تھا۔

وہ چپ چاپ رات کے کسی پہر آنکھیں موند گئے اور صدف کو اس کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ اب تک کتنی گھری چھاؤں تلے کھڑی تھی۔

خاندان والوں کو اس کی تنہائی یا مشکلات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ تائی امی کی صحیح معنوں میں گھر میں اجارہ داری قائم ہو گئی۔ وہ ہر سیاہ و سفید کی مالک بن گئیں۔ تایا ابا حیات تھے لیکن ان کی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں تھی۔ تائی امی نے اپنے بڑے بیٹے کی شادی کے ساتھ ہی اس کے بھائی ناصر کا نکاح اپنی بیٹی شازیہ سے پڑھوا دیا۔

ناصر اُن کی دکھاوے کی محبتوں کا اسیر تھا۔ ایک لفظ بھی نہ بول سکا حالانکہ اس کی شادی عمر تو نہیں تھی۔ ابھی تو ابا کی پہلی برسی بھی نہیں آئی تھی۔

صدف کے احساسات بالکل منجمد ہو گئے۔ وہ ایک مشین کی طرح رہنے لگی۔ گھر میں شازیہ کی صورت میں جو اضافہ ہوا وہ اس کے لیے نرا سر درد تھا۔

شازیہ پورا دن پلنگ توڑنے کے سوا کوئی کام ہی نہیں

درود و سلام

قبول ہونے لگیں دعائیں
معاف ہونے لگیں خطائیں
ہے آمدِ مصطفیٰؐ کا مژدہ
فلک سے آتی ہیں یہ صدائیں
درود تم پر سلام تم پر
سلام شاہِ انام تم پر
سلام اے رہبرِ دو عالمؐ
سلام اے ہادیٔ معظمؐ
سلام اے فخرِ ابن آدم
یہ جھک کے کہتی ہے چشم پرنم
درود تم پر سلام تم پر
سلام شاہِ انام تم پر
تمہی ہو رازِ حرم کے محرم
تمام نبیوں میں ہو تم مکرم
تمہی تو ہو رحمتِ مجسم
صدا یہ دل سے آتی ہے پیہم
درود تم پر سلام تم پر
سلام شاہِ انام تم پر
سلام اے بے کسوں کے والی
ہے تیرا دربار سب سے عالی
کھڑے ہیں در پر تیرے سوالی
بھرے ہیں دل جھولیاں ہیں خالی
درود تم پر سلام تم پر
سلام شاہِ انام تم پر
ہمارے ٹوٹے ہوئے سفینے
نہ جانے پہنچیں گے کب مدینے
ہوئے ہیں اب داغ، داغ سینے
ملیں گے تسکیں کے کب خزینے
درود تم پر سلام تم پر
سلام شاہِ انام تم پر
تمہارے روح الامین پیامی
تمہیں ملائک نے دی سلامی
میرا بھی اب سلام لے لو
اے بے کس و بے نوا کے حامی
درود تم پر سلام تم پر
سلام شاہِ انام تم پر

عقیدت گزار: ثمینہ کوکب، جہلم

کرتی تھی۔ چھ ماہ گزر گئے اس کا دلہناپا ختم ہو کے نہ دیا۔

صدف سسرالی طور طریقے کیا سمجھتی۔ وہ صرف اتنا چاہتی تھی کہ شازیہ اس کے ساتھ گھر کے کاموں میں مدد کر دیا کرے۔

ایک دو بار اس نے دوستانہ جتا کے کہنا چاہا لیکن شازیہ کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ دوسرے ہی دن اسے بھائی سے لیکچر سننے کو ملا۔ جس میں سب سے اہم نکتہ گھر میں اپنی بچکانہ حیثیت اور شازیہ کی سنیارٹی کو ملحوظ خاطر رکھنا تھا۔

تائی امی آئیں اور باتوں، باتوں میں اس کو جتا گئیں کہ شازیہ کی عمر بہت کم ہے۔ ہر چند کہ اس کی شادی ہو گئی لیکن وہ ابھی گھر بار کی ذمے داری اٹھانے کے قابل نہیں تھی۔

مضحکہ خیز بات یہ تھی کہ صدف پورے گھر کا کام بحسن وخوبی کر رہی تھی اور عمر اور رشتے میں بھی میں شازیہ سے چھوٹی تھی اور رہی شادی کی عمر کی بات تو وہ تو ناصر کی بھی نہیں تھی۔ جب اس نے ذمے داری اٹھا لی تو شازیہ کیوں نہیں اٹھا سکتی تھی۔

دل ہی دل میں ناپ تول کر کے اس نے نتیجہ نکالا کہ اب باقی کی پوری زندگی اسے ایک کنیز کی طرح گزارنی ہو گی۔ زبان چلانا، تو تکار یا لڑائی جھگڑا کرنا نہ پہلے اس کے بس کی بات تھی نہ ہی فطرت۔

☆☆☆

ایک دو ملاقاتوں کے بعد جب ابھی وہ عنایت آپا سے مشورہ کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ ان کے گھر ایک ناگہانی نازل ہو گئی۔ ننھے سے کچھ دن کے پوتے کو چھوڑ کے ان کی بہو خالق حقیقی سے جا ملی۔ آپا کا ہنستا بستا گھر، غموں کی بھڑ بھڑ جلتی آگ میں جھلسنے لگا۔

آپا عنایت کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اکلوتا...... اس کے علاوہ اور بچے نہیں تھے۔ عنایت آپا اور ان کے شوہر شوکت بھائی کی خوشیوں کا مرکز اپنے بیٹے کی ذات تھی۔ ابھی شادی کو دو سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ اتنے بڑے حادثے نے ان کے اعصاب ہلا کے رکھ دیے...... پوتا ماشاء اللہ سے ٹھیک ٹھاک اور صحت مند تھا لیکن جب وہ بھوک سے روتا تو اس کے ساتھ، ساتھ گھر کے سب بڑے رونے لگتے...... ماضی قریب کی کون، کون سی باتیں تھیں جو اُن کو یاد نہ آتیں تھیں۔

صدف اس غم واندوہ کے موقع پر مستقل ان کے ساتھ رہی۔

آپا کے ساتھ، ساتھ ان کے پوتے کو بھی وہی دیکھتی رہی۔ دل ہی دل میں زعیم کا خیال راحتِ جاں بن کے اس کے تصورات کو مہکاتا رہا۔ زعیم نے بنا کسی جذباتی وابستگی کے اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتا کے اسے شادی کی پیشکش کی تھی۔

”میں آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ میں آپ کی محبت میں مبتلا ہو کے آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اصل میں تو...... محبت سے بڑا دوسرا کوئی فریب اس دنیا میں ہے ہی نہیں۔ ہاں محبت نہیں۔ لیکن زندگی گزارنے کے لیے ایک سچے ساتھی کی طلب مجھے محسوس ہوتی ہے اور میں اس اہمیت سے اچھی طرح آگاہ بھی ہوں۔ آپ کو دیکھا، آفس میں آپ کے اطوار دیکھے تو مجھے لگا کہ آپ میری اچھی، ہم سفر ثابت ہو سکتی ہیں...... اس لیے میں نے آپ سے کچھ بھی چھپائے بغیر ہر بات صاف، صاف بتا دی ہے...... اب آگے آپ کی مرضی۔“

کچھ دن گزرنے کے بعد جب آپا اور شوکت بھائی کی حالت ذرا سنبھلی اور وہ دوبارہ ہاسٹل آنے لگیں تب صدف نے ان سے تفصیلی بات کی۔ عنایت آپا کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اور ان کے اعتراض کی کوئی تک بنتی بھی نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی دعاؤں کے سائے میں اسے رخصت کیا تھا۔

آج وہ زعیم کی پیشکش کا مثبت جواب دینے جا رہی تھی۔

وہ چاہتی تھی کہ وہ بھی زعیم سے کچھ نہ چھپائے، اپنے تلخ ماضی کا ایک، ایک ورق اس کے سامنے کھول کے رکھ دے۔ زعیم کا تو دھوکے کے بعد محبت پر سے بھروسا ہی اٹھ گیا تھا۔ لیکن اس نے تو اس امرت کا

ذائقہ پہلی بار ہی چکھا تھا۔ اس کی آنکھیں خمار آلود ہو گئی تھیں۔ وہ قدم، قدم منزل کی طرف بڑھتی ہوئی بہت سرشار تھی۔

☆☆☆

گھر میں اس کے نام کا پہلا رشتہ کیا آیا، ایک کھلبلی سی مچ گئی۔

اس کے لب خاموش رہتے تھے لیکن آنکھیں اور کان کھلے ہی تھے۔ کبھی کسی روز اچانک اس نے شازیہ کے منہ سے اپنی اور تایازاد سلیم کی شادی کی بابت ”...لیا۔

وہ ناصر کو بتا رہی تھی۔ بلکہ بتا کیا رہی تھی، باقاعدہ فیڈ کر رہی تھی۔

”اچھا ہے ناں، گھر کی لڑکی گھر میں ہی رہے گی۔ سلیم میں آخر برائی کیا ہے۔ اچھا بھلا تو ہے......“

”ہاں لیکن...... اس کی نوکری......؟“ ناصر کی منمناتی ہوئی آواز سے اسے اندازہ ہوا کہ اس کے یعنی ناصر کے اندر اپنی اکلوتی بہن کے مستقبل کا خیال آخری سانسوں پر تھا۔

سلیم صرف میٹرک پاس تھا۔ پان، گٹکا کھانے کے علاوہ وہ محلے والوں اور ہر اپنے پرائے سے جھگڑنا، پھڈے کرنا، بنا عمر دیکھے سامنے والے کو بے عزت کرنا۔ لڑکیوں کو تاڑنا، چکر چلانا، اوچھے دوستوں میں کھڑے ہو کر آنے جانے والیوں پر آوازیں کسنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

تایا ابا اس کے مستقبل سے مکمل مایوس تھے۔ زبان اور ہاتھ چھٹ اتنا تھا کہ بڑی بہنوں پر بھی طبع آزمائی کر دیتا۔ گالم گلوچ پر اسے فخر تھا۔ جب سے ناصر کی شازیہ سے شادی ہوئی تھی۔ عمر میں اس سے بڑا ہونے کی وجہ سے اسے بالکل اپنا نوکر ہی سمجھتا تھا۔ اس کی حرکتوں سے تنگ آ کے خود شازیہ نے ہی اپنی ماں کو کہہ رکھا تھا کہ سلیم کو اس کے گھر نہ بھیجیں...... اگر وہ کسی بات پر بگڑ جاتا تو محلے اور خاندان والوں میں بدنامی ہوتی جو شازیہ کو منظور نہ تھا۔

اپنے بھائی کی تمام خصلتوں سے واقف ہونے کے باوجود وہ ناصر سے کہہ رہی تھی کہ آخر سلیم میں برائی کیا ہے...... کیونکہ شاید وہ خود بھی جانتی تھی کہ اگر سلیم نے کسی لڑکی کو بھگا کے شادی نہیں کی تو کوئی معزز خاندان اپنی بیٹی اسے دینے والا نہیں......

ناصر بھی سب جانتا ہی تھا۔ لیکن اسے اعتراض ہوا تو صرف سلیم کے نوکری نہ کرنے پر...... اس کی تعلیم اور کردار ناصر کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ یا اپنی بہن کی زندگی ہی اس کے لیے اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

”اور اس سے اچھی بات کیا ہوگی کہ گھر کی لڑکی بھی گھر میں رہے گی اور گھر کا حصہ بھی۔“

بلی تھیلے سے باہر آ چکی تھی۔ ناصر کی خاموشی اس کی تائید کا اعلان کر رہی تھی۔ اصل بات یہ تھی جو کم سے کم صدف کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ صدف کی جگہ اگر کوئی سمجھدار بندہ ہوتا تو تائی امی اور ان کی اولاد کی دوراندیشی کی داد ضرور دیتا۔

صدف کا انٹر کا رزلٹ آنے والا تھا۔ وہ یونیورسٹی میں ایڈمشن لینے کا سوچ رہی تھی۔

اس نے اپنا مستقبل طے کر لیا تھا۔ اسے تعلیم مکمل کر کے، آگے روزگار حاصل کرنا تھا تاکہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو کے کسی کی محتاج نہ رہے۔ لیکن تائی امی اور ناصر باقی سب کے ساتھ اسے اندھے کنویں میں دھکا دینے کی تیاری کیے بیٹھے تھے۔

اس کی بھوک پیاس اڑ چکی تھی۔ آنسو اور گلا خشک تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ جو کرنا ہے اسی نے کرنا ہے۔ ہمت تھی نہیں لیکن خود میں پیدا کرنی تھی اور وہ کوئی چالاک لڑکی نہیں تھی کہ اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے کوئی پلاننگ کرتی۔

لمحوں میں فیصلہ ہوا اور وہ اپنی نادانی میں اسی وقت ان کے سامنے پہنچ گئی۔

شازیہ یوں اس کے ایک دم سے سامنے آ جانے پر گڑبڑا سی گئی۔

”بھ...... بھائی میں...... مجھے آپ سے...... یہ کہنا ہے کہ...... میں سلیم سے شادی نہیں کروں گی۔“

اٹک، اٹک کر اس نے جملہ مکمل کیا۔ ایک نظر بھائی اور بھاوج کو دیکھا۔

ان دونوں کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے تھوک نگلا۔ چند لمحوں میں پسینہ، پسینہ ہوتے وجود کو سہارا دینا چاہا...... دل کی دھڑ، دھڑ کو قابو کرنے کی کوشش کیلیکن اسے لگ رہا تھا وہ لڑکھڑا کے بس گرنے ہی والی ہے۔

''او...... وہ...... تو تم چھپ کے ہماری باتیں سن رہی تھیں۔'' حواس بحال ہوتے ہی شازیہ غضبناک ہوگی۔

''میں نے جان بوجھ کے نہیں...... بس اتفاق سے سن لیں......''

شازیہ کی بات اسے مزید بدحواس کر گئی۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ یوں اچانک سامنے آجانے سے شازیہ اس کو کیا کہے گی اور ناصر کیا سمجھے گا۔

وہ بوکھلا کے ناصر کو صفائی دینے لگی۔

''کیوں؟ میں کیا لاؤڈ اسپیکر لگا کے بات کر رہی تھی؟''

شازیہ ایک دم تیز ہوئی۔ صدف کو معلوم تھا۔ اس کے لیے شازیہ سے مقابلہ تو دور کی بات صرف سامنا کرنا ہی ناممکن سی بات ہے اور وہ بھی اب جب کہ اپنی جلد بازی میں وہ اپنا بھانڈا خود ہی پھوڑ بیٹھی تھی۔

''مجھے بس...... اتنا کہنا ہے کہ میں...... سلیم سے شادی نہیں کروں گی۔'' اس نے تقریباً گولی کی سی رفتار سے اپنی بات مکمل کی اور گرتی پڑتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

کمرے میں آ کر اس نے دروازہ لاک کر لیا کیونکہ شازیہ اس کے پیچھے بھی آسکتی تھی۔ اپنے آپ کو سہارا دینے کے لیے، اس نے خود کو بستر پر گرا کے منہ تکیے میں چھپا لیا۔ اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ بات تو کہہ دی تھی۔ اب اس کے نتائج پر غور کرنا تھا۔

☆☆☆

زعیم ہمیشہ کی طرح اس کے کہنے پر اس ہی مخصوص جگہ پر موجود تھا جہاں وہ اس سے پہلے بھی دو تین بار مل چکے تھے۔

صدف نے چہرے پر نقاب لگایا ہوا تھا۔ وہ زعیم سے ملتے وقت ایسا ہی کرتی تھی۔ زعیم نے پہلے بھی اسے نہیں ٹوکا تھا۔ اس بات نے اس کے دل میں زعیم کی قدر کو اور بڑھا دیا تھا۔

''آپ نے مجھے اپنے بارے میں سب بتا دیا۔ تو میرا بھی فرض بنتا ہے کہ میں بھی آپ سے کچھ نہ چھپاؤں۔ میرا ماضی بالکل شفاف اور بے داغ ہے۔ لیکن...... کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں۔ جن کا معلوم ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کو تا کہ بعد میں...... میرا مطلب ہے جب کوئی رشتہ بن جائے تو کہیں اور سے سن کے ایک دوسرے کو اجنبیت کا احساس نہ ہو اور ہمارا دل اور ضمیر بھی مطمئن رہے۔'' زعیم منتظر نظروں سے بڑی توجہ کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔

''مجھے نہیں پتا کہ آپ کو، اس بات سے کوئی فرق پڑتا ہے یا نہیں لیکن...... مجھے پڑتا ہے...... میں...... میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ کوئی رشتے دار بھی نہیں ہیں۔ آپ کو میرے بارے میں، عنایت آپا...... میرا مطلب ہے کہ ہماری ہاسٹل وارڈن سے ہی بات کرنی پڑے گی۔''

زعیم چند لمحے خاموشی کے بعد آگے کی طرف جھک آیا۔ ''کوئی گھر نہیں ہے...... میں اس کا مطلب نہیں سمجھا۔ کوئی رشتے دار کوئی خاندان والا کوئی تو ہوگا۔''

صدف نے ایک گہری سانس بھری اور نظر اٹھا کے عجیب انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''غلط مت سمجھیے...... مجھے اپنے گھر والوں کو آپ کا بتانا ہوگا تو وہ ظاہر ہے کہ سوال کریں گے...... کوئی تو ایسا ہو جس سے میں آپ کے حوالے سے ان کو متعارف کرواسکوں۔''

''میرے سارے حوالے عنایت آپا ہیں۔ ماں باپ مر چکے ہیں...... ایک بھائی ہے بس......''

''بھائی ہے......'' وہ کچھ ریلیکس ہوگیا۔

''جی لیکن وہ مجھ سے ملنا پسند نہیں کرتا۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ...... کیونکہ میں نے اس سے سب رشتے توڑ لیے ہیں...... میں...... میں گھر سے بھاگ گئی تھی۔''

اس نے زعیم کے نزدیک پٹاخا پھوڑ دیا۔ وہ بری

طرح چونک کے رہ گیا۔
دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی اور اتنی طویل ہوگئی کہ سر جھکائے بیٹھی صدف کو اسے دیکھنا پڑا۔
اسے بات کرنے کا ڈھنگ نہیں تھا۔ یہ اسے معلوم تھا۔ لیکن وہ اتنی بے ڈھنگی ہوگی یہ آج پتا چلا۔
زعیم اب بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ لیکن بہت اجنبی، عجیب نا سمجھ میں آنے والی نظروں سے......
''میں...... میں آپ کو شروع سے بتاتی ہوں، اصل میں......''
''چھوڑیں ان سب باتوں کو......'' اس نے صدف کی بات بیچ میں سے کاٹ دی۔
''یہ سب کہنا سننا، حالات اور مجبوریاں...... یہ سب کے ساتھ ہو جاتا ہے...... آپ مجھے صرف اتنا بتائیں...... کہ جس کے لیے آپ نے اتنا بڑا فیصلہ کیا۔ اس کا کیا ہوا۔''
صدف کی سماعتوں میں کسی نے سیسہ انڈیل دیا۔ صدف نے اگر پٹاخا پھوڑا تھا تو اس نے پورا بم ہی دے مارا۔ صدف کے وجود، اس کی عزت نفس اور کردار کے پرخچے اڑ گئے۔ وہ اتنی بے یقین ہوگئی کہ اپنی موجودگی۔ وہ ماحول، سامنے بیٹھا وجود سب کچھ ایک خواب سا لگنے لگا۔ اس کی زبان اکڑ گئی۔ آواز بند ہوگئی۔
''یہ...... یہ وہ کیا کہہ رہا تھا اور کیا سمجھ رہا تھا۔''
''آ...... آپ جیسا سمجھ رہے ہیں...... ویسا......''
اس سے بات مکمل ہی نہیں کی گئی۔ رائیگانی کا کیسا جان لیوا احساس تھا جس نے اس کی آنکھوں میں مرچیں بھر دیں۔
''میں جانتا ہوں۔ میں کہہ رہا ہوں ناں...... پہلے کی سب باتیں بیکار ہیں۔ میں مانتا ہوں۔ ٹین ایج میں لڑکیوں سے ایسی جذباتی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ جس پر انہیں ساری زندگی پچھتانا پڑتا ہے۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ......''
وہ اچانک سے کتنا پکا اور تجربے کار تجزیہ نگار بن بیٹھا تھا۔
جیسے اسے ہر بات کا علم تھا اور صدف گھر سے بھاگی ہوئی کوئی بد کردار لڑکی...... وہ گھر سے بھاگی ضرور تھی۔ لیکن اس کی وجہ ''وہ'' نہیں تھی۔ جو یہ سامنے بیٹھا ہوا، اس سے شادی کا خواہشمند مرد سمجھ رہا تھا۔
''آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔'' اس نے زعیم کی بات کاٹ دی۔ بہت جلدی بازی سے کام لیا گیا تھا ایک بار پھر...... لیکن اس کے پاس زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ ویسے بھی اب شاید سوچ بچار کرنے کے لیے کچھ بچا بھی نہیں تھا۔
''بہر الحال...... جس سوال کا جواب آپ کو درکار ہے۔ میں اس کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی۔ میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے۔ آپ کو زیادہ سوچ بچار کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کی شادی کی آفر ایکسپٹ نہیں کر رہی......''
اس نے کرسی دھکیلی اور کھڑی ہوگئی۔
''پلیز...... آپ...... بیٹھیں...... میری بات کا غلط مطلب نہ نکالیں۔ آرام سکون سے میری بات سنیں۔'' زعیم ایک دم کچھ بوکھلا گیا۔
''آپ کی بات آپ سنا چکے ہیں۔ الف سے لے کے ے تک...... میں نے پوری بات سن لی ہے۔ لیکن میری بات آپ سننا نہیں چاہتے۔ کیونکہ وہ آپ کو بیکار لگتی ہے۔ سوائے اس حصے کے جو آپ کا من پسند ہے اور اصل میں جس کا کوئی وجود ہی نہیں۔''
اس نے پے در پے کئی بار زعیم کو حیران کیا۔
''جب آپ کا ظرف دوسروں کا ماضی قبول کرنے کے قابل ہو جائے۔ آئندہ تب ہی کسی کو اپنی دکھ بھری کہانی سنایئے گا۔ جو بولتا ہے۔ اس کے اندر سننے کا حوصلہ بھی ہونا چاہیے۔ دور سے دکھنے والی آڑی ترچھی لکیریں، قریب آنے پر خوب صورت امتزاج میں بدل جاتی ہیں۔ لیکن صرف ان کے لیے جو اپنی بصارتوں کو حرفِ آخر نہیں سمجھتے......''

☆☆☆

آنسو ساون کی جھڑی کی طرح برس رہے تھے۔

بند پپوٹوں کے پار ایک دھندلا منظر واضح ہو رہا تھا۔
گھر سے بھاگنا...... یہ کتنا مشکل کام تھا اور کتنی ہمت چاہیے تھی اس کو اس کام کے لیے......
شازیہ سے منہ ماری کے بعد خوف سے بخار کی حدت سے اس کا جسم سلگنے لگا تھا۔ نیم بے ہوش سی کمرے میں پڑی تھی اور کسی نے کھٹکھٹا کے پوچھا تک نہ تھا۔
آدھی رات کو ڈرتے، ڈرتے بھوک پیاس سے بے حال ہو کے جب وہ کمرے سے نکلی اور شازیہ کا خاندان اور اس نام نہاد ودھیال شور مچا کے واپس پلٹ چکا تھا۔
بھائی کے کمرے کا دروازہ بند مطلب وہ بھی گہری نیند میں اتر چکے تھے۔
کچن میں ہانڈیاں، پلیٹیں، سنی ہوئی پڑی تھیں۔ خالی ہاٹ پاٹ میں فقط ایک سوکھی روٹی کا ٹکڑا دبکا بیٹھا تھا۔
اس نے وہی اٹھایا اور خالی دیگچی کے پیندے اور اطراف سے رگڑ کے ندیدوں کی طرح کھانے لگی۔
پیٹ کچھ بھاری ہوا تو پانی کی بوتل لے کمرے میں آئی۔ بیتابی سے چند گھونٹ حلق سے اترے اور ماں کی یاد نے بے وقت حملہ کر دیا۔
''امی، امی...... آپ کیوں چلی گئیں امی ی ی......''
اس ایک یاد میں اس آواز میں کیسا درد تھا۔ کیسی تڑپ اور حسرت تھی۔ بے بسی کی انتہا تھی۔ کہ کاش کہیں سے کسی بھی طرح، کچھ بھی کر کے وہ اپنی ماں کو واپس بلا لے۔
اگر اس کی ماں زندہ ہوتی تو کیا اس کا یہ حال ہوتا، جواب ہو رہا تھا۔ اس کا یہ مستقبل طے ہوتا جو زبردستی کیا جانے والا تھا۔
خوف کی لہر نے اس کی پور، پور جکڑ لی تھی۔ بس نہیں چلتا تھا کہ اپنے بال نوچ ڈالے یا ماں کو پکارتی ہوئی دیوانہ وار باہر نکل جائے...... کوئی تو ہوگا جو اس کا درد سمجھے گا، اس کی دادرسی کو آگے بڑھے گا...... کیا اللہ کی بنائی ہوئی اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایک بھی نہیں۔ وہ اپنا رونا بھول کر اسی سوچ میں ڈوب گئی۔
''مجھے کسی سے مدد مانگنی چاہیے...... کس سے...... کیا اللہ کے سوا بھی کوئی مدد کر سکتا ہے......

لیکن وہ وسیلہ تو پیدا کرے گا ناں...... اپنی مدد بھی مجھے خود ہی کرنی ہوگی۔''
ایک اٹھارہ سالہ کچی عمر کی لڑکی کی سوچ دائیں بائیں گھوم کر ایک نام پر آ کے ٹھہری۔
''کرن......''
کرن کا نام اندھیرے میں کرن بن کے چمکا...... اس کی جان میں جان آئی۔
''لیکن...... لیکن میں کرن سے بات کیسے کروں...... اسے کیسے بتاؤں کہ......''
اسے اندازہ ہوا وہ ایک نادیدہ قید میں ہے۔ موبائل اس کے پاس تھا نہیں اور گھر سے باہر بلا اجازت وہ جا نہیں سکتی تھی۔ شازیہ کے سامنے اس دیدہ دلیری سے انکار کرنے کے بعد تو عین ممکن تھا کہ اسے اسی کمرے میں قید کر دیا جاتا۔ جب تک کہ وہ نکاح نامے پر دستخط نہ کر دیتی......
سوچ، سوچ کر ہی خوف کی انتہا نے اسے بخار میں دھکیلا اور اسے خبر نہ ہوئی کتنا ٹائم گزر گیا۔
دوسرے دن دوپہر میں اس کی آنکھ کسی کے جھنجوڑنے سے کھلی۔
بے انتہا دکھتے سر اور بدن کے ساتھ اس نے جلتی ہوئی آنکھیں کھولیں تو گویا کسی نے اس پر جلتی تیلی پھینک دی۔
اسے جھنجوڑنے والا کوئی اور نہیں خود سلیم ہی تھا۔ اس نے صدف کو گریبان سے پکڑا بلکہ جکڑا ہوا تھا۔ جھٹکے دینے اور کھینچنے کی وجہ سے اس کی گردن ٹوٹ رہی تھی۔
''سمجھتی کیا ہے تو خود کو ہیں...... سیدھی شرافت سے میرے رشتے کے لیے ہاں کر دے۔ ورنہ اس قابل نہیں چھوڑوں کہ کسی کو منہ بھی دکھا سکے......''
اس نے اسے جھٹکے سے بستر پر واپس پھینکا۔ درد اور تکلیف کی شدت کے باوجود اس کے حلق سے آواز نہیں نکل سکی۔
اس کا جوڑ جوڑ الگ سا ہو گیا۔ خوف اور دہشت سے وہ کتنی ہی دیر اسی حالت اور زاویے پر وہیں پڑی

رہی۔ کتنی ہی دیر گزرنے کے بعد اس میں ہلنے کی سکت پیدا ہوئی۔ حواس سلب ہو چکے تھے اور قوت تمام......

وہ اس کی زندگی کا سب سے مشکل ترین دن تھا جب، ہمت نہ ہونے کے باوجود اس نے خود اٹھ کے دوا کھائی۔ دل ہی دل میں سب کچھ سوچ سمجھ کے ایک فیصلہ کیا۔

جو شخص اس طرح اچانک سے اس کے کمرے تک آسکتا تھا وہ کچھ بھی کر سکتا تھا، اب اس بات کو سمجھنے کے لیے کون سی عقل چاہیے تھی۔

اس دن اس نے وہ فیصلہ کیا جو وہ عام حالات میں سوچتی بھی نہیں، سوچ لیتی تو خوف سے مر ہی جاتی...... لیکن وہ نہ صرف زندہ تھی بلکہ اس پر عمل کرنے کو تیار بھی......

شام میں اس نے دوسری خوراک کھائی۔ شازیہ سے چھپ کے دودھ بھی پیا......

پہلے سوچا کسی طرح فون مل جائے تو کرن کو کچھ بتائے لیکن ایسا سوچنا بیکار ہی تھا۔

موبائل تو نہ مل سکا، ہاں البتہ اس نے بھائی کی الماری سے کچھ نقدی ضرور چرائی، دو چار کپڑے اور... سرٹیفکیٹس نکالے۔ بیگ تیار کیا...... اور...... بھائی اور بھاوج کے سو جانے کے بعد رات کے اندھیرے میں اپنا گھر چھوڑ دیا۔

☆☆☆

”کیا جواب دیا زعیم میاں نے...... کب لا رہے ہیں وہ اپنے گھر والوں کو۔“ عنایت آپا لنچ کرنے کے لیے اپنا ٹفن لے کے اس کے کمرے میں ہی آگئیں۔ اس کی روم میٹس اس وقت وہاں نہیں تھیں۔

”کبھی نہیں۔“

آپا کا نوالہ بناتا ہاتھ رک گیا۔ صدف کا انداز بہت برفیلا تھا۔ ٹھنڈک سے تکلیف دیتا ہوا۔

”خیریت تو ہے۔ ایسے کیوں کہہ رہی ہو؟“ ان کا پوچھنا تھا کہ خود پر سے ضبط کا حصار ٹوٹ گیا۔

”وہ ویسا نہیں نکلا آپا، جیسا میں نے سوچا تھا۔ میں اسے بہت مہان سمجھ رہی تھی لیکن...... لیکن وہ تو بہت چھوٹا شخص تھا۔ بہت چھوٹا......“

روتے سسکتے اس نے آپا کو تمام بات بتائی...... وہ اسے پچکارتی، سہلاتی رہیں۔ پانی پلایا۔ آنسو پونچھے اور جب اس کے بلکتے دل کو ذرا قرار آیا تو بجائے کوئی بات کرنے کے گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

وہ کچھ دیر ان کی بات کی منتظر رہی۔ لیکن انہیں کچھ بھی بولنے پر آمادہ نہ پا کے خود ہی کہنے لگی۔

”لوگ کتنی آسانی سے خود ہی سب کچھ فرض کر لیتے ہیں آپا!“

وہ اپنی خالی ہتھیلیوں کو دیکھنے لگی۔

”جب مجھے اس نے اپنے بارے میں...... اپنے ایک غیر عورت کے ساتھ تعلقات کے بارے میں بتایا

سنہری کرنیں

☆ کسی کا حال دیکھ کر اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کرنا کیونکہ ہر ولی کا ایک ماضی اور ہر گناہ گار کا ایک مستقبل بھی ہوتا ہے۔

☆ قربِ الٰہی کی راہ پر چراغاں کرنے والے موتی انسان کی ندامت کے آنسو ہوتے ہیں جن کا خریدار خود پروردگار ہے۔

☆ احساس اور احسان کرنے والا کبھی مفلس نہیں ہوتا۔

☆ الفاظ، آنسوؤں کا سبب بھی ...... الفاظ، مسکراہٹ کا سبب بھی۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کسی کے آنسوؤں کا سبب بنیں یا مسکراہٹ کی وجہ۔

☆ اللہ کے فیصلوں میں حکمت، مصلحت، دانائی اور بھلائی پوشیدہ ہے۔ اس میں چون و چرا کی گنجائش نہیں...... یہ بات سمجھ آجائے تو دنیا و آخرت میں خیر ہی خیر ہے۔

☆ عبادت گاہ میں داخل ہونے سے پہلے صرف جوتے ہی نہیں اتارتے بلکہ اپنی انا کو اپنے ہی جوتوں تلے رکھ کر آنا پڑتا ہے۔

از: نگہت غفار، کراچی

تھا تو میں نے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ ایک لفظ بھی نہیں...... وہ خود ہی شرمندہ تھا میں کیا کہتی۔ لیکن جب میری باری آئی تو...... اس نے میری بات سنی تک نہیں......"

وہ پھر ہاتھوں میں چہرہ چھپا کے سسکنے لگی۔ عنایت آپا نے اسے اپنے سینے سے لگالیا۔

☆☆☆

وہ رات اور تاریکی اس کے لیے کسی جہنم کی رات سے کم نہیں تھی۔ جگہ، جگہ کتے بھونک رہے تھے۔ وہ کپکپاتے قدموں سے بنا پیچھے مڑ کے دیکھے بس آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی۔

کرن کے گھر والوں نے اسے آدھی رات کو دروازے پر دیکھ کر کیا کہا۔ کیا نہیں...... انہوں نے اسے کیسے سنبھالا...... اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ کیونکہ وہ بخار میں تپ رہی تھی۔ شام کی دوا کا اثر بھی دم توڑ رہا تھا اور اس کی ہمت بھی......

دروازہ کس نے کھولا۔ وہ یہ جاننے کے لیے ہوش میں ہی نہ رہی تھی۔

کرن کے گھر والے اس کے لیے فرشتہ ثابت ہوئے۔ فوری طور پر دوسرے ہی دن کرن کی امی نے اسے اپنی بہن کے گھر دور بھجوادیا۔ کیونکہ جو کہانی وہ سنا رہی تھی اگر نہ بھی سناتی تو اس کی زبوں حالی اور مخدوش ذہنی حالت خود چیخ، چیخ کر بیان کر رہی تھی۔

کچھ دن انہوں نے رکھا پھر اس کی حالت میں بہتری آتے ہی اس نے خود کمانے کے لیے کمر کس لی۔ وہ اب پیچھے مڑ کے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

کرن سے رابطہ رہتا تھا۔ وہی اسے بتاتی رہتی تھی۔ کہ اس کا بھائی اسے ڈھونڈ کر گھر لانے سے زیادہ جان سے مارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ پولیس کے چکر میں پڑنے کی ان کی ہمت نہیں تھی۔ آخری بار اطلاع ملی تھی کہ صدف کو انہوں نے اپنے لیے مردہ تصور کرلیا ہے۔

صدف ان دنوں کرن کی خالہ کی کسی جاننے والی کے گھر پر رہتی تھی۔ جو بے سہارا لڑکیوں کے لیے اپنے طور پر کام کر رہی تھیں۔ چھوٹے سے گھر میں پندرہ، بیس خواتین مل جل کر رہتی تھیں۔ کام بھی کرتی تھیں اور کچھ نہ کچھ کمائی کا آسرا بھی کرتی تھیں۔

غرض کہ یہاں وہاں لڑھکتے لڑھکتے بالآخر وہ اس ویمن ہاسٹل میں آگئی۔ جہاں اسے عنایت آپا مل گئیں۔ اس وقت تک وہ پرائیویٹ بی اے کر چکی تھی۔ گو کہ اس تعلیمی قابلیت کے ساتھ چند ہزار سے زیادہ کی نوکری نہیں مل سکتی تھی۔ لیکن چھت مل گئی اور آپا کا ساتھ مل گیا...... اسے اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔

عنایت آپا نے ہی کسی سے کہہ سن کے جاننے والے کے ذریعے اس کی یہاں آفس میں نوکری لگوائی تھی۔ انہوں نے صحیح معنوں میں اس کے لیے سہارے کا کام۔ کیا تھا۔

وہ دلی اور ذہنی طور پر بھی اس کے بہت قریب تھیں۔ ویسے تو ہر ایک کے کام آنا ان کی نیک فطرت ہی تھی۔ لیکن صدف سے انہیں کچھ الگ ہی انس تھا۔ وہ کبھی، کبھی ان کے گھر بھی چلی جاتی تھی۔ آپا نے اسے فیملی کے فرد جیسا ہی اپنا پن دے رکھا تھا۔ جبھی وہ زعیم کے ملنے سے لے کے اب تک کے تمام حالات سے واقف تھیں۔

وہ جب، جب ٹوٹی تھی انہوں نے اپنی محبت کے مرہم سے اسے جوڑا تھا۔ وہ اب بھی کبھی، کبھی ماضی کو یاد کر کے ڈپریس ہوتی تو آپا ہی اس کا دل بہلاتی تھیں...... اب بھی جبکہ وہ بری طرح ٹوٹ کے بکھر گئی تھی۔ وہی تھیں جو سمیٹنے کا سامان کر رہی تھیں۔

☆☆☆

پورے کمرے میں بھینی سی گلابوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ سجاوٹ بہت زیادہ نہیں لیکن نفیس ضرور تھی۔ فرنیچر نیا نہیں لیکن برسوں پرانا بھی نہیں تھا۔

وہ سرخ رنگ کے شرارے میں سرتاپا سج کے بیٹھی، اس شخص کا انتظار کر رہی تھی۔ جس نے آج شام میں ہی اس کے جملہ حقوق، اپنے نام کروائے تھے۔

دروازہ آہستگی سے کھلا اور عنایت آپا نے اندر قدم رکھا۔

وہ ان کو دیکھ کے دھیرے سے مسکرائی۔

عنایت آپا نے پاس آکے اسے گلے لگا کے پیار کیا۔

''آج میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ آج میں نے سچ میں تمہیں اپنی بیٹی بنالیا۔'' وہ بے انتہا محبت سے بول رہی تھیں۔ ان کی محبت اور خلوص پر صدف کو پہلے بھی کوئی شک نہیں تھا لیکن اب اسے اپنی بہو بنا کے تو جیسے انہوں نے اسے خرید ہی لیا۔

''صدف!...... ابھی کچھ دیر میں منصور آجائے گا۔ میں اس کے آنے سے پہلے تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں میری بیٹی میری سب باتوں کو سمجھ لے گی۔'' انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''میری کوئی لمبی چوڑی فرمائشوں یا توقعات کی لسٹ نہیں ہے۔ منصور اتنی جلدی دوسری شادی کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے اس کا رویہ سرد بھی ہو تو پریشان مت ہونا۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا...... ابھی دن ہی کتنے گزرے ہیں۔ صرف چند ماہ...... لیکن......'' انہوں نے گہری سانس لی۔

''لوگوں نے بہت باتیں بنائی ہیں۔ منصور کی اتنی جلدی شادی پر لیکن میرے نزدیک میرے بیٹے سے زیادہ میرے پوتے کی زندگی اہم ہے شاید...... میں نے تمہیں یہ سوچ کے چنا ہے کہ تم خود ماں کو ترسی ہوئی بچی ہو۔ تم یقیناً اسے وہی ماں کا پیار دوگی جو بچپن میں تمہیں نہیں مل سکا...... بس مجھے تم سے اور کچھ نہیں کہنا۔ وہ بہت چھوٹا ہے۔ اس نے تو ماں کالمس بھی نہیں پہچانا تھا جب......''

ان پر جذبات غالب آگئے...... وہ کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہوگئیں۔ صدف نے پلکیں جھپک، جھپک کے اپنے آنسو پینے کی کوشش کی۔

''اسے تم میری درخواست ہی سمجھنا...... اس ننھے بچے کو کبھی محسوس نہ ہونے دینا کہ تم اس کی سگی ماں نہیں...... ممتا تو اسے میں بھی دے سکتی ہوں لیکن میری زندگی کا کیا بھروسا......''

''آپا پلیز...... ایسی باتیں نہ کریں...... آپ ہی تو میری ماں کی جگہ ہیں۔ میں...... میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی......'' صدف نے آگے بڑھ کے ان کے ہاتھ جکڑ لیے۔

''ارے دیکھو تو میں کتنی پاگل ہوں...... منصور کو تھوڑی دیر کا کہہ کے آئی تھی اور یہاں بیٹھ کے بھول ہی گئی۔''

وہ نم آنکھوں کو صاف کر کے اٹھیں۔ پھر جاتے، جاتے دوبارہ پلٹ کے اس کے پاس آگئیں......

''اور سنو...... منصور کو اپنے ماضی کے بارے میں بتانے کی کوئی ضرورت نہیں......''

ان کی آواز سرگوشی نما تھی۔ صدف کا اٹھا ہوا سر وہیں رہ گیا۔

''میں نے اس سے کہا ہے کہ ماں باپ کے انتقال کے بعد بھائی بھابی نے گھر پر قبضہ کر لیا تھا اور تمہیں گھر سے نکال دیا تھا۔ تم اس سے کبھی مت کہنا کہ تم رات کی تاریکی میں اکیلی گھر سے نکلی تھیں اور نہ یہ کہ تمہارے تایازاد نے تمہیں کوئی دھمکی وکی دی تھی۔''

اس کے وجود میں شروع ہوتی توڑ پھوڑ سے بے خبر...... وہ بس اپنی کہے گئیں۔ پھر اس کے چہرے پر نظر پڑیں تو تھوڑا سا رک گئیں۔

''یہ مردوں کا معاشرہ ہے بیٹا اور مرد، عورت کے ماضی کے متعلق کوئی بات سننا پسند نہیں کرتے...... میرا بیٹا بھی ایک مرد ہے۔ ایک روایتی سوچ رکھنے والا مرد، شاید میری تربیت میں کوئی کمی رہی ہوگی...... لیکن میں امید کرتی ہوں کہ تم جیسی ماں کی گود میں پرورش پانے والا میرا پوتا ایک عالی ظرف مرد ہوگا اور ویسے بھی جب ایک اچھا مستقبل دہلیز پر کھڑا ہو تو ماضی کو یاد کر کے دل چھوٹا نہیں کرتے......''

انہوں نے ایک بار پھر ہاتھوں کے پیالے میں اس کا چہرہ تھام کے ماتھے پر بوسہ دیا اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اپنے الفاظ کی بازگشت چھوڑ کے......

''یہ مردوں کا معاشرہ ہے اور مرد عورت کے ماضی کے متعلق کوئی بات سننا پسند نہیں کرتے......''

❀❀❀

بقیہ: بیادِ معراج رسول

بہت جلد سسپنس ڈائجسٹ منظر عام پر آیا۔ اس موقع پر خواتین کی دلچسپی کے پیش نظر ماہنامہ پاکیزہ بھی منصۂ شہود پر آیا تو معراج رسول اور ان کے ادارے کو بقائے دوام کی سند حاصل ہوئی۔ معراج رسول صاحب نے کوشش کی، ان کے رسائل میں زبان و بیان نہایت سادہ اور آسان ہو، مشکل گوئی سے وہ بہت دور رہنا چاہتے تھے، البتہ موضوعات ایسے منتخب کرتے تھے جن میں اثر آفرینی، دلکشی بدرجہ اتم موجود ہوتی تھی۔ الیاس سیتا پوری کے ذریعے تاریخ انسانی کے ان عظیم میناروں کی روشنی کو اس طرح پھیلایا کہ جو بنی نوع انسان کی فلاح و کامرانی کی ضامن بن جائے۔ وہ روشنی کے سفر کو واضح اور شاہراہِ عام کے طور پر پیش کرتے ہیں تا کہ راہ گزر آسان معلوم ہو اور منزل مقصود کا حصول یقینی ہو جائے۔ معراج رسول ایثار و ہمدردی کا پیکر تھے۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے ایک خاندان کی طرح تھے۔ جب بھی کوئی کسی مشکل یا آزمائش سے دوچار ہوتا، معراج صاحب بڑھ کر اسے سہارا دیتے۔ کئی لکھنے والوں کی رہائش کے حصول میں اس طرح مدد کی کہ ان کے اپنے بھی اتنے بے لوث انداز میں شاید ہی تعاون کر پاتے۔ جہاں انہوں نے اپنے رسائل کی اشاعت کو مقدم جانا وہیں اپنے بھائی کو بھی طباعت کے حوالے سے وہ تعاون فراہم کیا کہ علم دوست لوگوں کے لیے سامان ہو سکے۔ بظاہر ہمارے ہاں یہ بحث جاری ہے کہ ڈائجسٹوں میں شائع ہونے والی تحاریر ادب کے دائرے میں آتی ہیں یا نہیں مگر اس بحث سے بالاتر اگر ایمانداری سے دیکھا جائے تو جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ اور ماہنامہ سرگزشت میں ایسا بہت سا مواد موجود ہے جو اردو ادب کے لیے ذخیرے کا باعث بنے گا۔ حال ہی میں ایک ایسا تحقیقی مقالہ بھی سامنے آیا جس میں ڈائجسٹوں میں موجود ادبی شہ پاروں کو پیش کیا گیا۔ راقم کا بھی ان رسائل سے خاصا گہرا تعلق رہا ہے۔ کسی حادثے یا سانحے کی صورت میں جب بھی انہوں نے مجھ سے کہا کہ کچھ لکھیے تو میں نے کوشش کی کہ میری تحاریر قارئین کے لیے دلچسپی کے سامان کے ساتھ، ساتھ پیش آمدہ واقعات کی حقیقی عکاس ہونے کے علاوہ رونما ہونے والے نتائج اور مقصدیت سے بھرپور ہو۔ اکثر ان کی راہنمائی کی بدولت مجھے کچھ لکھنے کا وہ حوصلہ ملا جس کی بدولت میرے قلم میں روانی آسکی۔

آج معراج رسول صاحب ہمارے درمیان موجود نہیں مگر ان کی اہلیہ عذرا رسول جس طرح ان رسائل کو جاری رکھے ہوئے ہیں وہ ان ہی کی تربیت کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے محترمہ نے جدت اور ضرورت کو مدنظر رکھا ہے۔ سوشل میڈیا کی آمد نے پڑھنے پڑھانے کے رواج کو بالائے طاق رکھ دیا ہے مگر ان سخت حالات میں بھی ان رسائل کا اجرا معراج رسول صاحب کے لیے صدقہ جاریہ کہا جا سکتا ہے۔

بیادِ معراج رسول ...... شائستہ زرّیں

والدین کی وراثت میں ملنے والے جاہ و حشم، مال و دولت اور نام و نسب پر ناز کرنے والے عموماً اپنے بل بوتے پر کامیابی کم ہی حاصل کرتے ہیں۔ لیکن چند ایسے جوہرِ قابل بھی ہیں جو والدین کی وراثت کا بھرم عمر بھر رکھتے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک نام معروف پبلشر معراج رسول کا بھی ہے۔ آپ کے والد ادبی دُنیا کے جانے پہچانے ناشر عبدالغفار شیخ المعروف ع۔غ۔ شیخ تھے۔ اپنے والد کی رہنمائی اور تربیت میں اشاعت کی دُنیا میں قدم رکھنے اور پھر ارتقا کا سفر طے کرنے والے معراج رسول نے کاوشِ پیہم اور عزمِ راسخ سے پے در پے کامیابیاں حاصل کر کے گویا حقِ وراثت ادا کر دیا۔ ستر کی دہائی میں جاسوسی ڈائجسٹ کا اجرا کیا اس کے بعد بالترتیب، سسپنس، پاکیزہ اور سرگزشت جاری کر کے تفریحی ادب (ڈائجسٹوں میں شائع ہونے والے ادب کو تفریحی ادب سے منسوب کیا جاتا ہے) میں معیاری جرائد کا اضافہ کیا۔ جاسوسی پبلیکیشنز سے جاری ہونے والے تمام ڈائجسٹ اپنے، اپنے مزاج کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں۔ اس شاندار کامیابی میں معراج رسول صاحب کی محنتِ شاقہ اور جوہر شناس نظروں کا بڑا کمال ہے۔ دورانِ گفتگو

معراج رسول صاحب، عذرا رسول اور ذیشان رسول کے ہمراہ ادارے کی خوبصورت تقریب میں جس میں اس وقت کے گورنر سندھ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) معین حیدر مہمان خصوصی تھے اور شوبز کی لیجنڈری شخصیت نیلوفر عباسی بھی شریک تھیں۔

اپنے مخاطب میں چھپے لکھاری کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کر کے اُس کے باطن کے قلمکار کو بڑی ہنرمندی سے اُجاگر کرتے۔ نہ صرف آشکار کرتے بلکہ لکھنے پر آمادہ بھی کرتے۔ آپ کی حوصلہ افزائی لکھنے والوں کے لیے ٹانک کا کام کرتے ہوئے اُن کے قلم کو ایک نئی توانائی بخشتی۔ اپنے ادارے سے شائع ہونے والی تحریروں میں ذاتی دلچسپی لیتے ہوئے اُن کو نہ صرف سراہتے بلکہ مفید مشورے دیتے اور لکھنے والوں کے لیے آسانیاں بھی فراہم کرتے۔ ممتاز مزاح نگار اور پاکیزہ کی سابقہ مدیرہ انجم انصار صاحبہ کی کتاب جلترنگ کتابی صورت میں شائع ہوئی تو آپ نے اس کا پیش لفظ لکھا۔ جب انجم انصار نے افسانچوں کا دوسرا مجموعہ شائع کرنے کا ارادہ کیا تو آپ نے بھرپور تعاون کیا۔ اور اس کا نام جلترنگ ۹۴ تجویز کیا اور پیش لفظ بھی لکھا۔ معراج صاحب کے اس وصف کا اعتراف کرتے ہوئے انجم انصار نے جلترنگ ۹۴ میں لکھا کہ ”کتاب لکھنے کی دوسری خاص وجہ معراج رسول صاحب بھی ہیں کہ کتاب لکھنا اتنا مشکل کام نہیں ہے جتنا کہ اس کو چھپوانا ہے مگر جلترنگ ۹۴ کے ٹائٹل سے لے کر اس کے چھپوانے کے تمام بکھیڑے معراج رسول صاحب نے از خود اُٹھائے۔ یہ اُن کی ادب دوستی کی اعلیٰ مثال تھی جس کے لیے شکریہ کا لفظ بہت چھوٹا ہے۔“

آج ادبی جرائد میں چھپنے والے کئی معتبر اور مستند نام ایسے ہیں جنھوں نے جاسوسی پبلی کیشنز کے تحت جاری ہونے والے ڈائجسٹوں سے لکھنے کا آغاز کیا۔ خود میں نے ڈائجسٹ پڑھنے کی ابتدا ماہنامہ پاکیزہ سے کی اور پاکیزہ کے لیے کئی افسانے لکھے۔ ہم سب رسالوں کو شوق سے پڑھتے تھے۔ یہ تمام ڈائجسٹ ماضی میں بھی ہمارے گھرانے میں شوق سے پڑھے جاتے تھے حال میں بھی یہی صورت حال ہے، قوی اُمید ہے کہ مستقبل میں بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ (ان شاء اللہ)

معراج صاحب نہایت لگن سے ایک بڑا اشاعتی ادارہ چلا رہے تھے۔ تسلسل سے آپ کا سفر جاری تھا کہ بیماری نے آپ کو آن لیا۔ طویل علالت اور صاحب فراش ہونے کے سبب آپ اپنی خداداد صلاحیتوں کو مزید بروئے کار نہ لا سکے ایسے میں آپ کی باوفا اور باصلاحیت شریک حیات عذرا رسول صاحبہ نے ہم سفری کا حق ادا کرتے ہوئے آپ کی تیمارداری کرنے کے ساتھ، ساتھ اپنے رفیقِ حیات کی منصبی ذمے داریاں بھی خوش اسلوبی سے نبھائیں۔ اس سفر میں معراج صاحب کے تربیت یافتہ، مخلص، محنتی اور فرض شناس رفقائے کار کی مخلصانہ مجاہدانہ کاوشیں اور بے لوث تعاون بھی لائقِ ستائش ہے۔ اللہ تعالیٰ معراج صاحب کے درجات بلند فرمائے اور ان کے ادارے کو مزید ترقی و کامرانی عطا ہو، الٰہی آمین۔

ہم سے ہمارے گوہر نایاب لے گیا...... ناہید فاطمہ حسنین

ڈائجسٹ کی دنیا میں اگر کوئی لیجنڈ ہے تو وہ بلاشبہ معراج رسول کی شخصیت ہے۔ معراج رسول ایک خوش قسمت انسان تھے۔ ان کا نام رکھنے والے ان کے والدین بھی کم خوش قسمت نہیں تھے۔ جنہوں نے اس قدر خوب صورت، پاکیزہ، معتبر اور محترم نام رکھا۔ نام شخصیت پر کتنا اثر انداز ہوتا ہے اس بات کی تائید ہر وہ شخص کرے گا جو معراج رسول صاحب سے ذاتی طور پر واقف ہے۔

جس زمانے میں ڈائجسٹ کا ایک الگ معیار ہوتا تھا۔ بہت ساری معلومات و خبروں میں ڈائجسٹ کو اعتبار حاصل تھا اس زمانے میں معراج صاحب نے چار ڈائجسٹ نکالے۔ بعد کو ایک اور ڈائجسٹ "دلکش" کے نام سے بھی نکالا جس کا سلسلہ بوجوہ جاری نہ رہ سکا۔ اور جس کے بند کیے جانے پر بہت سی لکھاری و قاری بہنوں نے باقاعدہ شکوہ بھی کیا۔ محبت بھری ناراضی کا اظہار بھی کیا۔ معراج رسول صاحب نے ان رسائل کو اپنا خونِ جگر دیا۔ اور اولاد کی طرح ان کی پرورش کی۔ انہوں نے اپنے ڈائجسٹس کے ذریعے اردو زبان و ادب کی جس طرح خدمت کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انہوں نے ان میں چھپنے کے لیے خالصتاً میرٹ کو بنیاد بنایا گیا۔ ان رسالوں میں اپنے دور کے نامور لکھاری لکھا کرتے تھے۔ جن میں انور فرہاد، محی الدین نواب، بشریٰ رحمٰن، رضیہ بٹ و ایم سلطانہ فخر اور بہت دوسرے شامل تھے۔ ٹیلی پیتھی، مسمریزم، ہپناٹزم کے موضوع پر محی الدین نواب نے جو کہانی لکھی وہ امر ہو گئی۔ غرض اگر میں معراج رسول کو جوہر شناس کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کے پاس ہیرے اور کوئلے کو پرکھنے والی آنکھ تھی۔ اور اسی شخصیت کا ایک انتخاب ہماری عذرا رسول ہیں۔

معراج صاحب کی شخصیت میں ایک سحر تھا۔ میری ان سے جب ملاقات ہوئی تب وہ بیماری سے نئے، نئے نبرد آزما ہو رہے تھے۔ دھیمے لہجے میں بات کرتے اور بات کرتے سے محسوس ہوتا وہ مسکرا رہے ہیں۔ ربِ اکبر نے ان کی زندگی ہی میں ان کے چہرے کو نور کی دولت عطا کر دی تھی۔ مذہبِ اسلام کی رو سے بھی بہترین شخص وہی ہے۔ جس کے اچھا ہونے کی گواہی اس کے گھر والے دیں۔ عذرا رسول کا شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو جب ان کی باتوں سے معراج رسول کی یاد کی خوشبو نہ آتی ہو۔

معراج صاحب نے ایک طویل عرصہ بیماری کا گزارہ۔ ان کے عزیز، رشتے دار اور ان کے چاہنے والے ان سے مسلسل اپنی محبت کا اظہار کرتے رہے۔ انتقال کے باوجود وہ آج بھی اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔ مجھ سمیت بہت سے ان کے بہی خواہ انہیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں۔ اللہ سے قوی امید ہے کہ وہ ان کے ساتھ اپنی رحمت کا معاملہ کرے اور جنت الفردوس میں ان کو مقام عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

مسرت اکرم...... سماجی کارکن، صحافی

معراج رسول ادب کی دُنیا کا چمکتا ستارہ تھے۔ جنہوں نے ماہنامہ پاکیزہ کے نام سے ایک ایسا ادب روشناس کروایا جس میں معاشرے کے اُن مسائل کی بھرپور نشاندہی کی گئی جو وقت کی ضرورت تھے۔ معراج صاحب بہت نرم مزاج تھے دوسروں کو اہمیت دیتے تھے۔ اُن سے ملنے کے بعد یہ احساس جاتا رہتا کہ کسی اجنبی سے ملاقات ہوئی ہے۔

خاموشی ...... وجدانِ الٰہی

تمام تر حمد و ثنا، تمام تعریف صرف تیرے لیے ہے میرے رب......! پروردگار عالم تو تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے۔ تُو حیؑ و قیوم ہے تو ساری چیزوں کا خالق اور مالک و مولیٰ ہے...... ہر چیز اپنے وجود و بقا میں تیری محتاج ہے تو کسی کا محتاج نہیں تو ایک ہے تو اکیلا ہے...... تو بے مثل و بے نظیر ہے۔

اے خالق و مالک...... جب تو نے ہمارے وجود کو چار عناصر پانی، مٹی، آگ اور ہوا سے زینت دیا ہے تو قبل اس کے موت ہمارے وجود کو بکھیر دے تو ہمیں زیور علم و عقل سے آراستہ کر کے اپنی محبت و معرفت ایسی عطا فرما کہ فنا و بقا اور وجودِ عدم کا کھٹکا اٹھ جائے اور دنیا و آخرت میں سوائے تیرے کوئی ہمارا مطلوب و مقصود نہ رہے۔

فنا کیسی بقا کیسی جب اس کے آشنا ٹھہرے
کبھی اس گھر میں آنکلے کبھی اس گھر میں جا ٹھہرے

اے میرے رب! تیرے پیارے حبیب اور ہمارے پیارے آقا سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ کے سرکار، ذات سراپا برکات، مجموعۂ حسنات و اعلیٰ خصائل ہیں۔ ان کی عزت و حرمت...... (احترام) کی بلندیوں کا ادراک محال ہے۔ بے شک ان کے فضائل و کمالات بے شمار ہیں تو انؐ واجب التعظیم ہستی پر لاکھوں درود و سلام انؐ کی آلؓ پر اور ان کے اصحابؓ پر......

آج ہمارا موضوع خاموشی ہے...... خاموشی کے لغوی معنی ہیں، چپ، سکوت۔ خاموشی کا مطلب یہ بھی ہے کہ فضول اور بے جا باتوں سے اجتناب کیا جائے...... اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو بولنے کی طاقت دی ہے اسے استعمال کرنے کے لیے شریعت نے حدود مقرر کی ہیں کہ اس قوتِ گویائی سے اللہ رب العزت کی حمد و ثنا کی جائے۔ کیونکہ قوت گویائی اللہ تعالیٰ کا ایک انمول عطیہ ہے اور اس کے اظہار کا ذریعہ زبان ہے اس قوت گویائی کی قدر صرف وہی شخص جانتا ہے جو اس نعمت، سے محروم ہے۔ اس لیے اللہ کا لاکھ، لاکھ شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بولنے کی قوت عطا فرمائی ہے۔ لہٰذا اس قوت گویائی سے ہر وقت اچھی بات کہنی چاہیے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرنی چاہیے۔ ضرورت کے مطابق زندگی میں لین دین کی بات کی جائے یعنی قوتِ گویائی کو نیکی اور اچھائی کے لیے استعمال کیا جائے اگر ایسا نہ کر سکے تو پھر خاموشی کی راہ اختیار کرنی چاہیے یعنی لغو باتیں نہ کی جائیں...... یعنی ضرورت کے مطابق بات چیت کرنے میں کوئی حرج نہیں...... البتہ ہمارے اردگرد ہر جگہ ایسا ماحول ہوتا ہے جہاں لوگ مخواہ بے جا باتوں میں ملوث رہتے ہیں۔ ان سے بچنے کے لیے خاموش رہنا بہتر ہے۔ زبان کو نیکی اور اچھائی کے لیے استعمال کیا جائے، زبان سے بری باتیں، برے کلمات، بدگوئی، فحش کلمات نہ نکالے جائیں اور نہ کوئی ایسی بات کی جائے جس سے دوسرے کی دل آزاری ہو...... کیونکہ جو فضول بات یا بے ضرورت بات زبان سے نکالی جاتی ہے اللہ تعالیٰ کے فرشتے اسے انسان کے اعمال نامے میں لکھ لیتے ہیں اور قیامت کے روز ان برے کلمات و الفاظ کی بنا پر انسان کو سزا دی جائے گی...... اور سزا سے بچنے کے لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاموشی کو ترجیح دی ہے۔ انسان کو خبردار رہنا

چاہیے کہ بات کرتے وقت صرف مقصد کی بات کی جائے۔ خاموش رہنے کے بعد جو بات کی جاتی ہے وہ سچائی کی دلیل بھی بن جاتی ہے۔

زبان دیکھنے میں تو ایک گوشت کا لوتھڑا ہے مگر اس کا تصرّف جو کچھ کائنات میں ظاہر و پوشیدہ ہے سب پر ظاہر ہے، اور وہ عقل کی نائب ہے کوئی چیز عقل سے باہر نہیں۔ عقل کے ذریعے سے وہم و خیال کو بھی تعبیر کرتے ہیں اور زبان کی وزارت تمام مملکتِ جسم میں جاری ہے۔ دل اس کا بادشاہ ہے اور یہ وزیر ہے چونکہ وہ دل کے مقابلے میں ہے اس سے باتیں لے کر اس کا راز ظاہر کرتی ہے۔ اگر غم کا اثر ہے تو دل سے رقّت و سوز لے کر نوحہ کرتی ہے اور جب دل میں سُرور ہے تو ویسے ہی ترانے گاتی ہے اور جب حق بات کہتی ہے منجانب اللہ تو دل روشن ہوتا ہے اور جب جھوٹ کہتی ہے تو دل اس سے اندھا ہوتا ہے بس دل کی درستگی و کجی زبان کی درستگی و کجی کے تابع ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ...... ''جو خاموش رہا اس نے نجات پائی۔''

''خاموشی حکمت ہے لیکن اس کے کرنے والے...... (خاموش رہنے والے) کم ہیں۔'' حضرت عقبہ بن عامرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا...... نجات کا راستہ کون سا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا...... ''اپنی زبان پر قابو رکھو اور تیرا گھر تجھے کافی ہونا چاہیے...... (یعنی گھر سے بے جا باہر مت نکل) اور اپنی غلطی پر (ندامت کر) آنسو بہا......''

جو شخص زبان پر قابو نہیں رکھتا...... شیطان اس سے نہ جانے کیا کچھ کہلوا لیتا ہے۔ اور اسے برے انجام کی طرف لے جاتا ہے...... حدیث شریف میں ہے کہ لوگ اپنی زبانوں کا بویا کاٹنے ہی کے لیے دوزخ میں ناک کے بل اوندھے ڈالے جائیں گے۔''

زبان کے شر سے وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جو اسے شریعت کی لگام پہنائے اور سنت کی زنجیریں ڈال دے...... کیونکہ زبان شیطان کا موثر ترین ہتھیار ہے۔

ایک حدیثؓ میں ہے کہ ''جسے سلامتی پسند ہو اسے خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔''

☆☆☆

حضرت عمر بن خطابؓ نے دیکھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنی زبان ہاتھ سے باہر کھینچ رہے ہیں۔ انہوں نے عرض کیا...... ''اے خلیفہء رسولؐ......! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' انہوں نے فرمایا...... ''اس نے مجھے بہت تنگ کیا ہے...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا...... ''جسم کا ہر عضو اللہ رب العزت سے زبان کی تیزی کی شکایت کرتا ہے۔''

آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا...... ''انسان کی اکثر غلطیوں کا منبع زبان ہے۔'' فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ ''جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے خیر کی بات کہنی چاہیے یا خاموش رہنا چاہیے۔''

''اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم کرے جو بولے تو نفع اٹھائے اور خاموش رہے تو سلامتی پائے۔''

ایک اعرابی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتلائیں جس سے جنت ملے...... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا...... ''بھوکے کو کھانا کھلا...... پیاسے کو پانی پلا...... اچھی بات کا حکم کر...... بری سے منع کر...... اگر تو ایسا نہ کر سکے تو زبان کو خیر کے علاوہ کوئی اور بات کہنے سے روک......''

ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ اپنی زبان کو خیر کے علاوہ ہر بات سے روک تو اس کے باعث شیطان پر غالب رہے گا۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا گیا کہ کوئی ایسا عمل بتلائیں جس سے جنت حاصل ہو...... فرمایا...... ''کبھی بولنا مت......'' سائل نے عرض کیا...... ''یہ تو ممکن نہیں ہے۔'' تب، فرمایا...... ''اگر بولنا ہی ضروری ہو تو خیر کے علاوہ کچھ مت بولنا......'' حضرت سلیمان علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ''اگر بولنا چاندی ہے تو چپ رہنا سونا......''

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ جس کا کلام زیادہ ہوتا ہے اس کی لغزشیں زیادہ ہوتی ہیں۔ جس کی لغزشیں زیادہ ہوتی ہیں اس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں، وہ آگ کا زیادہ مستحق ہوتا ہے۔''

☆☆☆

حضرت ابو بکر صدیقؓ اپنی زبان کو بولنے سے روکنے کے لیے منہ میں کنکر ڈال لیا کرتے تھے۔
حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ”اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں زبان کے علاوہ کوئی چیز لمبی قید کی محتاج نہیں ہے۔“
حضرت طاؤسؒ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ قول اکثر دہراتے فرماتے ہیں کہ ”زبان ایک درندہ ہے اگر اسے آزاد چھوڑ دے تو یہ پھاڑ جائے۔“
حضرت منصور بن المعتمرؒ نے چالیس برس ایسے گزارے کہ عشا کے بعد سے صبح تک ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا۔
حضرت ربیع بن خثیمؒ نے بیس برس تک دنیاوی گفتگو نہیں کی...... صبح اٹھ کر وہ قلم کاغذ اپنے پاس رکھ لیتے اور جو کچھ بولتے اسے لکھ لیتے پھر شام کو اس کا محاسبہ کرتے۔
خاموشی افضل اس لیے ہے کہ بولنے میں بے شمار آفات ہیں۔ غلطی، جھوٹ، غیبت، چغل خوری، نفاق، فحش گوئی، خود نمائی، لغو گوئی، بات بڑھانا، گھٹانا، ایذا دہی اور پردہ دری جیسے عیوب کا تعلق زبان سے ہے۔ زبان کو حرکت دینے میں کوئی تکلیف ہے اور نہ تھکن...... بلکہ بولنے میں لذت ملتی ہے۔ خود طبیعت بھی بولنے پر اکساتی ہے...... اور شیطان بھی کچھ کے لگاتار رہتا ہے...... جو لوگ بولنے کے عادی ہوتے ہیں وہ بہت کم موقع بے موقع بولنے سے اپنی زبان کو روک سکتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ ہمیں کہاں بولنا ہے اور کہاں خاموش رہنا ہے...... بلکہ ہر قسم کے نتائج سے بے پروا ہو کر بولے چلے جاتے ہیں۔
بہر حال سمجھنے کی بات یہ ہے کہ بولنے میں خطرات ہیں اور خاموشی میں ہر خطرے سے حفاظت ہے...... اسی لیے اس کی فضیلت بھی زیادہ ہے۔
خاموشی کے بے شمار فائدے ہیں، ہمت مجتمع رہتی ہے، خیالات میں انتشار نہیں ہوتا، وقار بنا رہتا ہے، فکر، ذکر اور عبادت کے لیے فراغت رہتی ہے۔ دنیا میں بولنے کے غلط نتائج سے اور آخرت میں اس کے محاسبے سے نجات ملتی ہے۔

☆☆☆

حضرت ضحاکؒ فرماتے ہیں ”کہ میں نے بزرگوں کو یوں پایا کہ وہ خاموشی اور تقویٰ سیکھتے تھے اور آج لوگ کلام سیکھتے ہیں۔“
”ایک خراسانی عالم دین کی وفات قریب تھی کسی نے عرض کیا ہمیں ایسے شخص کی طرف راہنمائی کر جائیں کہ آپؒ کے بعد ان کے پاس بیٹھا کریں...... آپؒ نے فرمایا کہ فلاں کے پاس جو کہ ایک خاموش طبع زاہد و عابد تھے...... مگر اپنے علم کی وجہ سے مشہور نہ تھے...... کسی نے کہا کہ ان کے پاس اس قدر علم نہیں کہ ہم جس علم کی بات پوچھیں وہ جواب دے سکیں...... انہوں نے فرمایا...... میں جانتا ہوں مگر ان کے پاس اس قدر تقویٰ ہے کہ جس بات کو وہ نہیں جانتے اس کے بارے میں کلام نہیں کرتے۔“
☆ خاموشی عالم کی زینت اور جاہل کا پردہ ہے۔
☆ گفتگو کرنے سے آدمی کا پتا چل جاتا ہے کہ وہ کتنا متقی ہے۔
☆ جو بول بھی مزاح یا بلا مقصد طریقے سے زبان سے ادا ہو اس پر پانچ طرح سے گرفت ہوتی ہے اسے کہا جاتا ہے کہ......
۱۔ تو نے یہ کلمہ کیوں کہا؟ کیا یہ بات تیری ضرورت کی تھی؟
۲۔ جب تو نے یہ کلمہ کہا تو کیا تجھے اس سے کوئی فائدہ ہوا......؟
۳۔ اگر تو یہ کلمہ نہ کہتا تو کیا تجھے کچھ نقصان ہوتا؟
۴۔ تو خاموش کیوں نہ رہا تا کہ اس کے انجام سے بچ جاتا؟
۵۔ تو نے اس کی جگہ ”سبحان اللہ والحمدللہ“ کیوں نہ کہا؟ تا کہ خوب ثواب کماتا۔
تو یاد رہے کہ زبان سے نکلنے والے ہر لفظ کے لیے تین طرح سے پوچھا جائے گا۔
۱۔ کیوں؟
۲۔ کیونکر......؟
۳۔ کس کے لیے......؟
اگر تینوں سے نجات مل گئی تو ٹھیک ورنہ حساب کے لیے طویل وقت ہے۔ شیطان کہتا ہے کہ اس کی طرف دیکھو اور اس کا سکوت مجھ پر اس کے کلام سے زیادہ سخت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرمان ہے کہ...... ''تمام بھلائی تین چیزوں میں ہے...... خاموشی، کلام اور نظر میں...... جس کی خاموشی سوچ اور فکر میں نہ ہو وہ غلطی پر ہے۔ جس کا کلام ذکر نہ ہو...... وہ کلام لغو ہے۔ اور جس کی نظر عبرت کی نہ ہو وہ نظر فضول ہے۔

سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ ''خاموشی پر قائم رہنا ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔''

آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا...... ''اس شخص پر جنت حرام ہے جو فحش گوئی (بے حیائی کی بات) سے کام لیتا ہے۔''

بعض لوگ ایسے ہوں گے کہ جب انہیں دوزخ میں لے جائیں گے تو ان کے منہ سے ایسی سخت بدبو اور تعفن نکل کر دوزخ میں پھیل جائے گا کہ خود اہلِ دوزخ چیخ اٹھیں گے اور پوچھیں گے کہ یہ کون لوگ ہیں؟ تب انہیں بتایا جائے گا کہ یہ وہ بدبخت ہیں جو فحش کلامی سے کام لیتے تھے...... حضرت ابراہم بن میسرہؒ کہتے ہیں کہ فحش کلامی کرنے والا قیامت کے دن کتے کی شکل میں آئے گا۔

حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا ہے کہ ''کم بولنا حکمت ہے۔ اور کم کھانا صحت ہے...... کم سونا عبادت ہے اور عوام سے کم ملنا عافیت ہے۔''

مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے ہیں کہ'' آدمی کی قابلیت زبان کے نیچے پوشیدہ ہے'' عقل مند آدمی اگر خاموش رہے تو قدرت الٰہی میں فکر کرتا ہے اور جب نگاہ اٹھا کر دیکھے تو عبرت حاصل کرتا ہے۔

اپنی لاعلمی کے اظہار کو کبھی برا نہ سمجھو......

خاموشی انسان کو باوقار بناتی ہے جبکہ بے ہودہ و بدگوئی سے ملامت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

کئی کلام ایسے ہیں جن کا جواب صرف خاموشی ہے۔

☆☆☆

ایک بار حکیم لقمان، حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ زرہ بنا رہے تھے۔ حضرت لقمان یہ دیکھ کر تعجب کرنے لگے۔ انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام سے پوچھنے کا عزم کیا کہ معلوم کریں کیا بنا رہے ہیں اور کس مقصد کے تحت؟ مگر حکمت نے سوال کرنے سے منع کیا لہٰذا آپ خاموش رہے...... حتیٰ کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے زرہ بنا کر اسے پہنا اور فرمایا...... یہ لڑائی کے لیے بہترین چیز ہے اور بنانے والا بھی کیا خوب ہے...... حضرت لقمان کہنے لگے کہ خاموشی بھی حکمت ہے مگر اسے اپنانے والے بہت کم ہیں۔

حکیم لقمان پہلے حبشی غلام تھے...... پہلی، پہلی حکمت جو اُن کی ظاہر ہوئی وہ یہ تھی کہ ان کے آقا نے کہا...... یہ بکری ذبح کرو اور اس کے گوشت کا بہترین ٹکڑا ہمارے پاس لے کر آؤ...... آپ دل اور زبان لے آئے...... ایک بار آقا نے پھر کہا کہ بکری ذبح کرو اور گوشت کا بدترین حصہ کاٹ لاؤ...... آپ پھر وہی دل اور زبان لے آئے...... آقا نے وجہ پوچھی تو آپؒ نے جواب دیا...... کہ یہ دونوں درست ہو جائیں تو پورے بدن میں ان سے بڑھ کر اور کوئی حصہ عمدہ نہیں...... اور اگر یہی خراب ہو جائیں تو ان سے بڑھ کر بدن کا اور کوئی حصہ خبیث نہیں......

حضرت داؤد طائیؒ کے تائب ہونے کا واقعہ اس طرح منقول ہے کہ کسی گویّے نے آپ کے سامنے یہ شعر پڑھا۔

کون سا چہرہ خاک میں نہیں ملا
اور کون سی آنکھ زمین پر نہیں بری

یہ شعر سن کر آپؒ عالم بے خودی میں حضرت امام... ابوحنیفہؒ کی خدمت میں پہنچ گئے اور اپنا پورا واقعہ بیان کر کے کہا کہ میری طبیعت دنیا سے اچاٹ ہو چکی ہے اور ایک نامعلوم سی شے قلب کو مضطرب کیے ہوئے ہے...... یہ سن کر امام صاحب نے فرمایا...... کہ گوشہ نشینی اختیار کرو چنانچہ اسی وقت سے آپ گوشہ نشین ہو گئے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد امام صاحب نے فرمایا...... کہ اب یہ بہتر ہے کہ لوگوں سے رابطہ قائم کر کے ان کی باتوں پر صبر وضبط سے کام لو۔ چنانچہ ایک سال تک تعمیلِ حکم میں بزرگوں کی صحبت میں رہ کر ان کے اقوال سے بہرہ ور ہوئے لیکن خود ہمیشہ خاموش ہی رہتے تھے۔

حضرت سفیان ثوریؒ کا ہمسایہ وفات پا گیا آپ اس کی تعزیت اور نماز جنازہ کے لیے تشریف لے گئے...... جنازے کے بعد مرحوم کے لواحقین اور دیگر احباب اس کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے

ملار ہے تھے حالانکہ سب یہ جانتے تھے کہ مرنے والا سخت گناہ گار اور بدکار انسان تھا۔

حضرت سفیان ثوریؒ نے تمام احباب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا...... کہ اللہ تعالیٰ کو منافقت سخت ناپسند ہے۔ تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ سخت قسم کا گناہ گار اور بدکار شخص تھا اور کل تک آپ لوگ اس کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ آج بعد از موت اس کی جھوٹی تعریف کر کے جھوٹ اور منافقت کا ارتکاب کیوں کرتے ہو......

لوگوں نے جواب دیا کہ حضرت! مرنے والا تو اب اس دنیا میں موجود نہیں تو اس کی برائی کا کیا ذکر اب اس کی اچھائی اور تعریف جو کہ بلاشبہ جھوٹی ہے کر دینے میں کیا حرج ہے؟ حضرت سفیان ثوریؒ نے جواب دیا کہ بے شک آپ اس کی برائیوں اور گناہوں کا ذکر مت کرو اور یاد نہ کرو لیکن جھوٹی تعریفیں بھی نہ کرو...... بلکہ احسن ترین عمل خاموشی ہے...... وہ تم اختیار کرو جس میں تمہاری بھی فلاح ہے۔

☆☆☆

حضرت داؤد طائیؒ اپنی بیماری کی حالت میں اپنے حجرے کے اندر ہی خاموشی کے ساتھ گوشہ تنہائی میں بیٹھ گئے۔ وہ نہ اپنی بیماری کا کسی سے ذکر کرتے اور نہ کسی سے کچھ طلب کرتے...... لوگوں نے کچھ طلب کرنے کے لیے اصرار کیا تو آپ نے فرمایا...... میرے لیے یہ بات ... بے حد ندامت کا باعث ہوگی کہ میرا مالک، میرا پروردگار مجھے کسی دوسرے کے سامنے سائل کی صورت میں دیکھے۔ لوگوں نے پھر کہا کہ اس دوران آپؒ اپنی بیماری کے حوالے سے اپنے اللہ سے تو دعا فرما سکتے ہیں...... لیکن یہاں بھی حضرت داؤد طائیؒ نے جواب دیا کہ یہ بھی میرے لیے ناممکن اور محال ہے کہ اپنے اس رب سے دعا کروں کہ جس نے خود میرے اندر یہ بیماری پیدا کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ مرض اپنے کمال لطف و کرم سے مہربانی اور ظاہری و باطنی علوم کے باوجود بھی مجھے دیا ہے تو میں اللہ کا کس طرح کا بندہ کہلاؤں گا کہ جو اللہ کے اختیار پر اپنی صحت کی خاطر اپنی مرضی حاصل کرتا ہے...... میں اپنے حال کے محرم سے کس طرح شفا کی درخواست کروں؟ کیونکہ یہ مرض اور بیماری اسی اللہ کے حکم سے ہے...... بیماری عطا کرنا بھی پروردگار کا کام ہے میں اللہ تعالیٰ کے اس کرم پر سراپا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے اس لائق سمجھ کر یہ کرم فرمایا...... بے شک اللہ تعالیٰ ہی کو ہر طرح کی حمد وثنا زیبا ہے۔ بندوں پر صرف احکام الٰہی کی بجا آوری لازم ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا...... وعظ خالصۃً اللہ کر ورنہ تیرا چپ رہنا ہی بہتر ہے۔ کوشش کر گفتگو کی ابتدا تیری طرف سے نہ ہوا کرے اور تیرا کلام جواب بنا کرے...... نیز فرمایا...... گونگا پن اپنی عادت، گمنامی اپنا لباس اور مخلوق سے گریز اپنا مقصود بنا لے...... اور اگر تجھ سے ہو سکے تو زمین میں سرنگ کھود کر اس میں بیٹھ جا۔ اور یہ عادت اس وقت تک رکھ جب تیرا ایمان بالغ اور جوان نہ ہو جائے۔ فرمایا...... خلوت میں خاموشی، مردانگی نہیں، جلوت میں خاموش رہ...... حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا...... شعر خوانی اور قصہ گوئی بدبختوں کے نصیب کر اور اپنے لیے خاموشی سرمایہ بنا۔

☆☆☆

حضرت سماکؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر بن سمرہؓ سے دریافت کیا کہ کیا آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ انہوں نے فرمایا ہاں...... مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت زیادہ خاموش رہا کرتے تھے...... آپ کے اصحاب بات چیت کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبسم فرمایا کرتے تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قریب سے ایک خنزیر گزرا...... آپ نے اس سے کہا...... سلامتی کے ساتھ گزر جا...... لوگوں نے عرض کیا...... آپ اس ناپاک جانور سے ایسا فرماتے ہیں...... آپ نے جواب دیا...... مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ میری زبان برائی کی عادی ہو جائے۔

حضرت ابو الوردا فرماتے ہیں کہ ہمیشہ لڑنا جھگڑنا آدمی کے گناہ گار ہونے کے لیے کافی ہے۔

آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ فحش گوئی سے بچو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو فحش گوئی اور بے ہودہ گوئی

پسند نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفار اور مشرکین کو بھی گالی دینے سے منع فرمایا جو بدر کی جنگ میں مارے گئے تھے۔ فرمایا...... ''انہیں گالی مت دو اس لیے کہ تم جو کہتے ہو وہ ان تک نہیں پہنچتا البتہ تم زندوں کو تکلیف پہنچاتے ہو۔''

حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا...... ''لوگوں سے کم اور اللہ سے زیادہ باتیں کرو کہ شاید تمہارا دل اللہ کو دیکھ لے۔''

☆☆☆

حضرت حسن بصریؒ سے لوگوں نے کہا کہ ایک شخص ہے جو ہمیشہ ستون کی آڑ میں رہتا ہے۔ آپؒ نے فرمایا...... کہ جب وہ موجود ہو تو مجھے اطلاع دینا...... ایک دن لوگوں نے خبر دی کہ وہ شخص موجود ہے آپؒ اس شخص کے پاس گئے۔ اور پوچھا ''تم ہمیشہ اکیلے کیوں رہتے ہو لوگوں سے ملتے جلتے کیوں نہیں......'' اس نے جواب دیا'' کہ ایک بڑا کام مجھے پیش آگیا ہے اس نے خلق سے جدا کر دیا ہے۔'' تب حضرت حسن بصریؒ نے اس سے پوچھا۔

''تم حسن بصریؒ سے کیوں نہیں ملتے......؟ اور اس کی بات کیوں نہیں سنتے......؟'' اس نے جواب دیا...... ''جو کام مجھے درپیش ہے اس نے حسنؒ اور سب لوگوں سے باز رکھا ہے...... کوئی وقت ایسا نہیں ہوتا کہ حق تعالیٰ مجھے نعمت نہ دے اور میں گناہ نہ کروں اور اس کی نعمت کا شکر اور اپنے گناہ کا استغفار کیا کرتا ہوں نہ حسنؒ کے پاس جاتا ہوں اور نہ خلق سے تعلق رکھتا ہوں......''

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا...... کہ'' اپنی جگہ بیٹھے رہو...... تم حسنؒ سے زیادہ فقیہہ ہو......''

آج ہم اپنے معاشرے کا جائزہ لیں تو دیکھیں کہ محض تفریحی گفتگو آج کے دور کا خاص مشغلہ ہے...... اکثر اس مشغلے کے لیے محفلیں سجاتے ہیں۔ ان مجلسوں کا موضوع و مقصد باطل ہوتا ہے...... کسی کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ کسی کے عیوب ظاہر کیے جاتے ہیں...... کسی میں عیوب تلاش کیے جاتے ہیں...... کسی کے خلاف سازشیں کی جاتی ہیں......

غرضیکہ کوئی بھی ایسی مجلس گناہ سے خالی نہیں...... غیبتیں، چغل خوریاں ان محفلوں میں خاص طور سے ہوتی ہیں۔

اور یہ غور کریں کہ کس قدر خطرناک ہیں یہ ہمارے لیے...... ان سے نجات حاصل کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ آدمی دینی مہمات اور دنیاوی ضروریات سے متعلق گفتگو پر اکتفا کرے...... کیونکہ باطل امور کا ذکر ایک خطرناک آفت ہے...... روزِ حشر اس پر انکشاف ہوگا کہ جس بات کو وہ معمولی سمجھ رہا تھا وہ اس کے لیے کتنی تباہی لے کر آئی ہے...... اس لیے خاموشی ہی میں انسان کی سلامتی، عاقبت اور نجات ہے...... اللہ رب العزت ہمیں خاموش رہنے کی توفیق عطا کرے۔ آمین...... الٰہی...!

حرفِ آخر:

اپنے رحمان اور رحیم رب کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ اس مضمون میں کہیں کوئی کمی...... کوئی غلطی کوئی کوتاہی دانستہ یا نادانستہ ہوگئی ہو جو آقا ﷺ کے فرمودات میں کہیں غلطی یا لغزش ہوگئی ہو تو اے میرے پیارے مہربان رب...... مجھے اس خطا پر معاف فرمادے...... معاف فرمادے کہ تو معاف کرنا پسند فرماتا ہے۔

ان تمام ہستیوں کی شکرگزار ہوں کہ جن کی کتب سے میں نے ان مضامین کا انتخاب کیا...... اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے...... آمین۔

۱۔ احیاء العلوم...... حصہ سوئم۔ حضرت امام ابو حامد محمد الغزالیؒ

۲۔ الرسالۃ القشیریۃ امام ابوالقاسم القشیریؒ
تصوف کا انسائیکلوپیڈیا

۳۔ بہشتی زیور...... علامہ عالم فقری

۴۔ اللہ کا فقیر...... علامہ عالم فقری

۵۔ سیرۃ الاولیا...... جناب عبدالرب درویش

۶۔ فیضان سنت...... علامہ ابو البلال محمد الیاس قادری

۷۔ اسلامی تربیتی نصاب...... پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری، جلد دوئم
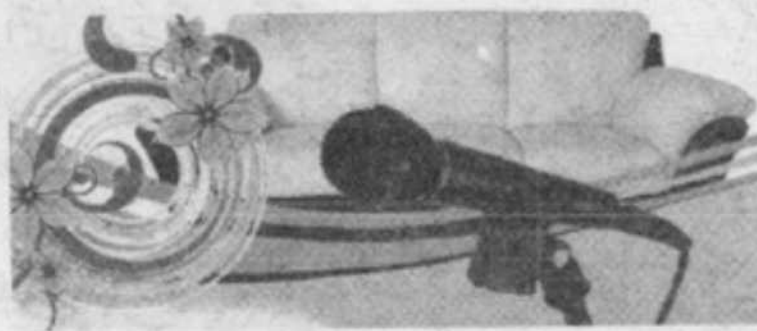
ہم نیٹ ورک کی سینئر منیجر،
مدیرہ مصالحہ فوڈ میگزین،
روشن ضمیر اور باوقار صحافی

شازیہ انوار

شازیہ انوار نے نوجوانی میں کوچۂ صحافت میں قدم رکھا اور صحافت کی خارزار وادی میں ہر خوف سے بے نیاز نہایت اعتماد اور لگن سے اپنے قدم جمائے رکھے۔ آپ نے اگر مختلف مزاج کے اخبارات میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے تو مصالحہ فوڈ میگزین میں بھی اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ باکمال مترجم ہیں، تبصرہ نگاری پر آپ کو دسترس حاصل ہے۔ سماجی موضوعات پر نہایت چابکدستی سے قلم اٹھاتی ہیں،

خواتین کے مسائل اجاگر کرنے اور ان کے حل کے بیان میں آپ کا قلم بہت مؤثر ہے۔ شازیہ محنتی بھی ہیں اور اپنے منصب سے دیانتدار بھی۔ اصولوں پر سمجھوتا آپ نے کبھی نہیں کیا۔ اپنی ذات میں انجمن، شازیہ ایک فرماں بردار بیٹی، نہایت محبت کرنے والی بہن، باوفا شریکِ حیات اور مثالی ماں بھی ہیں۔ اپنے ادارے اور احباب میں ہر دلعزیز ہیں۔ ہماری پاکیزہ کی مہمان شازیہ انوار نے زندگی کے سفر کی پُر پیچ راہوں میں کیسے بلند ہمتی اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا یہ سب آج ہم نذرِ قارئین کر رہے۔

پاکیزہ ✧...... آپ اپنے بچپن کے حوالے سے کیا کہیں گی؟

شازیہ ❖...... بہت خوب صورت، ناز نخروں سے بھرپور، محبتوں اور چاہتوں سے لبریز اور انتہائی یادگار کیونکہ یہ یادیں میری ماں سے جڑی ہیں جو بہت جلد ہم سے جدا ہو گئیں۔

پاکیزہ ✧...... آپ کے کتب بینی کے رجحان کو کیسے جلا ملی؟

شازیہ ❖...... مجھے لگتا ہے کہ جس گھر میں مائیں کتب بینی کرتی ہیں وہاں بچوں میں بھی مطالعے کا رجحان فروغ پاتا ہے۔ میری والدہ ڈائجسٹ اور دینی کتب پڑھا کرتی تھیں جبکہ انہیں اخبار پڑھنے کا بھی بے حد شوق تھا، ان کے ساتھ ہم بھی اس جانب مائل ہوئے۔ مجھے اردو زبان سے عشق تھا اور آج بھی ہے۔ اس لیے میرا سفر ڈائجسٹ سے آگے بڑھا اور لکھنے لکھانے کی جانب بھی مائل ہوئی۔ کم عمری میں ایسے استاد بھی نصیب ہوئے جنہوں نے کتب بینی کے شوق کو ہوا دی۔

پاکیزہ ✧...... پہلی تحریر کب اور کہاں شائع ہوئی؟

شازیہ ❖...... پہلی تحریر کالج کے جریدے میں شائع ہوئی۔ اس وقت میں فرسٹ ائیر کی طالبہ تھی اور میں نے ''مرزا غالب سے ایک ملاقات'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، یہ غالب کے اشعار کو حالات حاضرہ سے جوڑتے ہوئے ایک دلچسپ تحریر تھی جسے بے حد سراہا گیا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ مجھ میں لکھنے کے کچھ جراثیم پائے جاتے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... قلم دوستی نے آنرز کے لیے شعبۂ صحافت کی راہ دکھائی یا مستقبل میں صحافی بننے کی خواہش نے؟

شازیہ ❖...... صحافی بننے کی خواہش نے۔ دیکھیے قلم سے دوستی ایک الگ معاملہ ہے اور صحافت ایک علیحدہ شعبہ ہے۔ یہ قلم سے وہ دوستی ہے جس پر بہت سی ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ دونوں میں خیال اور حقیقت کا فرق ہے اور یہ فرق مجھے بھی اس وقت پتا چلا جب میں باقاعدہ اس شعبے کی طرف آئی۔ صحافت میں آپ کا ایک، ایک لفظ عوام کی امانت ہوتا ہے، آپ جو بھی لکھ رہے ہیں وہ لوگوں تک اسی سچائی سے پہنچنا چاہیے جس طرح سے وہ ہے۔ اس میں آپ اپنی جانب سے کمی بیشی نہیں کر سکتے اور جو ایسا کرتے ہیں صحافتی بد دیانتی کے مرتکب

صدر ہم نیٹ ورک سلطانہ صدیقی کے ہمراہ ایک تقریب میں

فاطمہ ثریا بجیا سے گفتگو کے دوران

ہوتے ہیں جبکہ قلم سے دوستی کے دیگر معاملوں میں ''لفظوں کی گرہیں'' لگائی جاسکتی ہیں۔ دل کی باتیں کہی جاسکتی ہیں۔

پاکیزہ ✧......صحافت میں آنرز کے بعد ایم اے کے لیے شعبۂ اردو کا انتخاب کیوں کرلیا؟

شازیہ ❖......جیسا کہ میں نے کہا کہ اردو زبان میرا عشق ہے تو اس عشق نے مجھے اس جانب مائل کیا۔ کچھ یہ بھرم بھی کہ صحافی تو میں بن ہی جاؤں گی کیونکہ صحافت کے جراثیم مجھ میں بہت متحرک ہیں البتہ زبان پر دسترس بغیر پڑھے ممکن نہ ہوسکے گی۔ میں نے اردو ادب میں اعلیٰ تعلیمی سند حاصل کرنے کی چاہ میں اس شعبے کا انتخاب کیا۔ میرا گمان تھا کہ اردو میں ماسٹرز کرنا میرے لیے دشوار گزار نہ ہوگا لیکن سچ جانیے کہ علم اور وہ بھی زبان کا یعنی ''کریلا اور وہ بھی نیم چڑھا'' کے مترادف ہے۔

پاکیزہ ✧......صحافت کے میدان میں قدم رکھا تو کسی قسم کی مخالفت یا دشواری کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا؟

شازیہ ❖......بے حد مخالفتیں اور اس سے بھی زیادہ دشواریاں۔ خوش قسمتی سے والد عام نہیں بلکہ بے حد... خاص انسان ہیں۔ انہوں نے ہمیں زندگی میں آگے بڑھنے کا وہ حوصلہ دیا جو خوش نصیب بیٹیوں کے حصے میں ہی آتا ہے، تاہم اردگرد رہنے والے صحافت کو ''آوارہ گردی'' کا شعبہ سمجھتے تھے گو کہ لوگوں کو میرے سامنے کہنے کا کبھی یارانہ ہوا لیکن میرے کانوں تک باتیں پہنچ ہی جایا کرتی تھیں۔ میرے والد کا اعتماد میرے لیے وہ طاقت تھی جس کے سہارے مجھے مخالفتیں اور دشواریاں بے معنی لگتیں۔

پاکیزہ ✧......صحافت کے کس اصول پر عمل کرنے سے کامیابی آپ کے ہم رکاب رہی؟

شازیہ ❖......سخت محنت، بے خوفی، بہادری اور سچائی۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں نے ہمیشہ بے خوفی اور سخت محنت سے کام کیا ہے، اب کامیاب رہی یا نہیں یہ تو میں نہیں کہہ سکتی لیکن میری تمام تر مشکلات ان ہی اصولوں پر عمل کے ذریعے حل ہوئیں۔ میں کسی کے آگے پیچھے پھر کر اپنے مسائل حل نہیں کراسکتی۔ جو ہے جیسا ہے ویسا کہنے کی عادت ہے جو زندگی میں مشکلات پیدا کرنے کا سبب بھی بنتی ہے۔ میں دوستی میں لحاظ، مروت اور پردے رکھ سکتی ہوں لیکن پیشہ ورانہ زندگی میں نہیں۔

پاکیزہ ✧......کامرس اور کامرس سے متعلق مضامین کبھی آپ کے نصاب کا حصہ نہ رہے ایسے میں کامرس کے دو اخبارات کی ادارت کا کمال کیسے کر دکھایا؟ کتنے پاپڑ بیلنے پڑے؟

شازیہ ❖......سچ کہا، پاپڑ بیلنے پڑے۔ بدقسمتی کہہ لیں کہ میں ایک طویل مدت تک کل وقتی ملازمت نہیں کرپائی۔ گھر اور تعلیم کے ساتھ عملی میدان میں فعال ہونے کی تڑپ تھی لیکن گھریلو ذمے داریوں اور تعلیمی مصروفیات کی بنا پر میں نے ہمیشہ ایسے اداروں کے ساتھ کام کیا ہے جہاں میں اپنی شرائط پر کام کرسکوں۔ ایسے میں ایک کامرس کے ہفت روزہ اخبار سے وابستہ ہوئی، میرا شعبہ نہیں تھا اور دلچسپی بھی نہیں لیکن کام کیا (کرتے کرتے کام آہی جاتا ہے) جہاں مشکل درپیش آتی والد صاحب سے مدد بھی لیتی جو ایک بینکر ہیں۔ یہ بات بھی بہت اہمیت کی حامل ہے کہ

کامرس صحافت کا وہ واحد شعبہ ہے جہاں آپ کا واسطہ سو فیصدی پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے لوگوں سے پڑتا ہے یعنی اگر آپ بینک کی ٹریڈ یونین کے بھی کسی بندے سے رابطہ کرتے ہیں تو وہ بھی کم از کم انٹر پاس تو ہوگا ہی اس لیے کسی بھی قسم کا ناخوشگوار تجربہ نہیں ہوا اور یہی بات آگے بڑھنے کا سبب بھی بنی۔ یہاں میں کچھ لوگوں کا ذکر نہ کروں تو زیادتی ہوگی کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے تجربے سے مجھے بہت کچھ سکھایا۔ مسلم کمرشل بینک کے سابق صدر حسین لوائی صاحب، نیشنل بینک کے سابق صدر انعام الٰہی صاحب، حبیب بینک کے سابق صدر آغا فصیح صاحب اور ذاکر محمود صاحب، یو بی ایل کے سابق صدر عزیز میمن صاحب، سابق گورنر اسٹیٹ بینک ڈاکٹر عشرت حسین، الائیڈ بینک کے خالد لطیف، حبیب بینک کے حبیب الدین جنیدی صاحب اور نادرہ خاتون، بابر نواز (مرحوم) یو بی ایل کے عزیز اللہ میمن صاحب، مسلم کمرشل بینک کے عثمان غنی (مرحوم) اور نیشنل بینک کے گل فراز صاحب، اسٹیٹ بینک کے لیاقت علی ساہی سمیت بے شمار لوگ ایسے ہیں جنہوں نے مجھے کامرس کے اسرار و رموز سکھائے۔

پاکیزہ ✧......فوڈ میگزین کا مزاج بالکل مختلف ہوتا ہے۔ قطرے سے دریا بننے تک کے مراحل کیسے طے کیے؟

شازیہ ❖......بالکل مختلف اور جو کام میں اس سے قبل کرتی آئی تھی اس کے مقابلے میں نسبتاً سہل...... (یہ میں نے سمجھا تھا) جب کام شروع کیا تو علم ہوا کہ یہ بھی ایک دنیا ہے، ایک ایسی دنیا جس کے ڈانڈے ہر گھر سے جڑے ہیں۔ قبل ازیں تو میں نے ڈائجسٹوں کے آخری صفحات پر شائع ہونے والی کھانوں کی تراکیب بھی کبھی نہیں پڑھی تھیں۔ کھانا پکانے سے زیادہ شغف بھی نہیں تھا۔ کام تو یہ سوچ کر کیا تھا کہ بنی بنائی ریسیپیز ملیں گی جنہیں پڑھ کر لے آؤٹنگ کے لیے دینا ہوگا۔ چند مضامین لکھ لیے جائیں گے اللہ، اللہ خیر صلاّ

لیکن جناب جب کام شروع کیا تو مزاج کے مطابق اس میں تبدیلی، بہتر سے بہتر کی خواہش نے مکمل طور پر اس سمت پر گامزن کر دیا۔ اب جو تراکیب ہمارے پاس آتیں، بے شک وہ ہمارے شیف کی تحریر کردہ ہوتیں لیکن سلطانہ آپا کی خواہش تھی کہ جب ہم انہیں شامل اشاعت کریں تو وہ اتنی واضح اور غلطی سے پاک ہوں کہ ایک جانب پکانے والا کسی الجھن کا شکار نہ ہو اور دوسری جانب وہ بہترین کھانا پکا کر اپنے گھر والوں کے سامنے رکھے۔ ہر ترکیب یہ سوچ کر شائع کی جائے کہ پکانے والا پہلی بار چولھے کے آگے کھڑا ہوا ہے۔ یہ ایک قدرے مشکل اور ذمّے داری والا کام تھا اور مقصدیت بھی واضح تھی اس لیے میگزین کی تیاری میں پورا مہینہ درکار ہوتا ہے چہ جائیکہ ہم سمجھے بیٹھے تھے کہ دو دن کا کام ہے۔ ابتدا سے آج تک پہلی سطر سے آخری سطر تک میں خود تحریر کرتی رہی ہوں۔ کوئی سب ایڈیٹر، پروف ریڈر یہاں تک کہ کوئی معاون بھی میرے ساتھ نہیں ہوتا۔ آج الحمدللہ ہم میگزین کی اشاعت کے تیرہ سال مکمل کر چکے ہیں لیکن آج بھی مجھے اس پر کام کرنے کے لیے تسلسل سے تین ہفتے درکار ہوتے ہیں۔ یہ بات ہر وقت دھیان میں رہتی ہے کہ کہیں کوئی عمل لکھنے سے رہ نہ جائے، ہماری ایک چھوٹی سی غلطی پکانے والے کی محنت اور اس کے سامان کی بربادی کا سبب بن سکتی ہے۔ مضامین کی اشاعت میں بھی اس بات کا خاص خیال رکھتی ہوں کہ کوئی ایسی بات نہ شائع ہو جس سے قارئین کو کسی بھی قسم کا نقصان ہو یا ہماری کوئی تحریر انہیں منفی راہ پر گامزن کرے۔

پاکیزہ ✧......کُک بکس کی ادارت اس سے بھی سوا ہے۔ کُک بک کی مدیرہ کی حساس ذمّے داری آپ نے کیسے نبھائی؟

شازیہ ❖......کُک بکس کا سلسلہ بھی "مصالحہ" کی وجہ سے ممکن ہوسکا۔ ادارے نے کُک بکس کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور بار ہم نے لگایا۔ دیکھیے کھانے پکانے سے متعلق کتابیں لوگوں کے ہاں برسہا برس تک

محفوظ رہتی ہیں، اس لیے اس حوالے سے کیا جانے والا کام زیادہ حساسیت کا متقاضی ہوتا ہے۔ ایک کتاب کی تیاری کم از کم 6 مہینے لیتی ہے اور اس دوران کتاب 8 سے 10 مرتبہ ادارتی مراحل سے گزرتی ہے۔ مشکل کام ہے لیکن جب آپ کسی کام کو کرنے کا عہد کرتے ہیں تو اللہ کی مدد بھی شاملِ حال ہو جاتی ہے۔

پاکیزہ ✧......آپ کو روزنامہ، اخبار کے ہفت روزہ میگزین اور ماہانہ مجلّے کی ادارت کا طویل تجربہ ہے۔ تینوں کی ادارت میں بنیادی فرق کیا ہے؟

شازیہ ❖......تینوں بے حد مختلف کام ہیں۔ اخبار کا ادارتی صفحہ الامان الحفیظ۔ روزنامہ خبریں میں مرکزی اداریہ تو ہیڈ آفس لاہور سے آتا تھا جبکہ میں کراچی اسٹیشن کی جانب سے شذرہ لکھتی تھی جو پورے سندھ کی نمائندگی کرتا تھا اور اس زمانے میں کراچی کی سیاست پورے ملک کی سیاست پر بھاری تھی۔ کچھ بھی لکھنے سے پہلے ہزار بار سوچنا پڑتا تھا، باریک بینی سے دیکھنا پڑتا تھا کہ صوبے کے لیے کون سی بات، واقعہ، حادثہ اہم ہے۔ جس پر بات کی جاسکتی ہے۔ ایسے میں ذاتی پسند و ناپسند کو ایک جانب رکھ کر اپنی بات کو آٹھ سے دس سطور میں قید کرنا واقعی مشکل کام تھا، اب سوچتی ہوں کہ کیسے کیا میں نے چھ سال تک یہ کام؟ اخبار کے ہفت روزہ میگزین یعنی اتوار کی اشاعتوں کے لیے میرے خصوصی فیچرز اور انٹرویوز شائع ہوتے تھے جو ایک مختلف کام ہے جبکہ روزانہ کی رنگین اشاعتوں کے لیے میری علیحدہ ذمے داریاں تھیں مثال کے طور پر ''لیڈنگ پیپلز'' پر صوبے کے نمایاں افراد کے انٹرویوز' جرم و سزا کے صفحات پر صوبے میں ہونے والے جرائم سے متعلق واقعات کو قلم بند کرنا یا کسی رپورٹر سے اسٹوری کرانا' خواتین کے صفحے کے لیے خواتین کی دلچسپی کا مواد جبکہ بچوں کے صفحے کے لیے بچوں کے ہمراہ مختلف جگہوں کے دورے، کہانیاں، لطائف اور اہم معلومات وغیرہ وغیرہ۔

پاکیزہ ✧......اداریہ کسی بھی اخبار یا مجلّے کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیا آپ کے اداریے اس خیال کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں؟

شازیہ ❖......یہ آپ کہہ رہی ہیں یا پھر کچھ ہی ایسے لوگ ہیں جو اداریے کی اہمیت سے آگاہ ہیں ورنہ تو لوگ اداریہ پڑھنے کی زحمت ہی نہیں کرتے۔

پاکیزہ ✧......کھلنڈرے بچوں سے لے کر سیاست کے مشاق کھلاڑیوں تک کے انٹرویوز آپ نے کیے، کبھی کسی سیاستداں میں بچوں کی سی معصومیت اور بچوں میں زیرک سیاستداں کی ہوشیاری نظر آئی؟

شازیہ ❖......میں نے جب پیر صاحب پگارا کا انٹرویو کیا تو ساتھیوں نے مجھے کافی ڈرایا ہوا تھا، یوں بھی ان کی شخصیت انتہائی بارعب تھی لیکن جب ان کا انٹرویو کیا تو احساس ہوا کہ ان کے اندر ایک بچہ ہے جو اب بھی کسی کو اپنی بات سنانے کا اشتیاق رکھتا ہے۔ اسی طرح سے ممتاز بھٹو کا انٹرویو کیا جو سنجیدہ سیاسی شخصیت

ہیں، ان سے میں نے ذاتی نوعیت کے سوالوں کے دلچسپ جواب حاصل کیے اور بہت لطف آیا اور بچوں کی کیا کہوں؟ بچوں سے بڑے سیاستدان تو میں نے دیکھے ہی نہیں ہیں آج تک۔

پاکیزہ ✧......آپ کا لیا جانے والا وہ کون سا انٹرویو تھا جو آپ کے لیے کارِ دشوار تھا لیکن آپ کی ستائش بھی بہت ہوئی؟

شازیہ ❖......مجیب عالم صاحب کا انتقال ہوا اور مجھے کہا گیا ان کے گھر جا کر سنڈے میگزین کے لیے ان کی فیملی سے بات چیت کریں۔ میں اپنی ٹیم کے ہمراہ وہاں پہنچی، ان کی تدفین کو کچھ گھنٹے ہی ہوئے تھے، سچ جانیے کہ ایسے ماحول میں ان کی بیٹی یا بیوہ سے کچھ پوچھنا اور بات چیت کرنا زندگی کا سب سے مشکل عمل تھا جو میں نے سرانجام دیا۔ وہ انٹرویو شائع ہوا اور بے حد سراہا گیا، اسے بہت سے لوگوں نے اپنے اخباروں کی زینت بھی بنایا۔

پاکیزہ ✧......ایک انٹرویو کرنے والے میں کن صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے؟

شازیہ ❖......مکمل معلومات اور اعتماد۔ آپ کے سامنے کوئی زیرک سیاستدان، سماجی شخصیت، اداکار یا کسی بھی شعبے کا ماہر بیٹھا ہو تو سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ ہمیں متعلقہ شخصیت اور اس کے شعبے کے حوالے سے تمام باریکیوں کا علم ہو... بہ صورت دیگر آپ ایک اچھے انٹرویو کو بھول جائیں۔

پاکیزہ ✧......آپ فیچر نگار بھی ہیں تو کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کے فیچرز متعلقہ موضوع کا حق ادا کرنے میں کامیاب رہے؟

شازیہ ❖......کوشش کرتی ہوں کہ فیچرز لکھتے ہوئے موضوع کا مکمل احاطہ ہو، ماضی، حال اور کچھ مستقبل کی بات ہو۔ نتائج نکالنا ہمارا کام نہیں ہے، یہ وقت طے کرتا ہے لیکن ہم واقعات و حالات کو نظر میں رکھتے ہوئے اپنی بات کر سکتے ہیں۔

پاکیزہ ✧......آپ کے خیال میں آپ کی جاندار تبصرہ نگاری کا اعزاز آپ کی کامیاب فیچر نگاری کو جاتا ہے؟

شازیہ ❖......"جاندار" آپ کا حسنِ نظر ہے، میں سمجھتی ہوں کہ میں حقیقت حال لکھتی ہوں شاید اسی لیے لوگوں کے معیار پر پورا اترتا ہے کیونکہ جب بھی آپ کچھ اپنے متعلق پڑھتے ہیں تو آپ کو اچھا لگتا ہے۔ زمینی حقائق اور عوامی مسائل میری تحریر کی اساس ہیں۔ معاشرے میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کے ایک عام انسان پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں، میں اس پر بات کرنا چاہتی ہوں، ذمے داروں کو لتاڑتی بھی ہوں لیکن اس کوشش کے ساتھ کہ کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو جائے۔

پاکیزہ ✧......آپ نے کئی تراجم بھی کیے ہیں ایک مترجم کی اولین ذمے داری کیا ہے؟

شازیہ ❖......ترجمے کرنا بہت مشکل اور دشوار گزار کام ہے۔ عام طور پر میں انگریزی سے اردو کے تراجم کرتی ہوں اور اس کے لیے لغت کا سہارا لیتی ہوں، کچھ "گوگل" سہیلی بھی مدد کرتی ہے۔ ایک بار لفظی ترجمہ کرنے کے بعد میں اسے اپنے حروف کے قالب میں ڈھالتی ہوں۔ میرا اندازِ تحریر میرا اثاثہ ہے، میں اس کے مطابق تحریر سے ہی مطمئن ہوتی ہوں۔ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ حرف بہ حرف ترجمہ کیا جانا چاہیے لیکن حرف بہ حرف ترجمہ کیا ہی نہیں جا سکتا، متن ترجمہ ہو کر قاری تک پہنچتا ہے اور وہ ہی پُراثر ہوتا ہے۔

پاکیزہ ✧......اردو زبان کے فروغ میں ایک اردو ترجمہ نگار کا کردار کیا ہو سکتا ہے؟

شازیہ ❖......بدقسمتی سے ہمارے ہاں اردو زبان پر بہت زیادہ کام نہیں ہو رہا ہے۔ ہم سے پہلے کی نسل کے لوگ آج بھی زبان کی ترویج کے لیے کوشاں ہیں لیکن کم از کم مجھے تو اپنی نسل میں سے کوئی قابلِ ذکر نام اور کام نظر نہیں آتا۔ معاف کیجیے گا شاعری کے ایک سال میں چھ دیوان چھاپنے کو میں اردو ادب کی خدمت قرار نہیں دیتی۔ ایسے میں اگر ہم انگریزی کی ان تحریروں کو جو ہماری نئی نسل پڑھنے میں دلچسپی رکھتی ہے، اردو میں ترجمہ کر کے فراہم کر دیں تو شاید یہ زبان

شادی کے موقع پر بہنوں اور والد کے ہمراہ

ان کی توجہ کا مرکز بن جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم نے دانستہ طور پر اپنی نئی نسل کو اپنی زبان سے دور کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے انہیں مغربی زبان اور مغربی تہذیب کی جانب خود دھکا دیا ہے تو پھر ان سے شکوہ کیسا؟

پاکیزہ ✧......صحافت خارزار وادی کا نام ہے آپ نے تین دہائیوں کی مسافت میں کانٹوں کا یہ سفر کیسے طے کیا؟

شازیہ ❖......تین دہائیوں کا سفر ہے، تین سطروں میں نہیں سمٹ سکتا بس اتنا کہوں گی کہ کسی بھی شعبے بالخصوص کہ جس میں عملی میدان میں کام کرنا ہو، خواتین کے لیے نہایت مشکل ہوتا ہے۔ ایسی خواتین پر انگلیاں اٹھانا معاشرہ اپنا فرض سمجھتا ہے، میرے ساتھ کی تمام خواتین اس عمل سے گزری ہیں، میں جانتی ہوں کہ جیسی تکلیف میں نے سہی ہے ویسی تکلیف کہیں نہ کہیں دیگر صحافیوں نے بھی برداشت کی ہوگی، آج تو بہت سی خواتین، بچیاں اس میدان میں فعال ہیں اور اللہ کرے کہ انہیں ایسی مشکلات پیش نہ آتی ہوں لیکن آج بھی جب میں کچھ اصحاب کو ان کے حوالے سے بے لاگ و بے باک تبصرے کرتے ہوئے دیکھتی ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم معاشرتی طور پر ایک ابنارمل معاشرے میں سانس لے رہے ہیں جہاں اپنی بہن، بیٹی، ماں اور بیوی کے علاوہ دیگر خواتین صرف ''عورت'' ہیں۔ باقی کام کے حوالے سے کوئی مشکل میں نے نہیں سہی، مجھے لگتا ہے کہ خواتین میں کام کرنے کا حوصلہ مردوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ صحافت میرا پیشہ نہیں شوق ہے اور اپنے اس شوق کی تکمیل کے لیے میں نے بہت پاپڑ بیلے ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ میں جہاں تک جانا چاہتی تھی وہاں تک نہیں جاسکی۔

پاکیزہ ✧......معاشرے کے امن و امان میں ایک صحافی کا کیا کردار ہے روزنامہ اخبار میں کام کرنے کے دوران آپ نے اپنا یہ کردار کیسے نبھایا؟

شازیہ ❖......ریاست کا پانچواں ستون صحافت ہے اس شعبے کی معاشرے میں اہمیت کے پیش نظر ہی اسے پانچواں ستون قرار دیا گیا ہے۔ ایک صحافی کی ذمّے داری ہے کہ وہ معاشرے کی درست عکاسی کرے لیکن قیام امن اس کی ذمّہ داری نہیں ہے البتہ ایک صحافی کی کوشش ہونی چاہیے کہ اس کی کسی بھی تحریر کی وجہ سے معاشرے میں شرانگیزی نہ پھیلے۔

پاکیزہ ✧......ایک صحافی کا زیرک ہونا زیادہ اہم ہے یا حساس دل، بیدار ذہن اور روشن ضمیر ہونا؟

شازیہ ❖......صحافی کو زیرک بھی ہونا چاہیے،

حساس دل بھی، بیدار ذہن بھی اور روشن ضمیر بھی۔ یہ سارے عناصر مل کر ایک اچھے صحافی کو جنم دیتے ہیں۔ پتا نہیں مجھے یہ بات کرنی بھی چاہیے کہ نہیں لیکن یہ سچ ہے کہ آج سے پچیس یا تیس سال قبل بڑی تعداد میں لوگوں نے مختلف شعبوں میں ناکام ہونے کے بعد صحافت کا رخ کیا' بہت سے لوگ محض پریس کارڈ کے حصول کے لیے اخبارات کی جانب آ گئے' مالکان نے بھی کم ترین مشاہرے پر انہیں ملازمت پر رکھ لیا اور جیسے گاتے، گاتے گویا بن جاتا ہے ویسے بہت سے اصحاب لکھتے، لکھتے صحافی بن گئے تاہم ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو خدمت کا جذبہ لے کر اس جانب آئے' ان لوگوں نے اپنے شعبے میں بہت نام کمایا اور جید صحافی کہلائے۔ آج تو الیکٹرانک میڈیا کا دور ہے' ریٹنگ کی دوڑ ہے ایسے میں باقی تمام خوبیاں پیچھے رہ گئی ہیں۔

پاکیزہ ✧...... کیا نو آموز صحافیوں کی تربیت کے لیے کسی صحافتی ادارے کا قیام ضروری ہے؟

شازیہ ❖...... کیا آپ نے کبھی کسی صحافی کو خود کو بھی ''نو آموز'' تسلیم کرتے ہوئے سنا ہے؟ بہر کیف درس گاہوں میں آج صحافت بطور مضمون پڑھائی جاتی ہے' مختلف پلیٹ فارموں سے تربیتی نشستیں بھی کی جاتی ہیں دراصل صحافت محنت اور مشق کا سودا ہے۔

پاکیزہ ✧...... عالمی حالات کے تناظر میں آج کے صحافی کی اہم ذمے داری کیا ہے؟

شازیہ ❖...... بین الاقوامی پس منظر میں صحافی کی سب سے اہم ذمے داری اپنے ملک کے مثبت تاثر کو دنیا تک پہنچانا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستانی بین الاقوامی سطح پر زیادہ قابلِ احترام نہیں ہیں، کیا ہی اچھا ہو کہ ہمارے صحافی جو اس سطح پر کام کر رہے ہیں ملک و قوم کی خامیوں کے بجائے خوبیوں کا زیادہ تذکرہ کریں۔

پاکیزہ ✧...... اپنے کالم میں عموماً کن مسائل کی نشاندہی کرتی ہیں؟

شازیہ ❖...... میں سماجی رابطوں کی مختلف ویب سائٹس اور اخبارات میں کالمز بھی لکھتی ہوں اور سماجی مسائل کو قلم زد کرتی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... آپ مختلف ویب سائٹس پر تحقیقی مضامین، تجزیے اور تبصرے بھی تحریر کرتی ہیں پرنٹ میڈیا اور سوشل میڈیا کے کام میں بنیادی فرق کیا ہے؟

شازیہ ❖...... بہت فرق ہے۔ سب سے بڑا فرق یہ ہے آپ کو فوری طور پر ردِعمل مل جاتا ہے۔ پرنٹ میڈیا میں ایک وقت تھا جب آپ کی تحریر کی اچھائی اور برائی لوگوں کے خطوط سے پتا چل جاتی تھی۔ آج لوگوں میں خطوط لکھنے کا رجحان ہی نہیں ہے۔ سوشل میڈیا پر پانچ منٹ کے بعد ہی پتا چل جاتا ہے کہ آپ کتنے پانی میں ہیں۔

پاکیزہ ✧...... آپ ذاتی طور پر خود کس میڈیا میں لکھ کر تسکین محسوس کرتی ہیں یا یوں کہہ لیں کہ ایک قلمکار کی روح کس میڈیا میں زیادہ سیراب ہوتی ہے؟

شازیہ ❖...... پرنٹ میڈیا اخبار کے لیے کام کرنا مجھے بہت پسند ہے۔ بدقسمتی سے اس دور میں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پرنٹ میڈیا کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا گیا ہے۔

پاکیزہ ✧...... آپ کے مضامین بہت کاٹ دار ہوتے ہیں کبھی یہ ''قلمی چرکا'' آپ کے لیے مسئلہ بنا؟

شازیہ ❖...... جی بہت بار...... لیکن میں تنقید کو تعمیری انداز میں لینے کی عادی ہوں خواہ وہ کوئی بھی کر رہا ہو۔ اگر سامنے والا اپنا کوئی موقف پیش کر کے قائل کر لیتا ہے تو اگلے قلمی معرکے میں وہ بھی سامنے آ جاتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... آپ کے خیال میں تفتیشی مضمون نگاری کی تعریف کیا ہے؟

شازیہ ❖...... ہمارے ہاں تفتیشی مضمون نگاری بہت کم ہوئی اور بہت کم لوگ اس جانب آتے ہیں کیونکہ یہ سخت محنت طلب' جان جوکھم کا کام ہے' تاہم جو بھی آیا اس نے نام و عزت کمائی۔ یہ کام حساس بھی ہے اور محنت طلب بھی۔ ہمارے صحافی اس کے عادی

شازیہ اپنے شریک حیات اور بچے کے ہمراہ

نہیں ہیں، سیٹوں پر بیٹھ کر وزن بڑھا لیتے ہیں لیکن عملی میدان میں اتر کر کام نہیں کرتے جبکہ انویسٹی گیٹو رپورٹنگ ایک انتہائی دلچسپ کام ہے۔

پاکیزہ ✧...... خواتین اور خواتین سے وابستہ حساس مسائل پر آپ نے بڑی چابکدستی سے متعدد مضامین لکھے ہیں کیا کبھی ایسے کسی مضمون کی اشاعت آپ کے لیے مسئلہ بنی؟

شازیہ ❖...... نہیں مسئلہ تو نہیں بنی لیکن بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ مجھے ''خواتین'' سے بے جا محبت ہے جبکہ درحقیقت مجھے ایک اچھے معاشرے کے قیام کی چاہ ہے جو صرف اور صرف اس وقت جنم لے سکتا ہے جب آپ عورتوں کو ان کے مقام پر فائز کر دیں۔ اچھی مائیں ہوں گی تو اچھی قوم جنم لے گی لیکن اس نظریے کو سمجھنے والوں کی انتہائی قلت ہے۔

پاکیزہ ✧...... آپ کی نظر میں آزادیِ نسواں کا تصور کیا ہے؟

شازیہ ❖...... بہت واضح، آزادیِ نسواں کا مقصد مادر پدر آزادی نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب ہے کہ خواتین کو ان کے بنیادی حقوق کے ساتھ معاشرے میں اپنا مقام حاصل کرنے دیا جائے۔ 8 مارچ کو عورتوں کے حقوق کے حوالے سے باہر نکلنے والی خواتین بھی میرے نزدیک نہایت اہم ہیں لیکن ان کی جانب سے لگائے گئے نعرے ناقابلِ تسلیم۔ میں سمجھتی ہوں کہ ان خواتین کو درست سمت میں گامزن کرنے کی ضرورت ہے۔

پاکیزہ ✧...... کیا ہمارے معاشرے میں ورکنگ وومن کو وہ مقام حاصل ہے جس کی وہ حقدار ہے؟

شازیہ ❖...... سب سے پہلے تو ورکنگ وومن کی تشریح کی جانی چاہیے۔ میرے نزدیک تو ہر عورت ورکنگ وومن ہے۔ کوئی گھر میں گھر کے کام کرتی ہے تو کوئی معاشی مسائل کے حل کے لیے ملازمت کرتی ہے۔ کوئی عورت کھیتوں میں کام کرتی ہے تو کوئی گائے بھینسوں کی دیکھ بھال میں مردوں کے شانہ بشانہ کھڑی ہے لیکن معاشرہ عورتوں کو ان کا جائز مقام دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ آج بھی ایک عورت اگر کسی بڑے عہدے پر فائز ہے تو اسے اس کی صلاحیت کا نہیں بلکہ عورت ہونے کا کارنامہ قرار دیا جاتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... خواتین کی فلاح و ترقی میں ٹی وی ڈراما کس حد تک مؤثر ثابت ہو سکتا ہے؟

شازیہ ❖...... صرف خواتین کی ہی نہیں بلکہ پورے معاشرے کی فلاح و ترقی میں ٹی وی ڈراما بے حد مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ اس وقت اپنے پیغام کی ترسیل کا سب سے مؤثر ذریعہ ڈرامے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے جب پاکستانی ڈراموں کا دور دورہ ہے' ہر گھر میں ڈراما دیکھا جاتا ہے یعنی آپ جو کچھ چاہیں اپنے ڈراموں کے ذریعے گھروں تک پہنچا دیں۔

پاکیزہ ✧...... آپ نے ٹی وی کے لیے دو سیریلز کے اسکرپٹ لکھے۔ موضوعات کیا تھے؟

شازیہ ❖...... حسبِ روایت سماجی موضوع ہی تھا' اردگرد کی کہانی۔

پاکیزہ ✧...... یہ سلسلہ جاری کیوں نہیں رکھا؟

شازیہ ❖...... وقت کی کمی۔ اصل میں کوئی ڈراما بالخصوص سیریل لکھنے کے لیے بہت وقت درکار ہوتا ہے‘ خود کو ایک ماحول میں ڈھالنا پڑتا ہے‘ آپ جس سین میں اس ماحول سے باہر آتے ہیں وہ سین الگ ہی نظر آتا ہے۔ مجھ پر کافی ذمّے داریاں ہیں جنہیں پورا کرنے کے لیے کافی وقت درکار ہوتا ہے اور میں چاہتی ہوں میں جو کچھ بھی لکھوں وہ منفرد ہو اور غلطیوں سے پاک ہو۔ ایک اسکرپٹ پر کام کررہی ہوں دیکھیے صرف کام کرتی ہوں یا آگے بھی بڑھاتی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... ہم ٹی وی نیٹ ورک سے کب سے وابستہ ہیں؟ آپ ادارے میں سینئر منیجر کی پوسٹ بھی رکھتی ہیں‘ بحیثیت سینئر منیجر آپ کے فرائض کیا ہیں؟

شازیہ ❖...... فروری 2009ء میں ہم نیٹ ورک سے وابستگی اختیار کی اور آج بھی اپنی ذمّے داریاں ادا کررہی ہوں۔ مصالحہ ٹی وی فوڈ میگزین کی ذمّے داریوں کے ساتھ نیٹ ورک کے حوالے سے ترویجی کاموں میں حصہ لیتی ہوں‘ مختلف پروگرامز کے حوالے سے جو ذمّے داری دی جاتی ہے اسے احسن طریقے سے ادا کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ ڈپارٹمنٹ کے آپریشن کے کام میری ذمّے داری ہیں۔

پاکیزہ ✧...... آپ کو ہم ٹی وی نیٹ ورک کی کون سی بات بہت بھلی لگتی ہے؟

شازیہ ❖...... خواتین کو جو مقام اور احترام ہم نیٹ ورک میں حاصل ہے وہ کسی دوسرے ادارے میں نہیں ہے۔ میں نے یہاں رات گئے تک بھی بیٹھ کر کام کیا ہے لیکن کسی بھی قسم کا عدم تحفظ کبھی بھی محسوس نہیں کیا اور اس کا مکمل کریڈٹ سلطانہ آپا کو جاتا ہے جو اس ضمن میں کسی کو ڈھیل دینے کو تیار نہیں۔

پاکیزہ ✧...... آپ کی زندگی کی سب سے اہم خاتون کون سی ہیں جنہوں نے آپ کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کیا؟

شازیہ ❖...... امی کے بعد شہناز رمزی اور سلطانہ صدیقی۔ شہناز رمزی میری لائن منیجر تھیں‘ کافی سخت باس تھیں لیکن انہوں نے ہمیشہ مجھ سے دوستانہ رویّہ رکھا‘ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہ عدم تحفظ کا شکار نہیں ہوتی تھیں۔ چھٹیوں پر جاتیں تو مجھے ذمّے دار بنا کر جاتیں اور 2015ء تک‘ جب تک وہ ساتھ رہیں مجھے کبھی مسائل کا سامنا نہیں ہوا۔ ان کے بعد ہمارے ڈپارٹمنٹ کی رپورٹنگ لائن اطہر وقار عظیم صاحب کے پاس آگئی۔ میں بلاجھجک یہ کہہ سکتی ہوں کہ آپ ایک بہترین باس ہیں‘ اپنے جونیئرز پر بھروسا کرتے ہیں اور انہیں کام کرنے کی آزادی دیتے ہیں۔ تیسری اہم ترین خاتون ہیں سلطانہ صدیقی جو ہم نیٹ ورک کی صدر بھی ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ ہمارے ادارے کی صدر ہیں‘ میں نے انہیں ایک انتہائی محنتی‘ صاف گو اور محبت کرنے والی شخصیت پایا ہے۔ وہ خود بھی ایک مضبوط خاتون ہیں جنہوں نے اپنی محنت سے ایک ادارے کی بنیاد رکھی اور اسے کامیاب نہیں بلکہ کامیاب ترین ادارہ ثابت کردیا۔ انہیں دیکھ کر آگے بڑھنے کی رہنمائی اور حوصلہ ملتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... آپ کی ابتدائی ذہنی واخلاقی تربیت میں کس کا کردار زیادہ اہم ہے؟

شازیہ ❖...... یقیناً میرے والدین کا۔ مجھے اپنی ایک ٹیچر بھی یاد ہیں مسز طاہرہ اقبال جو ہمیں اپنے بچوں کی طرح سے ہر بات سمجھاتیں‘ اچھے اور برے کی تمیز بھی بتاتیں۔

پاکیزہ ✧...... والدین کی تربیت کا وہ اہم جز جو آپ کی شخصیت اور کردار میں رچ بس گیا؟

شازیہ ❖...... میرے والدین کی بے غرضی اور درگزر۔ میں نے ہمیشہ اپنے والدین کو بے غرض ہوکر لوگوں کے لیے کام کرتے دیکھا۔ میری والدہ اپنی والدہ یعنی میری نانی کی انتہائی خدمت کرتی تھیں‘ کبھی کبھار میں ان سے کہا کرتی تھی کہ وہ بدلے میں آپ کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہیں تو ان کا ہمیشہ یہی جواب

ہوتا تھا کہ میں جو کر رہی ہوں وہ اللہ کی رضا کے لیے کر رہی ہوں کسی بدلے کی چاہ میں نہیں۔ والد کی بات کریں تو انہوں نے بھی اپنے رشتے داروں کے لیے وہ سب بھی کیا جو اُن کی ذمے داری بھی نہیں تھی۔ انہوں نے تو کبھی اپنی اولاد سے بھی کچھ نہیں چاہا بلکہ اپنا سب کچھ انہیں دیا تو سب سے بڑی اولاد ہونے کے ناتے یہی وہ جز ہے جو میرے کردار کا بھی حصہ ہے البتہ میں تھوڑی ''خرد ماغ'' ہوں۔ غلط بات برداشت نہیں ہوتی اور اس کا ٹکرا توڑ جواب بھی دیتی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... بڑی بیٹی ہونے کے ناتے آپ نے اپنی امی کے ساتھ زیادہ وقت گزارہ۔ امی کی شخصیت کے بارے میں بتایئے کہ بحیثیت خاتون، شریکِ حیات اور ماں وہ کیسی تھیں؟

شازیہ ❖...... میری ماں' کیسے چند سطروں میں ان کے حوالے سے سب کچھ لکھ دیا جائے۔ بہترین ماں' بہترین شریک حیات اور بہترین خاتون۔ پورے محلے میں اگر کسی کو کوئی کام پڑ جاتا' امی حاضر۔ گلی کی صفائی سے لے کر کونسلر کی شامت لانے تک پیش، پیش۔ 1990ء میں جب خواتین تصور نہیں کر سکتی تھیں' وہ پورے شہر میں گاڑی دوڑاتی پھرتی تھیں۔ میرے والد جتنے تنہائی پسند ہیں والدہ اتنی ہی مجلسی خاتون۔ میں نے انہیں ہمیشہ ابو کی ضروریات کا خیال رکھتے' ان کے ہر کام میں شانہ بشانہ رہتے اور انتہائی خندہ پیشانی سے ان کی ذمے داریوں میں ہاتھ بٹاتے ہی پایا۔ ہنر مند ایسی کہ چند گھنٹوں میں جوڑا سی کر ہاتھ میں رکھ دیتیں۔ کڑھائی اور بنائی کی ماہر' محلے کے ہر گھر میں ان کے ہاتھ کے بُنے ہوئے سوئٹرز پہنچتے تھے جبکہ بچیاں ان سے سلائی' کڑھائی اور بنائی سیکھتیں۔ کفایت شعار اتنی کہ ایک کمائی سے اپنی زندگی میں ہی ساری بچیوں کے جہیز کی ضروری اشیا جمع کر چکی تھیں۔ ماں کم دوست زیادہ تھیں' میں تیز مزاج کی تھی تو مجھ سے ٹھنی رہتی تھی لیکن ان کے بغیر قرار بھی نہیں تھا۔ منہ سے بات بعد میں نکلتی' پوری پہلے ہوجاتی۔ ہر ضرورت کیسے پوری کر دیتی تھیں کون سا جادو کا چراغ تھا ان کے پاس یہ راز آج تک نہیں کھل سکا۔ 1995ء میں وہ ہم سے بچھڑ گئیں لیکن آج تک ہماری زندگیوں میں موجود ہیں۔

پاکیزہ ✧...... ماؤں سے زیادہ قربت رکھنے والی بیٹیاں لاشعوری طور پر ان کے طور طریقے اختیار کر لیتی ہیں، آپ نے اپنی شخصیت کی تعمیر میں امی کی وراثت سے کیا پایا؟

شازیہ ❖...... کچھ بھی نہیں۔ یہ بدقسمتی ہے کہ ان کے لاکھ زور دینے کے باوجود ہم ان سے کچھ نہ سیکھ سکے' انہیں وقت نے بہت جلدی ہم سے جدا کر دیا اور ہم امی سے یہ کہتے رہ گئے کہ ''امی یار' ابھی سے یہ سب کام کیسے کریں؟'' وقت سے قیمتی کوئی شے نہیں' اسے کبھی ضائع نہ کریں، زندگی نے آپ کے لیے کیا آزمائشیں تیار رکھی ہیں یہ نہیں پتا۔ والدین کے ساتھ بھرپور وقت گزاریں اور ہر لمحہ یادگار بنائیں۔

پاکیزہ ✧...... گھر میں کوئی دوسری خاتون نہ ہوں اور بیٹیاں بھی کم عمر اور گھر سنبھالنے کے قابل نہ ہوں تب شریک حیات کی وفات کے بعد عموماً مرد دوسری شادی کر لیتے ہیں۔ مگر آپ کے والد نے ایسا نہیں کیا۔ سبب؟

شازیہ ❖...... جی' وہ وقت بھی تھا اور معاشرے کا دباؤ بھی' ہم چھ بہنیں ہیں۔ اس وقت اگر والد صاحب چاہتے تو بہت آسانی سے دوسری شادی کر سکتے تھے لیکن انہوں نے صرف اور صرف گھر کے ماحول اور بچیوں کے حقوق کے تحفظ کو فوقیت دی۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں شادی کر لوں اور کوئی ایسی ماں آ جائے کہ تم لوگوں کے لیے مسئلہ بن جائے تو یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔ یہ ہمارے والد کی ایک ایسی قربانی ہے جس نے ان کا قد ان کی اولاد کی نگاہوں میں اتنا بلند کر دیا کہ ہم آج بھی ان کے سامنے نگاہیں اٹھاتے ہوئے سو مرتبہ سوچتے ہیں بلند آواز کا تو چھوڑ ہی دیجیے۔

پاکیزہ ✧...... امی کے بعد آپ نے گھر بھی سنبھالا اور تعلیم بھی جاری رکھی۔ اپنی عمر سے بڑی ذمے

داریاں اٹھاتے ہوئے کن مسائل کا سامنا کرنا پڑا؟ آپ نے ان کا مقابلہ کیسے کیا؟

شازیہ ❖......امی ہمارے گھر کا سب سے مضبوط ستون تھیں، والد بہت حساس ہیں امی کے جانے کے بعد ہم سب ایک دوسرے کا سہارا بن گئے۔ کوئی ایسی بات نہیں کی جاتی کہ کسی کی دل شکنی ہوتی۔ گھر کے کام اس لیے مشکل لگتے کہ امی کی زندگی میں ہلکی پھلکی صفائیوں کے علاوہ کچھ کیا ہی نہیں تھا۔ کھانا پکانے کے ہنر سے ناواقف بالخصوص والد صاحب کا کھانا پکانا مشکل تھا کیوں کہ وہ پرہیزی کھانا کھاتے تھے اور اس میں تھوڑی سی بھی کمی بیشی ان کی طبیعت کی خرابی کا باعث بن جاتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب پہلی بار ابو کے لیے کھانا پکایا تو دل بہت ڈرا ہوا تھا کہ پتا نہیں کیا ہو، ابو غصہ کریں گے لیکن اس وقت میں بہت روئی جب ابو نے وہی کچا پکا خاموشی سے کھالیا۔ ہم بہنوں اور ابو میں جو محبت ہے وہ میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتی، یہ محبت اس دکھ کی پیدا کردہ ہے جو میری والدہ کے بے وقت جانے کی وجہ سے ہماری زندگیوں میں در آیا۔ وقت کا کام گزرنا ہے گزر جاتا ہے لیکن اپنے پیچھے داستان چھوڑ جاتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... طے کرلیا تھا کہ شادی پسند ہی کی کروں گی یا بالکل اچانک وارداتِ قلبی سے دوچار ہوگئیں؟

شازیہ ❖......امی کے بعد شادی کا سوچا ہی نہیں۔ سامنے تھا کہ جب تک سب سے چھوٹی بہن کی شادی ہوگی اس وقت تک میری شادی کی عمر نکل چکی ہوگی۔ بس اسے تقدیر کہتے ہیں کہ چھوٹی بہن کی شادی کے بعد والد کی طرف سے شادی کے لیے دباؤ تھا اور میرے پاس شادی کا پیغام بھی۔ والد سے تذکرہ کیا اور وہ ہمیشہ کی طرح میری خوشی میں خوش۔

پاکیزہ ✧...... محبت کی شادی کی ناکامی وکامیابی کے بنیادی عوامل آپ کی نظر میں؟

شازیہ ❖......دیکھیے شادی محبت کی ہو والدین کی پسند کی، شادی کی کامیابی وناکامی برداشت کا کھیل ہے۔ محبت کی شادی میں زیادہ مسائل ہوتے ہیں اور یہ زیادہ ناکامی کا شکار ہوتی ہے اس کی بنیادی وجہ ''توقعات'' ہوتی ہیں۔ انسان ایک دوسرے سے زیادہ توقعات لگا بیٹھتا ہے اور ان پر کسی قسم کا سمجھوتا نہیں کرتا۔ جو سمجھوتا کرلیتے ہیں وہ کامیاب ہوجاتے ہیں اور جو نہیں کرپاتے وہ اپنی دنیا میں واپس لوٹ جاتے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... بانو قدسیہ لکھتی ہیں ''عورت کی محبت ہمیشہ اظہار کی محتاج رہتی ہے ورنہ اپنی موت آپ مرجاتی ہے'' آپ اس خیال سے متفق ہیں؟

شازیہ ❖......سو فیصد متفق ہوں۔ عورت حرفوں سے بنی ہوئی ہوتی ہے۔ اسے حرف بناتے ہیں اور حرف ہی توڑ دیتے ہیں۔ مرد بعض اوقات چند لفظ بول کر بھول جاتے ہیں لیکن عورت ان لفظوں کو دل سے لگالیتی ہے۔ اب خواہ وہ مرد سے اظہار کرے یا نہ کرے لفظوں کے تیر اس کے دل کو چیر جاتے ہیں۔ ہمارے دین نے بیوی سے نرم روی کا حکم دیا ہے، اس کی جانب مسکرا کر دیکھنے کو مستحسن عمل قرار دیا ہے۔ اس سے پیار جتانے کی بات کی ہے لیکن مرد حضرات اسے ضروری نہیں سمجھتے۔ معاشرے کا بھی اس میں کردار ہے، جو مرد بیویوں سے احسن سلوک کرتے ہیں انہیں ''زن مرید'' کا خطاب دے دیا جاتا ہے اور مجھے تو لگتا ہے کہ بہت سے مرد اس خطاب سے بچنے کے لیے ہی فاصلہ رکھتے ہیں، اب فاصلوں سے محبت مرے گی ہی زندہ تو رہنے سے رہی۔

پاکیزہ ✧...... کسی کا قول ہے۔ ''ایک کامیاب عورت وہ ہے جو اُن ہی پتھروں سے گھر تعمیر کرے جو لوگ اس پر پھینکتے ہیں؟'' آپ کیا کہیں گی؟

شازیہ ❖......یعنی ایک مضبوط عورت، دوسرے کی پروانہ کرنے والی۔ ہے تو یہ صحیح لیکن عورت بہت حساس ہوتی ہے۔ وہ ان پتھروں سے گھر تو تعمیر کرلیتی ہے لیکن اس گھر کی دیواروں میں اس کے دل کا

خون شامل ہوتا ہے۔

پاکیزہ ✧......آپ نے اپنی ماں کی تربیت سے ایسی کیا چیز حاصل کی جو آپ اپنی اولاد میں منتقل کرنا چاہیں گی؟

شازیہ ❖......صبر اور بے غرضی۔ میں سکھاتی ہوں اپنے بیٹے کو کہ چھوٹا ہو یا بڑا، اچھا ہو یا برا تم اس سے احسن سلوک کرو، سلام میں پہل کرو اور یہ مت سوچو کہ کون تمہیں کیا دے سکتا ہے بلکہ تم اگر کسی کو کچھ دے سکتے تو دے دو۔ جو ہے جیسا ہے اسے صبر و شکر کے ساتھ قبول کرو۔

پاکیزہ ✧......شریک حیات کا زندگی میں کیسا کردار رہا؟

شازیہ ❖......دیکھیے شادی شدہ زندگی گزارنا خواہ وہ اپنی پسند کی شادی ہو یا والدین کی، اس وقت بہت مشکل ہوتا ہے جب آپ کل وقتی ملازمت بھی کر رہے ہوں۔ مشکلات میرے ساتھ بھی رہیں، تاہم میرے شوہر نے بہت سی جگہوں پر میرا ساتھ دیا اور خصوصاً بچے کے معاملے میں ہم قدم رہے۔

پاکیزہ ✧......آپ نے ممتا اور ملازمت کے سفر میں درپیش چیلنجز کا سامنا کیسے کیا؟

شازیہ ❖......بے حد مشکل سے۔ میں اپنے بیٹے سے کہتی ہوں کہ لوگ اپنے بچوں کو محنت سے پالتے ہیں میں نے تمہیں نہایت جدوجہد سے پالا ہے۔ ایک ماہ کے جس بچے کو لے کر میں ہم نیٹ ورک کی سیڑھیاں چڑھا کرتی تھی وہ آج اللہ کے فضل و کرم سے عمر کی نویں منزل پر کھڑا ہے۔ بعض اوقات کام کے دباؤ کی وجہ سے میں اسے سینے سے لگائے گھنٹوں ایک ہی پہلو پر بیٹھی رہتی تھی' مجھے یاد ہے کہ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی تھیں لیکن پھر بچے کی کلکاری اس کی آنکھوں کی چمک اس کا لمس مجھے حوصلہ عطا کر دیتا تھا۔ مجھے اس بات کی بے حد طمانیت ہے کہ میں نے اپنے بچے کو ماسیوں یا ڈے کیئر کے حوالے 'نہیں کیا' میں نے اس کی زندگی کا چھوٹے سے چھوٹا لمحہ اور مرحلہ محسوس کیا ہے۔ آج بھی وہ ہر قدم پر میرے ہمراہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے میں سب سے پہلے سلطانہ آپا کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھ پر بھروسا کیا کہ میں بچے اور کام کو ساتھ لے کر چل سکتی ہوں پھر میں شہناز آپا، عارف حسین اور اپنے ساتھ بیٹھنے والوں خصوصاً اس وقت (جب میرا بیٹا چھوٹا تھا) کے اور آج کے کولیگز کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنہوں نے میرے مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا۔

پاکیزہ ✧......آپ کا پسندیدہ رشتہ، شخصیت، کتاب، گیت، مغنی، مغنیہ، رنگ، موسم، وقت، فلم، ٹی وی پروگرام، تفریحی مقام، کھیل، مشغلہ، موسم کے لحاظ سے مشروب اور ڈش؟

شازیہ ❖......باپ، بیٹی اور ماں، بیٹے کا، رسول اللہ ﷺ، بے شمار کتابیں' گلابی آنکھیں جو تیری دیکھیں' رفیع' عابدہ پروین' سفید' سردی کا موسم' فجر کا وقت' مائی بیسٹ فرینڈز ویڈنگ' تمام ٹاک شوز' تفریح پسند نہیں' مشغلہ کتب بینی' مشروب چائے' چائے اور چائے ہر موسم میں اور کم نمک مزیدار کھانا خواہ وہ کچھ بھی ہو۔

پاکیزہ ✧......پاکیزہ بہنوں کے لیے آپ کا پیغام؟

شازیہ ❖......میں پاکیزہ بہنوں سے کہنا چاہتی ہوں کہ زندگی ایک بار ملتی ہے اس میں اتار چڑھاؤ آتے ہیں لیکن ان سے ''گھبرانا'' نہیں ہے بلکہ ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہے۔ اس کے ساتھ اپنے لیے ضرور وقت نکالیں۔ کل دل میں یہ بات نہ رہ جائے کہ میں نے زندگی میں ''کچھ'' نہیں کیا۔ یاد رکھیں کہ ایک خوشحال گھرانے کے لیے عورت کا خوش، صحت مند اور مطمئن ہونا بے حد ضروری ہے۔

☆☆☆

عزیز قارئین پاکیزہ کی مہمان، شازیہ انوار سے ملاقات آپ کو کیسی لگی؟ ہم آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے کہ آپ کی رائے کسی ٹانک سے کم نہیں ہوتی جو ہمارے قلم کو توانا بناتی ہے۔

☆☆☆

مزاح نگاری، کمال کی صنفِ ادب ہے کہ جس میں وہ بات بھی بہ آسانی کہہ دی جاتی ہے کہ جسے سوچنے میں زمانے لگیں...... مگر ایسی نشتر زنی بخاطر اصلاح کا فن بھی کسی کسی کو آتا ہے۔ ورنہ مزاح نگاری کو عامیانہ طرزِ تحریر بننے میں دیر نہیں لگتی۔

مشتاق احمد یوسفی مزاح نگاری کا بہت بڑا نام......آج اس عظیم ادیب کی کتاب آب گم کے باب کار، کابلی والا اور اللّٰہ دین بے چراغ سے اقتباس......

یار زندہ فضیحت باقی

بشارت اور خان صاحب کے مابین حجت و تکرار صرف دفتری اوقات میں یعنی نو سے پانچ بجے تک ہوتی جو ہار جیت کا فیصلہ ہوئے بغیر کل تک کے لیے ملتوی ہو جاتی۔ تاکہ تازہ دم ہو کر جھگڑ سکیں۔

صلح ہے اک مہلت سامان جنگ
کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ

سنا ہے کہ اگلے وقتوں میں پڑوسنیں اسی طرح لڑتی تھیں۔ لڑتے، لڑتے گلا بیٹھ جاتا اور شام پڑتے ہی وہ مرد گھر لوٹنے لگتے جو دن بھر معرض، دشنام میں آیا کیے تو دونوں مکانوں کی سرحد یعنی مشترکہ دیوار پر ایک ہانڈی الٹی کر کے رکھ دی جاتی تھی، جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اندھیرے کے سبب عارضی دشنام بندی ہو گئی ہے۔ کل پھر ہوگی، بات یہ ہے کہ جب تک فریق کا چہرہ نظر نہ آئے، گالی میں third dimension (تیسری جہت) پیدا نہیں ہوتی۔ جس دکان میں ہمہ وقت جھگڑے اور دنگل کا سماں ہو اور باہر ایک فریق کے دس پندرہ مسٹنڈے حمایتی سماوار کے گرد پڑاؤ ڈالے ہوں، اس کے گاہک بدکیں نہیں تو اور کیا کریں۔ بقول ہمارے استاد اول، مولوی، محمد اسمٰعیل میرٹھی کے جن کی ''ریڈر'' سے ہم نے دفاع اور آداب فرار کا پہلا سبق سیکھا۔

جب کہ دو موذیوں میں ہو کھٹ پٹ
اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

کوئی گاہک مارے باندھے ٹھہر بھی جاتا تو خان صاحب اس کے سامنے اپنی ڈوبی ہوئی رقم کو اس طرح یاد کرتے کہ وہ حسبِ توفیق خوف زدہ یا آبدیدہ ہو کر بھاگ جاتا۔

بحثا بحثی کا اثر خان صاحب کی تندرستی پر نہایت خوشگوار ثابت ہوا۔ ان کی زبان اور اشتہا روز بروز کھلتی جا رہی تھی۔ وہ کسی طور لکڑی کی قیمت کم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، اس لیے کہ انہیں گھر میں اتنے ہی کی پڑی تھی۔ اِدھر بشارت بار، بار کہتے کہ ''اول، لکڑی داغی اور کٹھل تھی۔ اس پر تیز سے تیز آری کھٹل ہو گئی۔ دوم، سیزن بھی نہیں

ہوئی تھی۔ کئی تختوں میں بل آ گیا تھا۔ کوئی بے داغ نہیں نکلا...... سوم چمچت بہت ہوئی، چہارم، جگہ جگہ کیڑا لگا ہوا تھا۔''

خان صاحب نے لقمہ دیا۔'' پنجم، یہ لکڑی چوری ہوگئی۔ یہ بھی میرا ہی قصور ہے۔ ششم یہ کہ ہم نے آپ کو لکڑی دی تھی۔ لڑکی تو نہیں دی کہ آپ اس کے جہیز میں ہزار کیڑے نکالنے بیٹھ جائیں۔ آپ تو پان کھا، کھا کر بالکل زنانیوں کی طرح لڑنے لگتے ہیں۔''

بشارت نے ''زنانیوں'' سنا اور سمجھا...... تڑ سے جواب دیا۔'' آپ بھی تو کابلی والا سے کم نہیں۔''

''یہ کیا ہوتا ہے صیب......؟''

بشارت نے کابلی والا کا مطلب بتایا تو وہ غضب ناک ہو گئے۔ کہنے لگے۔'' ہمارے قبیلے میں آج تک کسی نے سود لیا نہ سود دیا۔ خنزیر برابر سمجھتے ہیں۔ جبکہ آپ اعلانیہ سود دیتے بھی ہیں اور کھاتے بھی ہیں۔ آپ کے گھر کا تو شوربا بھی حرام ہے۔ اس میں آدھا پانی، آدھی مرچیں اور آدھا سود ہوتا ہے۔ گر آئندہ یہ لفظ منہ سے نکالا تو ٹھیک نہ ہوگا۔''

یہ کہہ کر انہوں نے عالمِ غیظ میں میز پر اتنے زور سے مکا مارا کہ اس پر رکھے ہوئے کپ، چمچے، پن اور تلے ہوئے مٹر ہوا میں ایک، ایک بالشت اونچے اچھلے...... اور میز پر رکھے ہوئے ٹائم پیس کا الارم بجنے لگا۔ پھر انہوں نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا، ٹرکش کوٹ کی جیب سے بھرا ہوا ریوالور نکال کر میز پر رکھ دیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد نال کا رخ پھیر کر اپنی طرف کرلیا۔

بشارت سہم گئے، ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا...کہ زہر میں بجھے ہوئے اس تیر کو جو نہ صرف کمان سے نکل چکا تھا بلکہ مہمان عزیز کے سینے میں ترازو ہو چکا تھا، اب کیسے واپس لائیں۔ خان صاحب نے اسی وقت اپنے ایک کمانڈو کو حکم دیا کہ فوراً جا کر پشاور کا ٹکٹ لاؤ۔ دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ بشارت منت سماجت کرتے رہے۔ خان صاحب بار، بار بپھر کر دفتر سے باہر جاتے مگر اس انداز سے کہ ہر قدم پر۔

مڑ کے تکتے تھے کہ اب کوئی منا کرلے جائے

بشارت نے چار بجے ان کے پیر پکڑ لیے تو وہ گھر چلنے کے لیے اس شرط پر رضامند ہوئے کہ پہلے اپنے ہاتھ سے مجھے پان کھلاؤ۔

لیکن اس کے بعد خان صاحب کے رویے میں ایک خوشگوار تبدیلی آ گئی۔

بشارت تو خیر اپنے کہے پر نادم تھے ہی بلکہ انگریزی محاورے کے مطابق اپنے ہی عرق میں غرق ہوئے جا رہے تھے لیکن خان صاحب بھی اپنے شدید ردِعمل پر کچھ کم خجل نہ تھے۔ طرح، طرح سے تلافی اور اشک شوئی کی کوشش کرتے۔ مثلاً بشارت کبھی اداس یا مضمحل نظر آتے یا گھمسان کی بحث میں اچانک ایسے بزدلانہ طریقے سے میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے کہ خان صاحب ڈان کیوٹے کی طرح اکیلے ہوا میں تلوار چلاتے رہ جاتے، تو ایسے موقع پر وہ ایک عجیب ادائے دلنوازی سے کہتے۔ ''حضور والا، کابلی والا بعد ادائے آداب کے عرض کرتا ہے کہ پان کی طلب ہو رہی ہے۔ پان کھلائیے۔'' انہوں نے اس سے پہلے پان کبھی چکھا بھی نہیں تھا۔ بشارت ندامت سے زمین میں گڑ جاتے، کبھی قدرے کھسیانے، کبھی mock.serious (استہزائیہ سنجیدگی) سے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے، کبھی گھٹنے چھوتے۔ اور کبھی یوں بھی ہوتا کہ خان صاحب ان کے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگا لیتے۔

☆☆☆
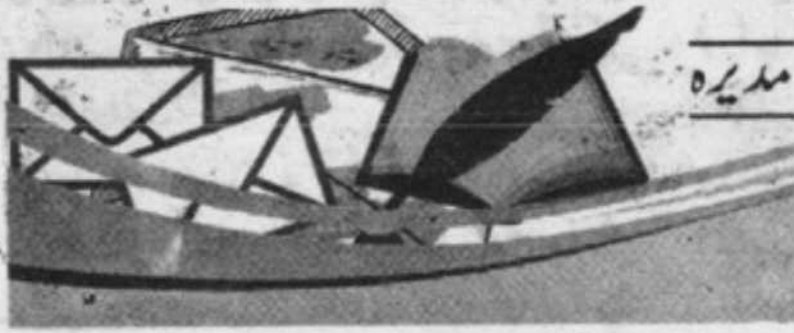
خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

03316266612,021.35386783.021.35802552.Ext:110

پیاری پاکیزہ بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ وبرکاتہ!

تمام حمد وستائش اس ذات والا صفات کو زیبا جو کل کائنات کا خلق کرنے والا ہے۔ یکتا و وحدہ لاشریک ہے اور کروڑوں درود و سلام حبیب خدا رحمتہ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس پر جو وجہ تخلیق کائنات ہیں۔ پروردگار عالم کے حضور دست بستہ دعا گو ہیں کہ اپنے خزانہ غیب سے وہ سب کچھ عطا کرے جو ہمارے حق میں بہترین ہو۔ نہ صرف ہمارے وطن پاکستان بلکہ پوری دنیا سے اس وبا کا خاتمہ کردے، انسانیت کو امان ہو اور ہم بحیثیت مسلمان اپنے رب کی بارگاہ میں حقیقی معنوں میں بخشش وعنایات پائیں۔ (الہٰی آمین)

کچھ باتیں اپنی بہنوں سے

عزیز بہنو! پر خلوص سلام اور دعائیں لیے حاضر ہوں۔ پورے ملک میں شدید سردی کی لہر ہے اور اس مرتبہ تو کراچی بھی نہ بچ سکا ہم لوگ بھی شدید سردی کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ حالانکہ بیماریاں بھی عروج پر ہیں لیکن موسم سرما انجوائے کرنے والے بھی تو بہت ہیں۔

بہنو میں کچھ سالوں سے سردیوں میں ادرک کا حلوا ضرور بناتی ہوں۔ اس دفعہ تو فرمائشی آرڈر بھی بہت ملے اور سب کو بنا کر بھی بھیجا...... آپ بہنوں کے لیے اس مرتبہ خوش ذائقہ کے صفحات میں ادرک کے حلوے کی ترکیب نزہت اصغر کو دے دی ہے۔ آپ بہنیں ضرور ٹرائی کریں۔ اس دفعہ شیریں حیدر نے بہت خوب صورت ناولٹ نئے سال کے تحفے کی صورت میں آپ کو دیا..... شیریں تو ہمیشہ ہی اچھا لکھتی ہیں۔ یقیناً آپ کو بھی اچھا لگا ہوگا، میں نے تو ان کی پہلی قسط سے بہت لطف اٹھایا۔ عورت کہانی کے سلسلے میں فرحین اظفر کی تحریر بہت عمدہ رہی۔ باقی تحریریں بھی کم وبیش اچھی رہیں۔ بہنوں جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ فروری معراج رسول صاحب کی برسی کا مہینہ ہے۔ آپ بہنوں سے درخواست ہے کہ انہیں ایک سورۂ فاتحہ کا تحفہ ضرور ارسال کریں۔ وقت تو رکا نہیں رہتا۔ کتنی جلدی دو سال گزر گئے۔ معراج صاحب کے بغیر...... دنیا کا دستور یہی ہے بقول شاعر......

موت سے کس کو رستگاری ہے...... آج وہ کل ہماری باری ہے

سو اللہ کی رضا میں راضی ہیں۔ بہنو اب اجازت چاہوں گی۔ بشرط صحت وزندگی آئندہ ماہ پھر ملاقات ہوگی......

اللہ نگہبان، دعا گو عذرا رسول

☆☆☆

جی بہنو! جیسا کہ عذرا رسول صاحبہ نے ذکر کیا کہ معراج صاحب کی دوسری برسی ہے۔ دن کیسی تیزی سے گزرتے ہیں۔ کئی بہنوں نے اپنے تاثرات بھیجے ہیں اور جن بہنوں کی تحریریں رہ گئی ہیں تو آئندہ ماہ ان شاء اللہ شامل کرلیں گے۔ آپ کے ذوق وشوق کو دیکھتے ہوئے ہی کوشش کررہے ہیں کہ رسالہ آپ کو جلد از جلد ملا کرے بس اسی لحاظ سے آپ لوگ تبصرے اور

دیگر نگارشات جلد سے جلد بھیجنے کی کوشش کیا کریں۔ موقع کی مناسبت سے تحریریں اور مراسلات، شاعری وغیرہ تین ماہ پہلے ہی بھیج دیا کریں۔ ماہ اپریل، مئی سالگرہ نمبر رمضان وعید سے متعلق ہوں گے تو اشعار وغیرہ پہلے ہی روانہ کر دیجیے گا۔ اپنی شاعری پر زور دیں مگر معیار کو پہلے مدنظر رکھیں نامور شعرا کے انتخاب بھی بھیجیں۔ کرنے کو تو بہت سی باتیں ہیں مگر آپ کی سرگرمیاں اور خطوط منتظر ہیں تو پیاری بہنو...... حسب روایت نت نئی خبروں اور سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوص دل سے درود ابراہیمی اور اس کے بعد تین بار آیت کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ، ساتھ تمام اہل وطن کو بھی یاد رکھیں۔

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ ماہنامہ پاکیزہ کی مستقل قاری اور تبصرہ نگار زرینہ خانم لغاری، مظفر گڑھ کے عزیز بھتیجے کو اللہ تعالیٰ نے بیٹا عطا کیا ہے جس کا نام علی محمد رکھا ہے۔ (بے حد مبارک ہو)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ثمینہ کوکب، جہلم کی نواسی کی پہلی سالگرہ خوب دھوم دھام سے منائی گئی۔ (ہماری طرف سے دعاؤں کا تحفہ حاضر ہے)

☆ رائٹر ریما نور رضوان کے خوب صورت افسانوں پر مشتمل مجموعہ محبت معتبر سی ہے، اشاپرنٹرز ڈیرا اسماعیل خان کے بینر تلے شائع ہوگیا ہے جس میں معروف مصنفات نے اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کتاب کا انتساب مصنفہ نے اپنے شریک حیات محمد رضوان یعقوب کے نام کیا ہے۔ بے حد خوب صورت سرورق اور سفید دلکش صفحات سے مزین اس کتاب کی قیمت صرف 600 روپے ہے کتاب کے حصول کے لیے 0913786 0344 پر رابطہ کریں۔

☆ مصنفہ بشریٰ سیال کے ہاں پیاری سی بیٹی تولد ہوئی ہے جس کا نام انہوں نے فاطمۃ الزہرا رکھا ہے۔ (بہت مبارک ہو)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار حدیث اختر، ملتان کے پیارے نواسے عبداللہ کی اس ماہ سالگرہ ہے اور ان کے بیٹے حسان کی سالگرہ بھی پچھلے دنوں منائی گئی۔

☆ انجم انصار کی پیاری بہو ڈاکٹر سیدہ آرزو عظیم اورل سرجری میں ماسٹرز کر کے اسپیشلسٹ بن گئی ہیں۔ (بہت، بہت مبارک ہو)

☆ ماہنامہ پاکیزہ کی مستقل قاری، تبصرہ و مراسلہ نگار نگینہ ضیا بنگش، گیاڑی کے پیارے بھائی محمد عثمان کی شادی خانہ آبادی بخیر و خوبی پشاور میں انجام پائی ہے۔ آج کل نگینہ اپنے میکے گئی ہوئی ہیں مگر وہاں بھی تمام پاکیزہ ٹیم کو دعاؤں میں یاد رکھا ہے۔ (بہت مبارک ہو)

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری، تبصرہ نگار، مصنفہ اور شاعرہ فصیحہ آصف خان کے شوہر کے پتے کا آپریشن کامیاب ہوگیا اب وہ روبصحت ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری، تبصرہ نگار، بہترین شیف اور عذرا صاحبہ کی دیرینہ دوست محترمہ تسنیم ماپارا پچھلے دنوں شدید بیمار رہیں۔ قاری بہنیں ان کی مکمل صحت یابی کے لیے ضرور دعا کریں۔

☆ معروف قلم کار اور سابقہ مدیرہ پاکیزہ انجم انصار کی طبیعت آج کل ناساز ہے۔

☆ پاکیزہ کی پیاری بیٹی، خیر خواہ اور بہترین استاد امینہ عندلیب، سلانوالی کی مکمل صحت یابی کے لیے خصوصی دعا کی درخواست ہے۔

☆ ماہنامہ پاکیزہ کی شاعرہ، قاری اور تبصرہ نگار پیاری فریدہ فری، لاہور کے لیے دعائے صحت کی گزارش ہے۔

☆ مستقل تبصرہ نگار اور بزرگ قاری، شاعرہ فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی کی صحت و سلامتی کے لیے ضرور دعا کریں۔

☆ تمام قارئین و دیگر اہلِ وطن جو کورونا وائرس کے باعث بستر مرض پر ہیں ان کی مکمل صحت یابی کے لیے ضرور دعا کریں۔

انتقالِ پُرملال

☆ اس ماہ ادارے کے بانی جناب معراج رسول کی دوسری برسی ہے۔ تمام قارئین سے دعائے مغفرت کی استدعا ہے۔

☆ معروف رائٹر انوار صدیقی کی اہلیہ بلقیس کنول جو خود بھی مصنفہ تھیں رضائے الٰہی سے انتقال کر گئیں۔

☆ ماہنامہ پاکیزہ سے وابستہ ہماری دیرینہ رائٹر محترمہ ساجدہ حبیب کے پیارے بھائی کیپٹن ریٹائرڈ راجا معروف افضل چیئر مین پبلک سروس کمیشن اسلام آباد، کورونا وائرس کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ ساجدہ آپی کے دیگر بہن، بھائی اور والدہ شدید غم میں مبتلا ہیں۔ اللہ پاک مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اہلِ خانہ کو صبر جمیل عطا ہو، الٰہی آمین۔

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار و مستقل قاری فہمیدہ جاوید، ملتان کی بھانجی دس ماہ بلڈ کینسر کے مرض میں مبتلا رہ کر انتقال کر گئیں۔ بچی نے بہت تکلیف برداشت کی۔ اس کی مغفرت کی اور اس کے گھر والوں کے لیے صبر اور خوشیوں کی دعاؤں کی التجا ہے۔

☆ پاکیزہ کی مصنفہ اور تبصرہ نگار صبا آصف کی والدہ محترمہ مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔

اللہ پاک تمام مرحومین کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبرِ عظیم عطا ہو، الٰہی آمین۔

☆☆☆

اب بہنوں آتے ہیں آپ کے پیارے، پیارے خطوط کی طرف۔

✿ عائشہ خان، لاہور سے۔ ''سب سے پہلے تو مجھے اپنے پیارے پاکیزہ کی پیاری مصنفین اور قارئین سے یہ کہنا ہے کہ میں پاکیزہ میں شرکت بے شک کبھی کبھار ہی کروں لیکن بہنوں کی محفل کے توسط سے آپ سب کے احوال سے آگاہ ہمیشہ رہتی ہوں۔ آپ کی کامیابیاں اور خوشیاں مسرور کرتی ہیں تو بیماری، پریشانی یا دکھ غمزدہ کر دیتے ہیں شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ میں نے آپ کے لیے دعا نہ کی ہو۔ گزشتہ دو تین ماہ سے آنکھوں کی سرجری کی وجہ سے پڑھنے لکھنے کا سلسلہ بالکل موقوف تھا۔ اب ڈائجسٹ نکالے اور بہنوں کی محفل میں شرکت کی تو دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ آہ...... پیاری بہنوں غزالہ عزیز، انجم آپی، شمیم فضل خالق، آمنہ حماد، ذوالنورین، حمیرا انجم اور مسرت رانی نے کیسے، کیسے پیارے رشتوں سے دائمی جدائی کا دکھ سہا...... دل سے ایک آہ نکلی اور زبان بے اختیار پکار اٹھی۔ یا اللہ...... بے شک آخری منزل تو ہم سب کی وہی ہے لیکن بڑا مشکل مرحلہ ہے۔ اپنے پیاروں کو اس منزل کی جانب روانہ کرنا اور پھر صبر اور حوصلے کا دامن تھامے رہنا۔ یا اللہ آپ اپنے خاص فضل و کرم کے ساتھ میری ان بہنوں کو صبر جمیل عطا فرمائیں...... اور ان کے پیاروں کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں۔ آپ سب کے غم میں برابر کی شریک ہوں اور ہر لحہ آپ کے لیے دعا گو...... سب بیمار بہنوں کے لیے دلی دعا ہے کہ پیارے اللہ جی سب کو صحت کاملہ عطا فرمائیں۔ ان سب بہنوں کا بے حد شکریہ جنھوں نے میرے ناولٹ ایک سجدہ کو پسند کیا۔ خاص طور پر عذرا آپی، سلمیٰ غزل اور راشدہ عفت احمد مطیع نے تو دل خوش کر دیا۔ سلامت رہیں آپ...... ہمیشہ خوش رہیں...... پیارے اللہ جی کی رحمتوں اور محبتوں کے حصار میں رہیں۔ سرورق دلکش تو تھا ہی لیکن ماڈل کے آنچل لینے کے اسٹائل اور مسکراہٹ نے اس خوب صورتی کو بڑھا دیا۔ اداریہ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ نے ایک صفحے میں نہ صرف پورے سال کی بے حد خوب صورتی سے تصویر کھینچ کر رکھ دی بلکہ نئے سال کے استقبال کے لیے خوشیوں اور امیدوں کے دیے بھی روشن کر دیے۔ آپ کی اس دعا پر کہ اگلا سال محبتوں کو آزمانے میں نہیں ان کا حق ادا کرنے میں گزرے...... دل کی گہرائیوں سے آمین یارب العالمین کہا اور دین کی باتوں سے دل و روح کو سیراب کرنے کے بعد سید ھا یا حی یا قیوم کا رخ کیا۔ فہرست میں عنوان دیکھنے کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی اور تحریر پہلے پڑھی جاتی۔ عالیہ حرا نے بہت ہی خوب صورت لکھا۔ ایک، ایک لفظ نے دل خوش کیا۔ پیارے اللہ جی مصنفہ کو ایسی اصلاحی تحریر لکھنے پر اور مدیران کو شائع کرنے پر اپنی شان کے مطابق اجر عطا فرمائیں۔ (الٰہی آمین) فرحین اظفر کی تحریر ع عورت گ گمنام...... زبردست تھی۔ پاکیزہ ڈائری میں تمام تحاریر لاجواب تھیں۔ خاص طور پر کوثر خالد سودا کی حمد باری تعالیٰ، جبینا کی نعت رسول مقبول اور ذکیہ بلگرامی صاحبہ کی دعا۔ اس دعا کے ساتھ اجازت کہ پاکیزہ ہمیشہ شہرتوں کے افق پر جگمگائے اور اس کو سجانے، سنوارنے والے سبھی لوگ پیارے اللہ جی کی رحمتوں اور محبتوں کے حصار میں رہیں۔'' (پیاری بہن عائشہ، اب چونکہ پاکیزہ جلدی آنے لگا ہے اس لیے آپ کا خط جنوری میں شامل ہونے سے رہ گیا۔ آپ کا شکریہ اپنی بیماری کے باوجود اتنا تفصیلی اور خوب صورت نامہ تحریر کیا۔ اللہ آپ کو صحت و سلامتی سے رکھے اور یونہی پاکیزہ کا ساتھ دیتی رہیں، آمین)

✿ آسیہ عامر، کراچی سے۔ ''تھوڑی سی سردی کیا شروع ہوئی کالج کے دن یاد آ گئے۔ فرنچ فرائز کی پلیٹ اور کافی

کا کپ اٹھایا لاؤنج کے صوفے پر بقول ساس کے مل مار کے (قبضہ) کر کے بیٹھ گئی۔ ہاتھ میں پاکیزہ پکڑا آخر کو چوبیس گھنٹوں میں سے ایک گھنٹا ذاتی ہمارے لیے ہی ہونا چاہیے کیوں بہنوں سب متفق ہو مجھ سے؟ (ہاں جی بالکل) اپنی پرانی ریت توڑ ڈالی بہنوں کی محفل سے پہلے مجھے کچھ کہنا ہے...... پڑھا نزہت آپی نے بہت خوب صورت لکھا ہے اور میں سوچ رہی تھی کہ ہر سال کے ہر مہینے میں الگ، الگ کئی سال تک لکھنا کمال...... ہے (یہ سب تو کمال ہے تم لوگوں کی دعائیں ہیں) اختر شجاعت صاحبہ کے لیے ڈھیروں دعائیں کہ ہمیں ہر مہینے ایک شاندار سپر ڈوپر مضمون مہیا کرتی ہیں اب اس سے سبق سیکھنا ہماری ذمے داری ہے (درست کہا) آصف الیاس کا انٹرویو پڑھ کر سوچ رہی تھی کون سا ایوارڈ رہ گیا ہے جو انہوں نے نہیں لیا، اللہ اور ترقی و کامرانی عطا فرمائے۔ بہنوں کی محفل میں فریدہ افتخار کا تبصرہ دل کو بھایا۔ شبینہ گل کی تحریر لاک ڈاؤن لڈو ایک بہت سبق آموز ساتھ خوش کرنے والا ناول پڑھ کر لاک ڈاؤن کے دنوں میں مزہ آیا بہت دن ہوئے عقیلہ جی کی تحریر کے دیدار کو (جی وہ جلد آئیں گی کچھ مصروف ہیں) شائستہ زریں کا سروے ہمیشہ سے ہٹ کر رہا۔ ناہید فاطمہ حسنین کی ایک اور خوبی ہم پر عیاں ہوئی۔ خولہ سعید جاوید کا ستار العیوب دل پر اثر کرنے والا افسانہ نہایت شاندار...... داغ تو اچھے ہوتے ہیں ویری گڈ...... عالیہ حرا کا ناولٹ یا حی یا قیوم کافی مذہبی ہے، اچھی باتیں بتائیں...... غزالہ عزیز کا یقین کا سفر پڑھ رہی ہوں اچھا لگ رہا ہے باقی اس دفعہ پاکیزہ پڑھنا میرے لیے چیلنج بنا رہا۔" (کیوں بھئی دیر سے ملا تھا جبھی خط دیر سے پہنچا اور اب فروری میں شامل کیا ہے۔ خوش رہو)

✉ حنا تصور احمد، کراچی سے۔ "زندگی میں پہلی بار پاکیزہ کے نام خط لکھ رہی ہوں۔ امید کرتی ہوں کہ شامل اشاعت ٹھہرے گا۔ جس ادارے کے بانی اتنی مضبوط شخصیت اور اچھے انسان ہوں ان کی کچھ اور ہی بات ہے۔ یوں قلم اٹھایا ہے۔ معراج رسول نے واقعی ٹیلنٹ کو جگہ دی ہے جن کے لیے ایک شعر تحریر کیے دیتی ہوں۔

وہ کیسے لوگ تھے سوار کر آئے بلندیوں کے پار...... جو نہ رہے تو امیدیں ہو گئیں ہیں تار، تار

(عزیز بہن ادارے سے نکلنے والے تمام رسالوں بشمول پاکیزہ میں یہی کوشش ہوتی ہے...... کہ معیاری مواد چھپے) بعض لوگوں کے لیے ہر قابلِ تحسین جملہ...... شعر سب ان کی شخصیت کے سحر کے لیے کم لگنے لگتا ہے۔ پاکیزہ کی ہر کہانی سیپ میں بند موتی اور کوزے میں بند دریا کے مانند ہوتی ہے۔ ہر تحریر با مقصد اور معیاری ہیروں کی طرح منعکس و منور دلوں کو روشن کرنے کا ہنر، اندر تک شانت اور پُرسکون کر دینے سے واقف ہر رائٹر کا اپنا انداز...... جیسے کہ نفیسہ سعید کا سمجھوتا ایک ضرورت اُف اتنی سچائی کہاں سے اٹھالاتی ہیں آپ کی رائٹر...... مگر صرف با مقصد تحریر ہی اچھی لگتی ہے پلیز رومانوی کہانیاں اور محبت پر مبنی کہانیوں کی اتنی زیادہ زیادتی نہ ہونے دیں۔ پاکیزہ کے معیار میں کمی واقع ہونے لگے گی۔ (جی آپ کی رائے کا احترام کریں گے) کسی بھی رائٹر کے لیے وسیع مطالعہ، گہرا مشاہدہ اور ارد گرد کے مناظر پر گہری نگاہ ہونی اشد ضروری ہے۔ ادب سے عشق کی حد تک لگاؤ ہے۔ پاکیزہ کی بزم میں پڑھ کر خوشگواری کا احساس ہوتا ہے پاکیزہ کے معیار کو قائم رکھیں۔ اس کی انفرادیت ہی اس کی شناخت ہے۔ انجم انصار کی نرم خوئی سے میں بہت متاثر ہوں۔ یہاں محاورتاً نہیں حقیقتاً نو آموز لکھاری کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ ہم بھی پاکیزہ کے چاہنے والوں میں شامل ہیں۔ ہمیں بھی اپنا رفیق بنا لیجیے گا۔" (جی بالکل، آپ سے ہی تو پاکیزہ ہے...... معیاری کہانیاں اور تعمیری تبصرے ہماری پہچان ہیں آپ کی تحاریر ابھی پڑھی نہیں گئیں)

✉ کوثر خالد، جڑانوالہ سے۔ "پچھلے ماہ کا رسالہ ابھی پڑھا تھا کہ نیا رسالہ اب 16 دسمبر کو وصول ہوا۔ مستقل سلسلے اور یا حی یا قیوم پڑھا ہے بس۔ تاکہ خط کو دیر نہ ہو جائے۔ (پھر بھی دیر ہو ہی گئی) یہ پہلی کہانی ایسی پاکیزہ لگی ہے کہ ساتھ، ساتھ تسبیح پڑھنا گوارا ہو گیا۔ سرورق بھی پاکیزہ ہو تو لطف آ جائے (جی بالکل) اختر شجاعت کو پڑھنا سب سے اچھا لگتا ہے اور حمد و نعت اور با مقصد شاعری دل میں اتر جاتی ہے۔ انجم کو پر سا دینے کا حوصلہ اس لیے نہیں کیا کہ وہ بھی عذرا کی طرح سمجھدار، بہادر، صبر والی ہیں۔ کوئی بات نہیں غم تو زندگی کا حصہ ہیں۔ ان سے کیا گھبرانا۔ بس اب یادیں ہی ہمارا سہاگ ہیں۔ اور خوابوں میں ہم نے اپنے، اپنے سرتاج سے ملنا ہے۔ پھر بھی لوگوں میں خوشی بانٹنی ہے، یمنیٰ احمد کی شاعری مجھے بہت پسند ہے۔ شگفتہ شفیق تو فریدہ فری جیسی لگتی ہے۔ کارنر میں داغ والا پیغام میرے دل کی آواز ہے۔ آصف الیاس اتنا سا لڑکا اور بڑے، بڑے کام واہ...... شمیم

فضل خالق نے تو بہت دل پر لیا بھئی...... ان کے لیے بہت سی دعائیں حاضر ہیں اور تمام غمگین دلوں کو توکل اور استقامت نصیب ہو جائے۔" (الٰہی آمین، بڑے دنوں بعد کوثر آئیں اللہ پاک سب خیر رکھے، مختصر تبصرے کا شکریہ)

ثمینہ کوکب، جہلم سے۔" سرورق ہمیشہ ہی جاذب نظر ہوتا ہے۔ رسالے کے آغاز میں آیات قرآنی کے ترجمے اور اسمائے گرامی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفحات کو خوش آمدید کہا۔ قیصرہ حیات صاحبہ نبیؐ کے اسمائے گرامی کو بہت پیارے طریقے سے معنی ومطالب کے ساتھ اور فضائل کے ساتھ بتاتی ہیں۔ (جزاک اللہ) نزہت اصغر صاحبہ کے اداریے کے الفاظ بہت پُرفہم و پُراثر لگے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات، اختر شجاعت صاحبہ کی بہت خوب صورت تحریر ہے۔ اس مرتبہ نبی پاکؐ کے معجزات کے بارے میں لکھ کر بہت ایمان افروز تحریر سے نوازا ہے۔ اللہ پاک انہیں اس کا بہترین اجر دے۔ شائستہ زریں صاحبہ محبت کا سفر عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی تک سروے میں تمام بہنوں کے خیالات منفرد اور دلچسپ تھے۔ پڑھ کر اچھا لگا۔ اندازِ نو میں آصف الیاس صاحب سے ملاقات اچھی لگی۔ ایسے عظیم لوگ ہی ہماری ملت وقوم کا سرمایہ ہیں۔ گوشۂ ظرافت بھی اچھا لگا۔ میرا اسار ازنگ اتار دو، افشاں آفریدی، میں عشق ہوں، نایاب جیلانی، میں انمول، سعدیہ رئیس دلچسپ ہوتے جارہے ہیں۔ یاحی یاقیوم، عالیہ حرا، بوجھ روحیلہ خان دونوں ناولٹ اچھے لگے۔ فرحین اظفر صاحبہ ع عورت گ گمنام دولت کو سب کچھ سمجھنے والوں کے لیے ایک بہترین تحریر تھی۔ ہمیں بھی جینے دو۔ عطیہ ہدایت اللہ، ستار العیوب، خولہ سعید جاوید یقین کا سفر، غزالہ عزیز صاحبہ تمام افسانے دلچسپ اور سبق آموز بھی تھے۔ داغ تو اچھے ہوتے ہیں۔ نیر فہیم صاحبہ نے خوب لکھا ہے۔ سپاس گل صاحبہ کی بھیجی ہوئی نعت اور فریدہ افتخار صاحبہ کا نذرانۂ عقیدت پسند آئے۔ عذرا آپی کی بہنوں کی محفل میں آمد اور ان کی باتیں ہمیشہ کی طرح بہت اچھی لگتی ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے ہماری کوئی بہت ہی قریبی اور پُرخلوص شخصیت ہم سے ہم کلام ہے۔ اللہ عذرا آپی کو صحت وزندگی اور لمبی عمر عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین......

(آپ سب کا خلوص اور محبت ہے اور عذرا صاحبہ مصنفات وقارئین کو بے حد اہمیت دیتی ہیں۔) تمام بیمار بہنوں کی صحت و سلامتی والی زندگی کے لیے ہاتھ بارگاہ خداوندی میں بلند ہیں۔ تمام سلسلے بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ پاکیزہ ڈائری، بزم پاکیزہ، بہنوں کی محفل، میں اکثر گنگناتی ہوں، خوش ذائقہ، منتخب غزلیں، روحانی مشورے، ہومیو کلینک تمام سلسلے خوب ہیں۔ انتقالِ پُرملال میں تمام مرحومین کو پروردگار جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں۔ اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل سے نوازیں، آمین۔ آخر میں پاکیزہ کی ترقی اور اس سے وابستہ لوگوں کی صحت وسلامتی کے لیے خصوصی دعا۔ پاکیزہ کی یہ محفل یونہی ہر سال سجتی رہے۔ اور ہر آنے والا سال اس کی مزید ترقیوں اور کامیابیوں کا سال ہو۔ تمام بہنوں کو نئے سال کی مبارک باد۔" (آپ خوش رہیں اور اسی طرح حاضری بھی دیتی رہیں)

جیبنا، کراچی سے۔" نئے سال کی ابتدائی ساعتوں میں پورے سال کے لیے ڈھیروں دعائیں...... نئے سال کا پہلا شمارہ 26 دسمبر کو ملا۔ سارہ عثمان کی مسکراتی جگمگاتی من موہنی صورت لیے اور رسالے کے اندر ڈھیروں خوب صورت یادیں، باتیں، بہت اچھا لگا۔ تمام بیماروں کی صحت اور جانے والوں کے ایصال کی دعا...... خاص طور پر ڈاکٹر نعیم اختر کی والدہ، اللہ تعالیٰ مرحومین کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ دسمبر کے حوالے سے شاعری بہت اعلیٰ، پاکیزہ ڈائری میں سب کچھ ایک سے بڑھ کر ایک تھا۔ روحانی مشورے اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ سے سجے مختصر وظائف بہت کارآمد بہت مفید، اللہ تعالیٰ ادارے کے اس کارِ خیر کو اپنی بارگاہ اقدس میں قبولیت بخشے...... (الٰہی آمین...... آپ سب بہنوں کی کاوشوں کو ہی ترتیب دیتے ہیں) سیمار ضا ردا کا انٹرویو اور شاعری دونوں بہت ہی اچھے لگے۔ شاعری تھوڑی زیادہ ہوتی تو اور اچھا تھا۔ آپی پچھلے ماہ آپ کی یہ بات بہت مزے کی لگی کہ بہنیں شاعری بہت کرتی ہیں، دل سے دعا نکلی کہ میرا وطن شاعروں کا وطن بھی کہلائے۔ (شاعری بھی تو باوزن، پُراثر اور معیاری ہو) افسانے اس بار کم تھے اور نئے سال کے پہلے ہی رسالے میں تو یہ کچھ اچھا شگون نہیں ہے کہ میری طرح مزید پڑھنے کے لالچ میں کئی چیزوں کو دو، دو بار بھی پڑھا۔ ہاہاہا...... (پیاری جیبنا طویل اور مختصر دونوں کہانیوں کا امتزاج رسالے میں قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں) خاص طور پر جب بوجھ اور شیریں حیدر کا ناولٹ پڑھا تو دل میں آیا کہ تھوڑا اور ہوتا چند صفحے اور بوجھ کا دوسرا اور آخری حصہ میری توقع کے برعکس تھا۔

بہر حال ہوا تو دھوکا ہی چاہے جیسا بھی ہوا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس کا متبادل اچھا دے دیا۔ میں اور فارہ ایک اچھی اور بہترین تحریر رہی۔ ماشاء اللہ عورت کہانی ہمیشہ کی طرح سپر ڈوپر رہی۔ سال نو مبارک اور نیا سال دوستوں کے سنگ بھی ٹھیک ہی رہا۔ ہنڈ دونوں کا مزیدار تھا۔ شمع ہدایت لفظ، لفظ موتی پرو دیے گئے اور موتیوں کی اس مالا کے لیے تعریف کے الفاظ کم پڑ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ محترمہ اختر شجاعت اور ان جیسے دوسرے لفظوں سے روشنی بکھیرنے والوں کو سلامت رکھے۔ (الٰہی آمین) میں انمول، منی ناول اختتام کو پہنچا اب جنوری کے باقی دن اس کی ساری اقساط پڑھوں گی تو مہینہ اچھا گزر جائے گا۔ (ارے واہ بہت خوب......) دسمبر کی تمام شاعری دل کو بھائی بہترین، بہترین نظمی، ظالم بہو یا مظلوم ساس کی جیتی جاگتی تصویر تھی دیر آید درست آید کے تحت آخر بہو کو احساس ہو ہی گیا۔" (کہانیوں کے بارے میں اتنا کہیں گے کہ دوبارہ کوشش کریں اور مختصر تو ضرور لکھیں...... مگر بامقصد ہو بہت ہی مختصر بھی نہیں)

✿ سمارا انعم بھٹی، ڈیرا غازی خان سے۔ "دسمبر کے شمارے پر تبصرہ حاضر ہے۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ کی روشن باتیں دل کو چھو گئیں...... دین کی باتوں کا کوئی جواب نہیں ماشاء اللہ...... مکمل ناول، یقین کا سفر، غزالہ عزیز کا بے حد پسند آیا۔ ناولٹ دونوں بہترین تھے تو افسانے بھی لاجواب...... بہنوں کی محفل بہترین ہے پاکیزہ میں اپنائیت محبت محسوس ہوتی ہے۔ نزہت آپی میری تحریر پہنچی تے پردیس...... کے بارے میں بھی لگے ہاتھوں بتا دیں۔ جامع تبصرہ پھر بھی کروں گی فی الحال بس اتنا ہی اب اس دعا کے ساتھ اجازت کہ اللہ تعالیٰ نئے سال کو آپ کے ادارے اور ہم سب کے لیے خوشیوں، ترقیوں، کامرانیوں کا سال بنائے الٰہی آمین......" (دعاؤں کے لیے جزاک اللہ...... پہنچی تے پردیس کے لیے معذرت ابھی آپ سینئر رائٹرز کو پڑھیں پھر لکھیں)

✿ زرینہ خانم لغاری، مظفر گڑھ سے۔ "پاکیزہ ملا دل خوش ہو گیا۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں مدیرہ بہن نزہت اصغر نے خوب صورت باتیں کی ہیں۔ ننھی، منھی سبق آموز کہانیاں دل کو بھائیں وہ اک لمحہ لوگ کیسے دوغلے ہوتے ہیں منافق اپنے چہرے پر نقاب لگائے ہوئے شکر ہے' نگین صاحبہ بچ گئیں ورنہ راجو سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتیں۔ ماں بہت پیاری کہانی تھی۔ واقعی لڑکی سسرال میں کام کر کر کے نہیں گھبراتی اگر خاوند مان دے تو وہ ہر مشکل سے گزر جاتی ہے۔ (جی درست کہا) عطا میں یہ سبق ہے بے اولاد خواتین کو یہ بات سر پر سوار نہیں کر لینی چاہیے دنیا کی ہر نعمت اللہ تعالیٰ نے دے رکھی ہے اگر اولاد نہیں ہے تو صبر کرنا چاہیے واویلا...... شکوہ شکایت سے کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنا فضل کر ہی دیا۔ منزل پروانہ اچھا سبق ہے بیروزگاری تو آج کل ہر پڑھے لکھے لڑکے کا مقدر بن چکی ہے، لڑکوں کو چاہیے حلال روزگار کے لیے رکشا چلانا، ٹھیلا لگانا شروع کر دیں چوری ڈاکا، بھیک مانگنا غلط ہے لاک ڈاؤن لڈو کافی مدتوں بعد ایسی مزیدار کہانی پڑھنے کو ملی اور مدتوں یاد رہے گی ایک شاہکار کہانی تھی مل بانٹ کر کام بھی ہو گئے جم جائے بغیر خواتین اسمارٹ ہو گئیں۔ بچت بھی ہوئی، غریبوں کی امداد بھی کر لی لاجواب کہانی تھی۔ ہنسنے ہنسانے کا تڑکا بھی تھا۔ پس آئینہ میں اپنی ماں کو خوب آئینہ دکھایا۔ ایسی نندیں اللہ ہر کسی کو دے۔ کاہے کو بیاہی بدیس...... مائیں بیٹیوں کے نصیبوں سے ڈرتی ہیں، خدارا بیٹیوں پر ظلم نہ کریں...... سب سے زیادہ قصور وار نذر محمد ہے جس نے چھوٹی سی بات کو ایشو بنا لیا۔ ماں، باپ کو بیٹیوں پر اعتماد کرنا چاہیے۔ پتھر کے رشتے، ایک اور ظلم کی کہانی تھی جہاں معصوم بچی کی جائز خواہش کو مسئلہ بنا لیا گیا۔ ماں باپ اپنی بچیوں کی قدر کریں۔ بچیاں یوں رولنے کے لیے نہیں ہوتیں۔ گو کہ یہ فرضی کہانیاں ہوتی ہیں لیکن کہانی کار بہن یہ کہانیاں آس پاس ہی سے لیتی ہیں۔ بڑی بہو اچھا سبق ہے۔ بڑی بہو پہلے پہل مشکل میں پڑتی ہے لیکن آخر میں وہی کامیاب ہوتی ہے۔ شادی مبارک پیاری، پیاری دلہنیں دیکھ کر دل خوش ہو گیا پرانی دلہن نئی دلہن اللہ تعالیٰ ان سب بہنوں کو خوش رکھے۔ فصیح باری خان سے ملاقات کر لی۔ ان کے ڈرامے لاجواب ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں خوش کرتے ہیں خدا انہیں خوش رکھے۔ گوشۂ ظرافت مسکرانے پر مجبور کر دیتا ہے۔" (مفصل تبصرے کا بہت شکریہ اسی طرح پابندی سے آتی رہیں)

✿ یاسمین کنول، پسرور سے۔ نئے سال کا نیا شمارہ نظر نواز ہوا۔ سرورق کی ماڈل سادگی میں بہت اچھی لگی قدرتی خوب صورتی انسان کو زیادہ متاثر کرتی ہے۔ اداریہ نئے سال کی دعاؤں کا مرکب ہے اللہ تعالیٰ تمام دعائیں قبول فرمائے اور اس سال کو کورونا وائرس سے نجات کا سال بنائے (آمین ثم آمین) سلسلے وار ناول، میرا اسارا زنگ اتار دو۔ ماشاء اللہ قسط نمبر

22 پر آپہنچا ہے۔ افشاں آفریدی کے اس ناول کی دھوم میں ہیں آگے کیا ہوگا؟ (اب پتا چل جائے گا) نئی ناول میں انمول ہوں ہونا چاہیے تھا خیر میں انمول واقعی قابلِ تعریف ناول ہے سعدیہ رئیس نے عورت کی عزت اور بھاگنے والی عورت کی عزت کو بڑے دھیمے انداز میں دکھایا ہے اور انمول تو وہی ہے جس کی عزت محفوظ ہے۔ بے مول عورت کا وجود کیا معنی رکھتا ہے صرف زندہ لاش...... فرحین اظفر کی عورت کہانی پسند آئی۔ ع عورت ل سے لحاظ واقعی لحاظ کرتے ساری زندگی گزر جاتی ہے اور جب دوسروں کا لحاظ کرنا پڑتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ لحاظ ہی اچھا ہے۔ بے مروتی تو پھر اپنے دکھ کو دُہرانے والی بات ہے۔ بیٹوں کو ماں کے سامنے بیوی کو زیادہ بڑھا چڑھا کے نہیں پیش کرنا چاہیے کیونکہ والدین خصوصاً ماں عمر کے اس حصے میں اپنی توہین برداشت نہیں کرسکتی۔ چاہے اس کا قصور ہے یا نہیں...... ویسے بھی ثواب ہوتا ہے لحاظ ہی اچھا ہے۔ سالِ نو مبارک اور نیا سال دوستوں کے سنگ زبردست افسانے ہیں۔ شمع ہدایت کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہے۔ وہ آئے بزم میں سیمار ضاردا سے ملاقات سے دلی خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان کے فن کو مزید نکھار بخشے۔ آمین ثم آمین۔'' (بہت شکریہ یاسمین بڑے عرصے بعد آئیں دسمبر میں کوئی خط نہیں ملا اب باقاعدگی سے آیئے گا)

✉ فریدہ فری، لاہور سے۔ ''سب کو نیا سال مبارک ہو افسانے تو تھے ہی بے حد اچھے سالِ نو مبارک، نکمی، روبینہ یوسف نے خوب لکھا۔ منی ناول سعدیہ رئیس صاحبہ کا بے حد پسند آیا۔ خوش رہو...... میں انمول پڑھ کر مزہ آگیا۔ شیریں حیدر کا ناولٹ بے حد دلچسپ لگا مکمل ناول نگہت سیما کا کمال کر دیا۔ کیا بات ہے۔ میں اور فارہ، ریحانہ اعجاز لاک ڈاؤن اور لاڈلے بیٹے کی شادی کا احوال لاجواب ایک، ایک صرف لاجواب ہیرے موتیوں جیسا۔ ایک بات ہے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ہم بھی ان کے ساتھ شریک تھے۔ بہت، بہت مبارک باد ریحانہ جی...... سدرہ کلثوم کی مروت بہت یاد آتی ہیں ان کا فون نمبر میرے پاس نہیں ہے پہلے تھا ہم ان سے باتیں کرتے تھے جہاں رہو خوش رہو۔ وہ مجھے لائک کرتی تھیں ان کے ابو اسلام آباد میں زیرِ علاج تھے۔ (اب تو کافی عرصے سے نہیں آئیں) اختر شجاعت کی خالہ کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں جگہ دے، ان کو بہت، بہت سلام تمام بیماروں کو شفایابی ملے، آمین۔ پیاری بھابی عظمیٰ آفاق کو بے حد پیار دعا...... (جی آپ کی سلام و دعا پہنچا دی گئی ہے) معراج صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ دے آمین۔ سرما میرا فیورٹ موسم ہے اور طبیعت بھی ٹھیک ہے، میں تو گرمی کے موسم میں بیمار ہوتی ہوں۔ پروین افضل بھابی کو سلام دعا اور نقیب الحسن کو بہت، بہت پیار۔'' (اللہ آپ کو صحت و سلامتی سے رکھے۔ اتنی بیماری میں بھی خلوص نامہ لکھتی رہی ہیں)

✉ خولہ سعید جاوید کراچی سے۔ ''پاکیزہ میں سب سے پہلے مجھے کچھ کہنا ہے پڑھا...... اللہ کی قدرت کے سامنے تمام کائنات ہمیشہ سے ہی بے بس ہیں۔ نیا سال کورونا سے نجات کا سال ہو آمین۔ اختر شجاعت نے ہمیشہ کی طرح بے مثال لکھا۔ پڑھنے میں سب اچھا لگتا ہے لیکن عمل کے وقت لالچ اور دنیاوی خواہشات کے پیچھے ہم خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں۔ بہنوں کی محفل میں سلمیٰ غزل نے ستار العیوب کو بھرم سے مشابہہ قرار دیا میں نے نیٹ پر پاکیزہ نومبر 2009ء نکالا۔ بھرم افسانہ موجود ہے۔ رائٹر بلقیس ظفر اور کہانی بالکل علیحدہ سلمیٰ غزل بڑا اور پرانا نام ہیں نہ معلوم انہوں نے ایسا کیوں لکھا۔ (کبھی، کبھی مماثلت ہو جاتی ہے اور اکثر عنوانات ملتے جلتے ہوتے ہیں مگر متن کچھ اور ہے)......... جینا، فریدہ ہاشمی مخفی اور نازنین آفریدی اور پچھلے افسانے پر عظمیٰ مشتاق کی بہت شکر گزار ہوں جنہوں نے افسانے کی تعریف کی پہلی، پہلی تعریف کبھی نہیں بھولتی۔ خوش رہیں، میں انمول، بہترین اختتام کیا ہے، کچی عمر کی جذباتی لڑکیوں کے لیے بڑا سبق تھا۔ (جی بالکل) شیریں حیدر خاندانی مسائل پر خوب لکھتی ہیں شوق سے پڑھا۔ آخر میں باقی آئندہ خوب ہی بوریت ہوئی۔ (ارے اب اچھی کہانی طویل بھی تو ہو سکتی ہے ناں) بوجھ میں قرۃ العین کی شادی عجیب حالات میں ہوئی باقی کہانی زبردست رہی۔ نیا سال دوستوں کے سنگ نوجوانوں کی زندگی کی حرارت سے بھرپور تحریر بہت اچھی لگی۔ فرحین اظفر نے ساس کے جذبات پر اچھا لکھا۔ شاکر اور ثمیر جیسے اپنی وفا کو گروی دکھ کر والدین کی عزت بچانے جیسے افراد اب بہت کم رہ گئے ہیں۔ روبینہ یوسف کی نکمی تو بہت گھروں کی کہانی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ عمارہ جیسی بہوئیں کم ہوتی ہیں۔ بہت اچھی کہانی ہے۔ ریحانہ اعجاز کے بیٹے کی شادی کا احوال تو یوں لگا جیسے ہم خود لاک ڈاؤن میں تیاری کے لیے خوار ہو رہے ہوں۔ تفصیل سے ہر بات لکھی۔

ماشاء اللہ بڑی ینگ لگ رہی ہیں، ساس بالکل بھی نہیں لگ رہیں۔میرا سارا زنگ اتار دو اور میں عشق ہوں بڑی خوب صورتی اور ست روی سے رواں دواں ہیں۔ پاکیزہ ڈائری میں حضرت محمدؐ کی فضیلت دوسرے انبیا پر اور مانگنا سیکھ لو دل کو چھو گیا۔ پاکیزہ کا ہر سلسلہ ہی لاجواب ہے۔'' (بہت نوازش اب طویل ناول کو تو ایسا ہی ہونا چاہیے ناں)

★ تسنیم کوثر، کراچی سے۔ ''جنوری کا چمکتا دمکتا دلکش کہانیوں سے سجا پاکیزہ دل کو خوش کر گیا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی افشاں آفریدی کے پیارے سے ناول میرا سارا زنگ اتار دو کو نمبر ون کہہ سکتے ہیں مگر بس اتنا کہنا ہے کہ دُرِ مکنون کی شادی عکرمہ سے ہی کرایئے گا۔ اور جناب سعدیہ رئیس نے بھی اپنے ناول میں انمول کا اختتام نہایت عمدہ ترین کیا اور بھئی شیریں حیدر کے وہ ہجر جو ہم کو لازم تھا کی کیا بات ہے، ان کا تو نام ہی کافی ہے۔ ہمیں ان کا ناول بہت اچھا لگا دیکھتے ہیں آگے کیا صورت حال ہوتی ہے۔ اور نایاب جیلانی کا میں عشق ہوں تو جناب سسپنس سے بھرا یہ ناول ذرا مشکل لگ رہا ہے۔ بہت سمجھ کے پڑھنا پڑتا ہے۔ (ارے بھئی تو سمجھا کرو ناں) اسی طرح روحیلہ خان کے ناول بوجھ کے لیے عرض ہے کہ اس کی شروع کی دو اقساط نے کوئی خاص تاثر نہیں دیا تھا مگر لاسٹ قسط بہت اچھی رہی یعنی اسے ایورج ناول کہہ سکتے ہیں اور بس اور عورت کہانی کی کیا بات کریں ماشاء اللہ فرحین اظفر ہر بار نہایت ہی عمدہ کہانی رقم کرتی ہیں۔ پیاری فرحین ہمیشہ خوش رہیے۔ اور ہمیں میں اور فارہ، نگہت سیما کا معصوم پیارا سا ناول بہت، بہت پیارا لگا۔ افسانوں میں روبینہ یوسف نے ننھی جم کے بہت خوب لکھا اور نیا سال دوستوں کے سنگ تسلیم شیخ کی اسٹوری بھی بہت اچھی تھی۔ اور شمع ہدایت میں اختر شجاعت کا قرب الٰہی پُر مکمل مؤثر مضمون دل کو چھو گیا۔ ویسے بھی ان کی تحریر ہمیشہ دل کو لگتی ہے اللہ انہیں جزائے خیر دے۔ (الٰہی آمین) وہ آئے بزم میں سیمار ضا ردا کا دلکش انٹرویوز بردست لگا۔ اصل میں نزہت آپ کا انٹرویو لینے کا انداز بے حد عمدہ ہوتا ہے اتنے اچھے سوال کرتی ہیں کہ انٹرویو میں جان پڑ جاتی ہے تو اسی بات پر آپ اپنا بھی انٹرویو دے ہی دیں بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ پاکیزہ کے اسٹاف میں سے بھی، بھی کسی کا تعارف یا انٹرویو جو بھی مناسب لگے ہونا چاہیے (جی ان شاء اللہ) خاص طور پر بزم پاکیزہ سجانے والی بہن کا تعارف کروایئے اور آخر میں ہماری بے حد پیاری استاد محترمہ سلمٰی غزل صاحبہ کی خدمت میں ڈھیروں دعائیں۔'' (دعاؤں کے لیے جزاک اللہ آپ بس رائٹرز کے انٹرویو پڑھیں کہانیاں پڑھیں اور تبصرے کریں تا کہ ہماری رہنمائی ہو سکے)

★ فہمیدہ جاوید، ملتان سے۔ ''سالِ نو کا سرورق بالکل پسند نہیں آیا۔ ماڈل کا بے باک سا انداز اور لگتا ہے کہ کسی انڈین رسالے کا سرورق ہے (اچھا بھئی کیوں لگا ایسا) اگلی بار سالِ نو کا سرورق سجا ہوا دینا۔ تمہارا اداریہ مجھے اور بیٹے جنید کو بڑا پسند ہے وجہ کہ تم خالص اردو میں گفتگو کرتی ہو اور بہت سے ایسے الفاظ ہمیں سیکھنے کو ملتے جو معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ (فہمیدہ بہن اردو کا رسالہ اردو زبان کی ہی نشر و اشاعت کرتا ہے) تم اداریہ اور محفل میں زیادہ بولا کروایسے مشکل اور خالص اردو کے انداز میں ہی کہ ہمیں فائدہ ہوتا ہے اس سے۔ اس بار افشاں جی کے ناول کی خصوصی تعریف کروں گی کہ جب دُرّی کو طاہرہ بیگم صبر و شکر پر سمجھاتی ہیں تو ہمیں بھی اس سے بہت ہی اچھا پیغام ملا۔ ناول میں دینی اور دنیاوی مواد دونوں ہیں افشاں کو خاص مبارک باد (جی بالکل) نایاب جی کے ہیرو احتشام کا اندازہ درست نکلا میرا کہ عمائم کو پسند کرتا ہے مگر منگنی عمائم کی ایمان سے ہو رہی ہے اور یہ ماہم کو کیا مسئلہ ہے عمائم سے خیر یہ قسط اچھی رہی۔ بوجھ...... شرجیل واقعی سچ ثابت کیا کہ تم فراڈ کر رہے تھے مگر آخر میں موت کے وقت اس کا اسلام قبول کرنا اچھا لگا اور ہیروئن کو اچھا ہم سفر مل گیا مگر کاش شرجیل ہی زندہ رہتا خیر اختتام ٹھیک تھا۔ میری ایک خوشی کی وجہ ہے میں اور فارہ کہ میری پسندیدہ رائٹر نگہت سیما کی تحریر تھی اور بہت ہی پیارا ناول تھا... بس نگہت کا نام ہی کافی ہے جبکہ دوسری خوشی شیریں حیدر کے قسط وار ناولٹ کی صورت میں پاکیزہ میں آمد اور شیریں کا روایتی مخصوص انداز آپ بیتی اسٹائل، شروع تو اچھا ہوا ہے ناولٹ دیکھتے ہیں کہ مایا کی زندگی میں مہتاب جی کیا رنگ لاتے ہیں۔ سعدیہ جی کا میں انمول کے اختتام سے مکمل متفق ہوں اور 100 پرسنٹ نمبر دوں گی۔ زبردست اور اصلاحی ناول رہا سعدیہ کو مبارک باد...... انمول کو عقل اینڈ میں آ گئی ورنہ تو انمول نے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کی پوری کوشش کی تھی۔ (یہی بات تو بتانا تھی) عورت کہانی بھی حسبِ معمول بہترین رہی عالیہ بھی اپنی ساس کی طرح ہی بن گئی۔ قرۃ العین کا افسانہ بہت پسند آیا اور پہلے نمبر پر تھا اگر

میری پسندیدگی دیکھی جائے ندا کا بڑی بہن ستارہ کو طنز کرنا اچھا نہ لگا کہ سگے رشتوں میں بھی ایسا اُف اللہ جبکہ دوسرے نمبر پر نمی کہ شکر ہے بہو کو عقل آخری پیراگراف میں آگئی اور تیسرے نمبر پر نیا سال دوستوں کے سنگ لگا مگر سالِ نو کی مناسبت سے اچھا تھا۔ واقعی ٹیچرز کو یاد رکھنا چاہیے۔ چوتھی خوشی سیمار رضا سے ملاقات کہ نزہت میں سوچ رہی تھی کہ سیما رضا کی ملاقات کا تم سے اصرار کروں گی مگر بغیر کہے ہی خواہش پوری ہوگئی اور ملاقات کو 10 میں سے 10 نمبر دے دوں کہ تمہارا جداگانہ انداز ہے جبکہ مجھے شائستہ کا سروے بالکل بھی پسند نہیں آیا کہ کورونا پر یہ اب تیسرا سروے تھا بس اب کورونا سے متعلق کچھ نہ ہی ہو ہمارے رسالوں میں اتنا ہی کافی ہے۔ (ارے بہن جب پوری دنیا میں یہی چل رہا ہے تو اسی مناسبت سے ہی دیا ہے کہ لوگوں نے کس طرح مثبت پہلو نکالے ہیں) بہنوں کی محفل میں پیاری نزہت شیخ تمہیں میری نگارشات پسند آئیں اور رائے دی سچ کہوں اتنی خوشی ہوئی واقعی ٹھیک کہا اگر ہم سب ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی اور مثبت تنقید کریں گے تو ہمارے قلمی ذوق میں اضافہ ہوگا۔ بزم پاکیزہ میں بہنوں نے بڑے لاجواب سوال کیے مگر تم نے بھی جوابات دے کر ثابت کردیا کہ نزہت بھی کسی سے کم نہیں...... (یہ سب ہمارے قارئین کی حوصلہ افزائی اور تعاون ہے) حسن نکھاریے میں اس بار ماہ جبیں نے ہاتھوں اور پاؤں کے لیے درست بتایا کہ واقعی صرف چہرے کی بیوٹی کافی نہیں۔ اختر شجاعت جتنی حسین ہیں اتنی ہی حسین و دلکش سطور لکھتی ہیں مضمون میں زہد، موضوع پر بھرپور معلومات ملیں۔ ہاں ریحانہ کے بیٹے کی شادی میں احوال سے زیادہ تصاویر اچھی لگیں۔ ماشاء اللہ سے ریحانہ تم بیٹے کی امی کم بہن زیادہ لگتی ہو اور ماشاء اللہ اسمارٹ ہو اور تمہاری تصاویر بھی بڑی پسند آئیں۔ افتخار شوق کی محفل کا احوال بھی دلچسپ تھا درست کہا افتخار کہ یہ محفلیں نوجوان نسل کے لیے بے شمار فائدے لیے ہوئے ہیں۔ ادارے والوں کا ہمارے لیے احساس ہی ہے اور یہ بھی ایک منفرد، احساس اور پیار و اپنا پن ہے کہ تم اور عذرا رسول اپنی ہر خوشی و غم میں چھوٹے بڑے معاملات میں ہم تمام قاری بہنوں کو شامل رکھتی ہو۔ اور JDP مبارک باد کا مستحق ہے کہ اس بار سسپنس ڈائجسٹ نے 150 روپے میں 362 صفحات دیے کہ یہ بہت بڑی کامیابی ہے جو قاری کو اتنا اچھا معیاری اور زیادہ مواد کم قیمت میں ملا کاش پاکیزہ کا سالگرہ نمبر بھی 150 کا ہو اور پیج 362 ہوں۔ (جی کوشش کریں گے) مجھے انتظار ہے۔ کب پاکیزہ میں کچھ اچھی تبدیلیاں ہوں گی۔'' (جی ضرور ہوں گی، یہ تنوع تو چلتا رہتا ہے، طویل تبصرے کا شکریہ)

✉ سلمٰی غزل، کراچی سے۔ ''شمع ہدایت ماشاء اللہ، اختر شجاعت کافی عرق ریزی سے لکھ رہی ہیں اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ہو سارے ہی افسانے لاجواب ہیں مگر بوجھ لکھ کر روحیلہ خان نے چھکا مار دیا۔ میں نے مزہ دوبالا کرنے کے لیے نومبر سے پڑھا اور دل خوش ہوگیا لاجواب، بے مثال...... قرۃ العین سکندر کا سالِ نو مبارک بھی خوب رہا۔ نمی، روبینہ یوسف کا بھی خوابوں کی دنیا میں لے گیا کاش حقیقت میں بھی ایسا ہی ہو کہ انسان کو اپنی غلطی نظر آجائے۔ شیریں حیدر بہت کہنہ مشق لکھاری ہیں مگر ناولٹ مکمل ہونے پر ایک ساتھ ہی پڑھوں گی تسلیم شیخ کا نیا سال دوستوں کے سنگ ٹھیک لگا۔ ریحانہ اعجاز کا لاک ڈاؤن کی شادی کا احوال اچھا رہا لیکن آپ یقین کریں میری دوست کے نواسے کی شادی جیسی شادی شاید ہی کسی کی ہوئی ہو۔ نکاح ہو چکا تھا تین بھائی ہیں مگر وہ اکیلا گیا اور ڈیفنس سے دلہن کو رخصت کرا کر لے آیا۔ یہ پچھلے سال اس وقت کی بات ہے جب بہت سخت لاک ڈاؤن تھا۔ سب بے حد خوش، ہلدی لگی نہ پھٹکری رنگ چوکھا آیا۔ دونوں پارٹیاں متمول مگر کوئی دھوم دھام نہیں۔ سیمار رضا ردا سے ملاقات بہت اچھی لگی ہرفن مولا، باہمت اور چاق و چوبند...... آپ کی بہنوں کی محفل کا تو جواب ہی نہیں سچ بتاؤں تو اختر کے مضمون کے بعد میں پہلے بہنوں کی محفل ہی پڑھتی ہوں اور سب کے تبصرے پڑھتی ہوں۔ ہاتھ میں درد ہونے لگا مشکل سے لکھ رہی ہوں کیونکہ سیدھے ہاتھ کی کلائی اور انگوٹھے کے اوپر کا حصہ ابھی تک سوجا ہوا ہے اس ڈینگی نے تو ساری توانائی چھین لی۔ دعاؤں میں یاد رکھیں کہ مجھے بہت ضرورت ہے۔'' (اللہ آپ کو مکمل صحت عطا کرے، پھر بھی تبصرہ لکھا بہت شکریہ......)

✉ مسرت عزت، شبقدر کے پی کے سے۔ ''نئے سال کا ہنستا، مسکراتا اور کھلکھلاتا پاکیزہ ملا جسے دیکھ کر ہمارا بھی دل ترو تازہ ہوگیا۔ اور اپنا خط دیکھ کر تو اور بھی خوشی ہوتی ہے۔ سب سے پہلے روحیلہ خان کا ناولٹ بوجھ پڑھا اور دل پر بہت بوجھ محسوس ہوا شرجیل بیچارے کے لیے دل بہت دکھی ہوا۔ قرۃ العین کو چاہیے تھا کہ وہ شرجیل کا ساتھ نہ چھوڑتی اس کو اپنے دین کی

طرف راغب کرتی، اس کو سمجھاتی، در گزر کر دیتی۔ خیر یہ تو اپنی، اپنی سوچ کی بات ہے۔ بہر حال روحیلہ خان نے بہت اچھا لکھا اور دل پر بہت اثر کر گیا۔ اس کے بعد میں انمول کا آخری حصہ پڑھا...... ویلڈن، بہت خوب صورت انداز میں سعدیہ رئیس نے اختتام کیا اور آخر میں یہ جملہ کہ انسان محبت کے بغیر تو جی لیتا ہے مگر عزت کے بغیر جیتے جی مر جاتا ہے۔ بہت خوب......انمول بہت اچھا فیصلہ کیا اس کو بالآخر عقل آ ہی گئی کاش ہر لڑکی اس انداز میں سوچے۔ نظمی، روبینہ یوسف کی تحریر دلچسپ تھی مگر پڑھتے وقت ہمیں بہت غصہ آیا اب ساس کو اتنا بھی کمزور نہیں ہونا چاہیے کہ بہو کی ہر اوٹ پٹانگ بات مان لے۔ وہ ہجر جو ہم کو لازم تھا...... شیریں حیدر صاحبہ نے اپنے مخصوص انداز میں بہت دلچسپ لکھا ہے فلم سے وابستہ لوگوں کے بارے میں تحریر زبردست ہے۔ ع عورت دل لحاظ، اچھی کہانی ہے مگر عالیہ بیگم کا ایک بات کو پوری زندگی دل کا روگ بنا لینا اچھا نہیں لگا۔ شادی شدہ عورت تو اپنی ازدواجی زندگی میں نہ جانے کتنی، کئی بار شوہر کے ایسے وار سہتی ہے اور بھلا دیتی ہے اور بھلا دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ میں اور فارہ، میں عشق ہوں...... سال نو مبارک، بہت دلچسپ اور اچھی تھیں۔ سیما رضا ردا صاحبہ کی خوب صورت باتیں اور ریحانہ اعجاز صاحبہ کے بیٹے کی شادی کا احوال پڑھ کر بہت اچھا لگا اور بہت مزہ بھی آیا۔ روحانی مشورے اور حسن نکھار بے بہت پسند آئے۔ شمع ہدایت، ابھی نہیں پڑھا سکون سے آرام اور اطمینان سے دل کی آنکھوں سے پڑھوں گی اور میری طرف سے آپ کو نیا سال بہت، بہت مبارک ہو...... آمین۔'' (بہت پیارے تبصرے کا شکریہ آپ اتنی دور سے محفل میں شرکت کرتی ہیں تو اچھا لگتا ہے، خوش رہیے)

ساجدہ ظفر، کمالیہ سے۔ ''مبارک ہو...... دعا ہے کہ نیا سال ہم سب کے لیے بلکہ پورے عالم اسلام کے لیے امن، خوشی اور کامیابیوں کی نوید لے کر آئے۔ اور کورونا جیسی موذی بیماری سے پورے عالم کو نجات عطا فرمائے، آمین۔ 5 دسمبر کو بیٹی کی رخصتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور آپ سب کی دعاؤں سے سارا فنکشن بخیر و خوبی انجام کو پہنچا۔ مگر مصروفیت اتنی رہی کہ سر کھجانے کی فرصت نہ تھی۔ شادی کے کاموں سے فراغت ملی تو بیماری نے آگھیرا۔ تھکاوٹ کی وجہ سے جسم میں درد اور سر میں درد شروع ہوا جو ابھی مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوا۔ بہر کیف دسمبر کا پاکیزہ 3 دسمبر کو مل گیا۔ مصروفیات کے باوجود ورق گردانی شروع کر دی اور بہنوں کی محفل کا صفحہ کھولا اور بہنوں کی سرگرمیوں میں بیٹی کی شادی کا ذکر سن کر اور پڑھ کر خوشی سے دل جھوم اٹھا بلکہ خوشیاں دوبالا ہو گئیں۔ آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے دعاؤں میں یاد رکھا۔ (جی بالکل ہم اپنی قاری بہنوں کی خوشیوں اور غم میں ان کے ساتھ ہیں) آصف الیاس کا انٹرویو متاثر کن تھا۔ میرے میاں ظفر صاحب بھی اسی ٹائپ کے ہر فن مولا شخص ہیں، سول انجینئرنگ بھی کی ہے، میڈیکل بھی یعنی اسسٹنٹ فارماسسٹ ہیں اور ایم اے بھی ڈبل ہے۔ انعامی مقابلوں سے بے شمار انعامات جیت چکے ہیں۔ پی ٹی وی لاہور...... کے کوئز پروگرام بزم طارق عزیز سے موٹر سائیکل...... اے سی اور ریفریجریٹر کے علاوہ کئی انعامات سوال و جواب کے ذریعے جیت چکے ہیں۔ اور کئی مقابلوں میں شیلڈ حاصل کر چکے ہیں۔ (بہت اچھے مبارکاں) اختر شجاعت صاحبہ نے اس بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات پر قلم آرائی کر کے میری دلی خواہش پوری کر دی ہے۔ میں عرصہ دراز سے آپ کے معجزات پڑھنے اور جاننے کی حسرت دل میں لیے بیٹھی تھی۔ (چلو اچھا ہوا ناں) بزم پاکیزہ میں سوالات جاندار اور جوابات شاندار تھے۔ میں اکثر گنگناتی ہوں، میں اشعار کا انتخاب لاجواب تھا اور پاکیزہ ڈائری میں قارئین کرام کی تحریریں بھی عمدہ تھیں مگر نئے سال کے حوالے سے اشعار اور تحریریں پڑھنے کو نہیں ملے۔ شاید آئندہ ماہ مل سکیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ موقع محل کے لحاظ سے مناسبت رکھنے والی تحریریں زیادہ شائع کیا کریں۔'' (کوشش تو یہی ہوتی ہے، سب بہنیں تاخیر سے بھیجتی ہیں، ہم نے یہ کہہ رکھا ہے کہ وقت سے پہلے بھیجا کریں...... تبصرے کا شکریہ)

پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ''اس بار نئے سال کا پاکیزہ سال نو نمبر 4 تاریخ کو ملا اور 7 تاریخ کو تبصرہ ارسال کر رہی ہوں۔ سدرہ عثمان سرورق پر بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔ باجی آپ نے اداریے میں درست ہی فرمایا ہے۔ اللہ کی قدرت کے آگے تو انسان ہمیشہ سے ہی بے بس ہے۔ ہم سب کے لیے خوشگوار امیدیں نیک خواہشات و تمنائیں اور پُر خلوص دعائیں حاضر ہیں۔ بہت، بہت بے حد شکریہ۔ ہم سب کی طرف سے بھی آپ کو یہی دعائیں دی جاتی ہیں قبول فرمائیں۔ دین کی باتیں پڑھ کر روح کو سرشار کیا۔ (جزاک اللہ) نامور مصنفہ، شاعرہ ایڈووکیٹ اور سماجی کارکن سعدیہ ہما شیخ

کو نامور ڈراما نگار خلیل الرحمٰن قمر کے ہاتھوں بک ایوارڈ وصول کرنے پر دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں...... ریحانہ اعجاز نے لاک ڈاؤن اور لاڈلے کی شادی مضمون میں اپنے لاڈلے بیٹے اسامہ اعجاز کی شادی کا احوال مع تصاویر کے پیش کیا۔ ویسے دلہن واقعی پیاری تلاش کی ہے آپ نے اللہ جوڑی سلامت رکھے، آمین۔ نزہت باجی، اس بار آپ نے وہ آئے بزم میں کے سلسلے میں سینئر پروڈیوسر صدا کار کمپیئر شاعرہ اور پاکیزہ کی ہمیشہ سے خیر خواہ سیمار ضاردا کو لائیں آپ کو مبارک باد پیش کرتے ہیں 2020ء میں کورونا کے باعث تغیرات کے اثرات اور سالِ نو سے خدشات اور توقعات کے بارے میں خوب سروے کیا۔ ہماری دعا ہے کہ ادارے سے وابستہ ہومیوڈاکٹر نعیم اختر کی والدہ ماجدہ، اختر شجاعت کی خالہ جان کو جنت میں جگہ ملے اور آپی فریدہ جاوید فری، سلمٰی غزل، امینہ عندلیب کو اللہ تعالیٰ مکمل صحت دے، آمین۔ آپی عذرا رسول نے ہم تمام بہنوں کو سالِ نو پر بہت ساری دعاؤں سے نوازا ہماری بھی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی مکمل صحت مند رکھے اور ہمیشہ سے خوشیوں سے نوازے، آمین۔'' (بہت شکریہ تبصرے کا، یہ رائٹر بہنوں سے آپ کی دوستی نہیں ہے کیا؟)

✿ شمیم فضل خالق، پشاور سے۔'' امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔ (الحمدللہ) شیریں حیدر میری پسندیدہ مصنفہ ہے سو اس کی تحریر میں نے پہلے پڑھی اور حسبِ معمول اچھی پائی۔ صحیح طرح کا اگلی قسط میں پتا چلے گا (جی ہاں) قسط وار ناول مجھے بہت پسند ہیں لیکن ان دونوں کی کچھ اقساط مجھ سے مس ہوگئیں۔ اس لیے پڑھنا چھوڑ دیا۔ اچھی تو یقیناً ہوں گی نگہت سیما بھی میری پسندیدہ رائٹر ہے لیکن ابھی تک ان کی تحریر نہیں پڑھی سو کوئی تبصرہ نہیں کر سکتی۔ عذرا رسول کو سلام کہہ دیں......'' (اب سب تحریریں ضرور پڑھیے گا اور خط اور ناول بھی اب اختتامی سفر پر ہیں)

✿ مسز خالدہ اعجاز، اوکاڑہ سے۔'' خلوصِ بیکراں، آپ کو اور پاکیزہ سے وابستہ تمام لوگوں کو نیا سال مبارک ہو (جی آپ کو بھی مبارک ہو) ہمیشہ کی طرح پاکیزہ ملتے ہی یوں دل میں سکون سا اتر آتا ہے جیسے کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا ہو...... جب فرصت ملتی ہے تو اسے پڑھ کر بہت اچھا لگتا ہے۔ ہر سلسلہ ہی اچھا لگتا ہے گو کئی بہنوں کی تحریریں اتنی پختگی لیے نہیں ہوتیں لیکن ان کی کاوش اچھی لگتی ہے۔ (کوشش کر کے ہی اچھی چیز وجود میں آتی ہے) میرا خیال ہے بچیوں کو یہ جریدہ ضرور پڑھنا چاہیے میں نے اس سے زندگی کے بہت سے اصول اپنائے ہیں۔ وظائف، دعائیں، دوائیں اور بھی جو ثبت لگا آزما کر دیکھا شکر ہے کامیابی ہی ملی۔ اس لیے میں تو اسے زندگی کا حصہ سمجھتی ہوں، میں لکھنے کی چور ہوں لیکن میری دعائیں ہمیشہ پاکیزہ کے قارئین کے ساتھ رہتی ہیں میں روحانی طور پر تمام پاکیزہ سے وابستہ لوگوں کے دکھ سکھ کو شدت سے محسوس کرتی ہوں اللہ تعالیٰ عذرا رسول صاحبہ اور تمام ان کے ساتھیوں کو اپنے امن و امان میں رکھے، آمین۔'' (عزیزم بہت نوازش، ہماری بہت سی قاری بہنیں صرف پڑھتی ہیں خط نہیں لکھتیں مگر ان کا یہ پڑھنا ہی ہمیں توانائی بخشتا ہے۔ کوشش کرتے ہیں بہتر سے بہترین متن دیا جائے)

✿ مسکان نور، لاڑکانہ سے۔'' جنوری کا پاکیزہ تین تاریخ کو ملا...... نومبر، دسمبر، جنوری یہ تینوں ڈائجسٹ لیے لیکن میرا خط نہیں تھا۔ آپ سمجھ سکتی ہیں کہ میرے دل پر کیا گزر رہی ہوگی ... پلیز یہ ضرور بتائیے گا کہ میری تین کہانیاں آپ کو ملی یا نہیں...... (ملی تو ضرور ہیں مگر ابھی آپ مطالعہ کریں مزید سیکھیں) سلسلے وار ناول ہو یا پھر ناولٹ یا افسانہ ہر ماہ زبردست ہوتے ہیں، سب سے پہلے جس کہانی کی تعریف کروں گی وہ ہے بوجھ اس کی تینوں قسطیں لاجواب رہیں۔ میرا سارا زنگ اتار دو، اس کی اور بھی زیادہ قسطیں ابھی موجود ہیں، یہ پڑھ کر دل خوشی سے بھر گیا۔ میں اور فارہ شروعات سے لے کر اینڈ تک کہانی دلچسپ تھی۔ نیا سال دوستوں کے سنگ...... بہت پسند آئی۔ شمع ہدایت، ہر بار کی طرح پسند آیا۔ پاکیزہ ڈائری، میں مسز خالدہ اعجاز آپی کی غزل پسند آئی۔ بہنوں کی محفل میں اس بار ثمینہ کوکب آپی نہیں تھیں اور سنبل ملک اعوان، پیاری سی لڑکی تم کہاں ہو خط کیوں نہیں لکھ رہیں۔ جلدی سے واپس آ جاؤ...... (ہاں سنبل ملک کافی عرصے سے غائب ہیں) سیمار ضاردا کے انٹرویو میں آپ سب کی تصویریں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی تھی اور آپی پاکیزہ میں نئی تبدیلی کریں گے یہ بات خوشی دے گئی تھی۔ پلیز کوئی ایسا نیا سلسلہ شروع کریں جس میں ہم سب قارئین بہنیں ایک دوسرے سے دوستی کر سکیں۔'' (پیاری بیٹی آپ سب آپس میں دوست ہی تو ہیں یہی محفل ایک بیٹھک ہے۔ دوسرے کی غیر حاضری فوراً محسوس کر لیتے ہیں۔ جی نئی تبدیلیاں آپ کے ہی مشوروں سے ہوں گی ان شاء اللہ)

✿ تسلیم شیخ، ساہیوال سے۔'' سالِ نو کے شمارے کا سرورق بہت پیارا، ہنستا مسکراتا چہرہ مجھے کچھ کہتا ہے، میں

نزہت آپا کی نئے سال کی تمنائیں اور دعاؤں کا شکریہ۔ 2020ء بڑا ہی کٹھن گزرا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا یہ نیا سال 2021ء خوشیوں بھرا کر دے، آمین ثم آمین...... نگہت سیما کا مکمل ناول، میں اور فارہ بہت دلچسپ تھا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ جنہیں ہم سے زیادہ پیار ملے۔ ہم ان سے جلن محسوس کرنے لگتے ہیں۔ روحیلہ خان کا ناولٹ بوجھ کا آخری حصہ اچھا رہا۔ آخر تک جب سب ہنسی خوشی رہنے لگ جائیں تو کتنا سکون ہو جاتا ہے۔ شرجیل احمد نے اپنا کیا پایا لیکن اس کے مرنے کا دکھ ہوا۔ سعدیہ رئیس کا منی ناول، میں انمول کا آخری حصہ بھی اچھا رہا۔ قرۃ العین سکندر کا افسانہ سالِ نو مبارک...... بہت پسند آیا۔ جس لڑکی کے ساتھ دھوکا ہو کوئی اسے اپنانے کے بعد چھوڑ جائے تو اس کا دکھ اندر ہی اندر نگل جاتا ہے اور پھر اگر اپنے ہی طنز کے نشتر چلانے لگ جائیں تو دکھ ناسور بن جاتا ہے۔ بہن کو تو ایسے حالات میں ساتھ دینا چاہیے۔ نا کہ اپنا آپ دکھانا چاہیے۔ روبینہ یوسف کا افسانہ نکمی بھی پسند آیا۔ ہمارے گھر کے بوڑھوں کو ویلا کہتے ہیں۔ مگر یہ نہیں سوچتی بہویں کہ ان کے گھر کی رکھوالی کے چوکیدار یہی بوڑھے لوگ ہی تو ہیں۔ (ٹھیک کہہ رہی ہیں) میں اپنے افسانے کی کیا تعریف کروں۔ ہی ہی ہی وہ تو قارئین پڑھ کر بتائیں کہ انہیں تسلیم شیخ کا لکھا کیسا لگا۔ (اب تو پڑھ لیا ہوگا ناں) سلسلے وار ناول میں میرا اسرار زنگ اتار دو اور میں عشق ہوں، دونوں ہی اچھے چل رہے۔ روز بروز سسپنس بڑھتا جا رہا ہے۔ فرحین اظفر کی عورت کہانی بہت اچھی رہی۔ عورت جس شخص کی خاطر اپنا ہر رشتہ چھوڑ کر جاتی ہے وہی اگر سب کے سامنے رسوا کر دے۔ آپ کی ذات کو ایویں ہی کسی خاطر میں نہ لائے۔ اور پیروں تلے روند دے۔ تو ایسی عورت زندہ لاش بن جاتی ہے۔ ماں، باپ کا بھرم مرد کو رکھنا چاہیے۔ مگر اپنی شریکِ حیات کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ (بالکل) خصوصی مضامین اچھے اور مزے والے رہے۔ اچھی باتیں سیکھنے کو ملی۔ شائستہ زریں کا سروے ہمیشہ کی طرح بہت زبردست رہا۔ بہنوں کی محفل میں سبھی کو پیار...... پاکیزہ ڈائری، میں اکثر گنگناتی ہوں، خوش ذائقہ، بزم پاکیزہ، روحانی مشورے، حسن نکھاریے۔ سبھی سلسلے سے ایک سے بڑھ کر ایک...... آخر میں یہ کہوں گی کہ جس طرح نزہت آپا اور پاکیزہ کی باقی ٹیم...... پاکیزہ کو سنوار رہا اور نکھار رہے ہیں، وہ قابل تعریف ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کی محنتوں کا بے شمار اجر دے۔ اور پاکیزہ کو ترقی میں اضافہ کرے، آمین ثم آمین۔'' (بہت شکریہ تبصرے اور دعاؤں کا تمام رائٹرز اور قاری بہنیں اس کامیابی میں برابر کی حق دار ہیں)

کھ زرتاشیہ نعمان، ملتان سے۔ ''اس بار میری لکھی ہوئی نظم'' پیارے ابو کی یاد میں'' اور اظہار عقیدت شمارے میں شامل تھیں جس کے لیے ڈھیر سارا جزاک اللہ خیر...... میں اور فارہ دو کزنز کی معصوم سی کہانی نگہت سیما نے خوب لکھی۔ وہ ہجر جو ہم کو لازم تھا۔ کیا بات ہے جناب۔ شیریں حیدر صاحبہ کے منجھے ہوئے قلم سے کوئی تحریر نکلے اور دل کو نہ چھوئے یہ تو ہو نہیں سکتا...... اگلی قسط کا بے صبری سے انتظار ہے۔ بوجھ، اختتام پزیر ہوا آخر کار ولیم مسیح کے اندر چھڑی حق و باطل کی جنگ میں حق غالب آ گیا۔ قرۃ العین نے اپنے رب کی رضا کی خاطر اسے چھوڑا اور بدلے میں اس سے بہترین شریکِ سفر پالیا۔ سعدیہ رئیس کی میں انمول ایک جامع اور ٹھوس پیغام دے کر اپنے اختتام کو پہنچی۔ ویسے کوئی بھلا مانس شخص تھا انمول بی بی کا خاوند کہ اتنا عرصہ اس کے بلاوجہ کے نخرے برداشت کیے۔ فرحین اظفر، عورت کہانی میں لحاظ کا نکتہ لائیں...... ہاں یہ سچ ہے کہ بعض دفعہ بیوی کے حق، سچ پر ہونے کے باوجود...... شوہر اپنے والدین کا لحاظ اور مان رکھتے ہوئے بیوی کی طرفداری میں آنا فانا کر جاتے ہیں۔ ویسے فرحین ایک بات تو بتائیں ہر مہینے ایک نیا ٹاپک ہوتا ہے۔ عورت کہانی میں آپ اس سلسلے کے آئیڈیاز اردگرد سے بھی لیتی ہیں؟ یا پھر یہ سب آپ کی اپنی ذہنی اختراع ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو سبحان اللہ۔ (جی فرحین جواب ضرور دیں، ویسے اردگرد کا مشاہدہ ہی تو ہوتا ہے) افسانوں میں روبینہ یوسف کی نکمی عمدہ تحریر تھی۔ وہ آئے بزم میں، اتنی سادہ نامور اور منجھی ہوئی رائٹر سے ملاقات کی...... یقین جانیں مزہ آ گیا۔ یہی لوگ ہم جیسے نو آموز لکھاریوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ (بے شک) نزہت آپی، سیما جی کا نیا ناول عشق ابن السبیل مارکیٹ میں کب تک آئے گا؟ (جی مارکیٹ میں آچکا ہے) بہنوں کی محفل میں سب بہنوں کے خط پڑھے گویا سب سے آدھی ملاقات کی۔'' (ہاں یہ محفل اسی لیے سجائی جاتی ہے۔ تبصرے کا شکریہ اور سلسلوں کو بھی سراہنے کے لیے جزاک اللہ) میں فہمیدہ جاوید، امینہ مشیر، نزمین اعجاز کے اشعار پسند آئے۔ باکس رائٹنگ کی بھی تمام نظمیں اچھی تھیں۔ اب میں اپنے موسٹ فیورٹ سلسلے وار ناول میں عشق ہوں، کے سسپنس کے غبارے میں سوئی چبھونا

چاہوں گی کہ عمائم...... نانی یعنی طاہرہ کی نواسی...... اموبعنی طابہ کی اکلوتی نند عمامہ کی بیٹی ہے اور عمامہ نے کسے قتل کیا تھا؟ وہ تنی...... طاہر یا فیقہ میں سے کوئی ہوگا...... یہ تو تھے میرے انداز ے...... اصل حقیقت تو نایاب جی کو ہی پتا ہو گی......'' (ارے بھئی خوب انداز ے کیے چلو دیکھتے ہیں آگے کیا ہوگا)

حدیث اختر، بہاول پور سے۔ ''اس دفعہ میں انمول ختم ہوا تھوڑی کمی تو لگی اینڈ میں لیکن رائٹر اپنے لحاظ سے لکھتی ہیں جو انہیں مناسب لگا کر دیا۔ رسالہ جتنا پڑھا کافی اچھا ہے۔ دین کی باتیں اور آپ کا کہنا سنا۔ وہ آئے بزم میں سیمار ضا ردا سے ملاقات بہت اچھی لگی۔ افتخار شوق نے بھی تقریب کا احوال اچھا لکھا تھا۔ آہستہ، آہستہ رسالہ پڑھ رہی ہوں۔ سردی کافی ہے اور پھر اب چھپن، ستاون سال کی عمر میں سردی لگتی بھی زیادہ ہے۔ کیا خیال ہے؟ ریحانہ اعجاز کے بیٹے کی شادی کا احوال بھی زبردست تھا۔ باقی رسالے کا پڑھنا ابھی باقی ہے۔ جیسے آپ اسے سنوار رہی ہیں اللہ آپ کو مزید توفیق عنایت فرمائے۔ بچے لا کر دے دیتے ہیں اللہ سلامت رکھے۔'' (ارے پنجاب کی سردی کا تو ہمیں بھی معلوم ہے۔ بس وہاں ویسے ہی انتظام ہوتے ہیں۔ اس دفعہ کراچی اور گردونواح بھی سائبرین ہواؤں کی زد میں رہا کئی سال کے گرم کپڑے خوب استعمال ہوئے۔ یہی تو اللہ کے بنائے گئے موسموں کی خوبی ہے۔ یہ تو بلاشبہ نعمتِ خداوندی ہے ورنہ انسان تو ناشکرا ہے جلد اکتا جاتا ہے۔)

☆☆☆

اب محفل کا سفر فی الحال روکتے ہیں، آئندہ ماہ آپ کے تجزیاتی تبصروں، تعریف و تنقید کو پھر قلم زد کریں گے، کئی تبدیلیاں بھی رفتہ رفتہ ماہنامے میں لاتے رہیں گے۔ ایک مرتبہ پھر گزارش ہے کہ ہر تحریر کے لیے الگ صفحہ استعمال کریں۔ چاہے ایک صفحے کے چار ٹکڑے کرلیں مگر الگ ہوں۔ نیچے لکھی گزارشات کو سرسری نہیں بلکہ بغور پڑھیں تاکہ ڈاک بھیجنے میں آسانی ہو۔

آپ سب کے لیے پُرخلوص دعائیں حاضر ہیں...... اللہ پاک ہم پر، ہمارے شہریوں پر، ہمارے ملک پر اپنا فضل و کرم جاری و ساری رکھے۔ الٰہی آمین۔

خیر اندیش، نزہت اصغر

چند گزارشات عرض ہیں

1۔ تمام لکھنے والوں اور تبصرہ کرنے والوں کے لیے لازمی ہے کہ صاف اور واضح لکھائی میں لکھیں۔ 2۔ اپنا نام و پتا رابطہ نمبر ضرور لکھیں۔ 3۔ خط کتابت کے لیے دو پتے دیے جاتے ہیں ایک دفتر کی بلڈنگ کا ایڈریس دوسرا پوسٹ بکس نمبر...... یہ آپ سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ پوسٹ بکس نمبر پر رجسٹرڈ پوسٹ نہیں جاتی یہ آپ کے علاقے کے ڈاک خانے کے عملے کو معلوم ہے اور انہیں آپ کو ضرور آگاہ کرنا چاہیے۔ 4۔ کوریئر یا رجسٹری کرنا ہو تو دفتر کا پتا لکھا کریں تاکہ ڈاک بہ آسانی پہنچ جائے ورنہ پوسٹ بکس سے پہنچ تو جاتی ہے مگر بہت دن لگ جاتے ہیں اس لیے خوب دیکھ بھال کر سوچ سمجھ کر ڈاک روانہ کیا کریں۔ عام ڈاک تو پوسٹ بکس پر پہنچ جاتی ہے مگر رجسٹری نہیں رسید کو اپنے پاس سنبھال کر رکھیں تاکہ بوقتِ ضرورت کام آسکے۔ 5۔ اپنی نگارشات بھیجنے کے ہفتہ دس دن بعد درج ذیل نمبروں پر رابطہ کر کے معلوم کیا جاسکتا ہے۔

ڈائریکٹ نمبر 02135386783 صبح 10 بجے سے شام 5 بجے۔ 02135802552 Ext -110 صبح 10 سے شام 5 بجے۔ 02135895313 Ext -110

موبائل نمبر۔ 03316266612 صبح 11 بجے سے شام 4 بجے فون کریں میسج کسی بھی وقت send کرسکتی ہیں۔

جوابی ٹیکسٹ کا انتظار کریں۔ جواب ضرور دیا جاتا ہے اگرچہ کچھ دیر سے ہی سہی۔ امید ہے ہماری پیاری اور بے حد سمجھدار بہنیں ان وضاحتوں کو خوب اچھی طرح سمجھ گئی ہوں گی۔ اب دفتر کا پتا بھی نوٹ فرمالیں محفل کے آغاز میں پی او باکس اور ای میل ایڈریس واضح لکھ دیا گیا ہے۔

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500
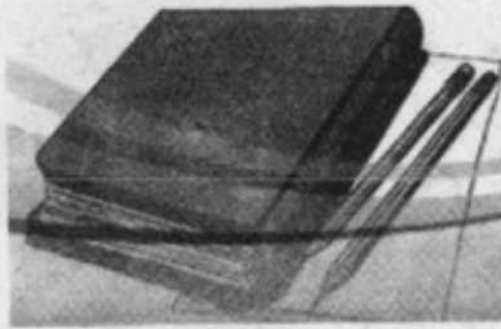
حمد باری تعالیٰ

ایسا کیا کام کروں مجھ سے خدا ہو راضی
اس کے محبوب کو چاہوں تو کوئی بات بنے
وہ میرے دل میں ہیں آباد کوئی کیا جانے
ان کو پلکوں میں چھپالوں تو کوئی بات بنے
نور لکھوں گی پڑھوں اور بسالوں دل میں
نور سے روح کو روشن کروں پھر بات بنے
نور ہی نور نظر آتا ہے ہر سو یارب
نور کو دل میں بسالوں تو کوئی بات بنے
تیرے قرآن کا ہر حرف ہے نوری یارب
صبح شام اس کو پڑھوں پھر تو کوئی بات بنے
عشق خالص ہے میرا تو نے ہی بخشا ہے مجھے
عشق میں نور چھپا لوں تو کوئی بات بنے
کر خطا معاف مری میں ہوں خطاوار بہت
مغفرت ہو تیری رحمت سے تو کچھ بات بنے
خوف آتا ہے تیرے سامنے جانے سے مجھے
پردہ عیبوں پہ جو پڑ جائے تو کچھ بات بنے

کلام: ذکیہ بلگرامی

نعت رسول مقبولؐ

دل میں دردِ شہ کونین کی دولت ہے بڑی
ہوں تو نادار میں لیکن مری قیمت ہے بڑی
حشر میں گرمیِ خورشید قیامت ہے بڑی
لیکن اس سے مرے سرکار کی رحمت ہے بڑی
یوں مصور نے بنائی تری تصویرِ جمال
آج تک آئینہ خلق کو حیرت ہے بڑی
کملی والے سرِ محشر مرا پردہ رکھ لے
آج کے دن ترے مجرم کو ندامت ہے بڑی
دینے والے ترے ہاتھوں میں تو سب کچھ ہے مگر
خاک طیبہ مجھے دے دے کہ یہ نعمت ہے بڑی
اس بڑائی پہ منور ہے مجھے ناز بڑا
میں بڑے در کا گدا ہوں مری قسمت ہے بڑی

کلام: منور بدایونی

پسند: عرشیہ جنید، کراچی

خیر ہی خیر

انسان کی ساری زندگی دو حالتوں میں بسر ہوتی ہے۔ سکون اور راحت میں یا تکلیف اور پریشانی میں......

یہ دونوں حالتیں انسان کے لیے خیر ہی خیر لاتی ہیں اگر وہ انہیں اللہ کی رضا کے حصول کے لیے...... اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق گزار لے۔

اور وہ طریقہ یہ ہے کہ آرام و راحت میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے اور تکلیف اور پریشانی میں صبر کیا جائے اور اللہ سے مدد طلب کی جائے۔ اس بارے میں ایک بہت ہی خوب صورت حدیث مبارکہ ہے۔

''مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے، اسے تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے اور خوشی ملتی ہے تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ دونوں ہی حالتیں اس کے لیے خیر ہیں۔

(صحیح مسلم...... ۲۹۹۹)

از: عائشہ خان، لاہور

نذرانۂ عقیدت

یا نبیؐ پھر مدینے بلا لیجیے
مجھ سی عاصی کو روضہ دکھا دیجیے
غموں کا ہے ڈیرا ہے طوفان نے گھیرا
اپنے دامن کی ٹھنڈی ہوا دیجیے
میرے آقاؐ مدینے جو اِک بار آؤں
میں واپس نہ جاؤں دعا دیجیے

یہی ہے تمنا کہ رحمت عطا ہو
درِ مصطفیٰؐ سے سدا دیجیے
ہو کوکب فدا جان نام نبی پر
یوں حق امتی کا ادا کیجیے

از: ثمینہ کوکب...... جہلم

فرمان بزرگان دین

ا۔ فخر اور تکبر کرنے والا عمل گناہ ہے اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا باعث بنتا ہے۔ اس سے بچو۔ (حضرت خواجہ سفیان ثوریؒ)

۲۔ کمینے کی علامت یہ ہے جب صاحبِ منزلت ہوتا ہے تو خویش واقارب سے بدسلوکی اور تکبر سے نہیں آتا ہے۔ ملنے والوں سے بیگانہ بن جاتا ہے۔ (امام شافعیؒ)

۳۔ تم ہر انسان کے ساتھ نیکی کرو خواہ تمہارے ساتھ کوئی نیکی نہ کرے۔ (حضرت امام ابوحنیفہؒ)

۴۔ دنیا میں عزت تین چیزوں میں ہے۔

ا۔ کسی سے حاجت نہ چاہو۔

۲۔ کسی کو برا مت کہو۔

۳۔ کسی کے مہمان کے ساتھ مت جاؤ۔ (خواجہ بشر حافیؒ)

۵۔ ہر ضرورت کے وقت کارسازِ حقیقی کی جانب متوجہ ہونے سے وہ ضرورت بلا کسی تکلیف اور پس وپیش کے پوری ہو جاتی ہے۔ (خواجہ عبداللہ بن مبارکؒ)

مرسلہ نگار: زرینہ خانم لغاری، مظفر گڑھ

خاموشی

☆ جب دوسرے حسن کلام پر ناز کریں، تو تم حسنِ سکوت پر فخر کرو۔ (لقمان)

☆ بعض مرتبہ خاموشی میں الفاظ سے زیادہ طاقت اور فصاحت ہوتی ہے۔ (کارلائل)

☆ یہ بڑی بدنصیبی کی بات ہے کہ ہم میں نہ اتنی عقل ہے کہ ہم کوئی اچھی بات کہہ سکیں اور نہ اتنا صبر کہ کسی اچھی بات کو غور وانہماک سے سن سکیں۔ (کارلائل)

☆ خاموشی! یہ ناقابلِ برداشت ظرافت ہے۔

تلخ حقیقت

پاکستان زبان کے معاملے میں نہایت خوش قسمت واقع ہوا ہے کہ یہاں کی بہت پیاری مقامی بولیوں کے دوش بدوش جن کے دامن میں بڑا وقیع ادب بھی ہے، ایک ایسی بولی بھی عملی طور پر رائج اور مقبول ہے جو کسی ایک علاقے سے تعلق نہیں رکھتی کہ اس کا عمومی نفاذ موجب شکایت وتعرض ہوتا اور مقامی زبانوں کی ہم رشتہ اور ان سے بہت قریب بھی ہے۔ اکثر لغات ومحاورات اور امثال مشترک یا مماثل ہیں۔ آئندہ یہ اشتراک اور بڑھے گا۔ جملے کی ترکیب سب زبانوں میں ایک طرح کی ہے کہ لفظ کی جگہ لفظ رکھ دیجیے انگریزی کی طرح مبتدا اور خبر جگہ سے بے جگہ نہیں ہونے پاتے اور ترکیب الٹنے نہیں پاتی۔ اردو ہی اتنی مدت سے رابطے کا کام انجام دے رہی ہے۔ اس کا یہ منصب انگریزی کبھی اختیار نہیں کر سکے گی۔ گاؤں، گاؤں انگلش اسکول نہیں کھولے جا سکیں گے۔ انگریزی کو دوامی طور پر نافذ رکھنے کا خواب وہی لوگ دیکھ سکتے ہیں جو ملکی آبادی کو دائما ناخواندہ رکھنا چاہتے ہوں۔ انہوں نے اپنی عاقبت نااندیشی یا زعم اور صاحبیت کی بنا پر اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم سے بے بہرہ رکھا اور اب ان کے مستقبل کی خاطر ساری قوم کو پسماندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں آڑ مقامی لوگوں کو بنایا جاتا ہے۔ جنہوں نے اردو کو اتنی اچھی طرح اپنا لیا ہے کہ اہلِ زبان ان پر رشک کریں۔

از: شان الحق حقی، انتخاب، فضہ زیدی، بہارہ کہو

غزل

نہ کوئی خواہش رکھ نہ کوئی خواب دیکھ
ہوجائے گا تو خوش یہ آزما کے دیکھ
دل روئے گا جب ٹوٹے گا خواب
بہتر ہے تو نہ ہی کوئی خواب دیکھ
ہزاروں غم ہیں ہزاروں دکھ ہیں
کسی بھی دکھ کو نہ یاد کر کے دیکھ
ہوجائے گی آسان زندگی مسکان
بس غمِ دنیا نظر انداز کر کے دیکھ

کاوش: مسکان نور، لاڑکانہ

اپنے پرائے

ہم انہیں کیا بتاتے کہ ایمان کی کمی نے ہمیں کہاں

سے کہاں پہنچا دیا؟ ہم انہیں سمجھا نہیں سکتے تھے کہ گھر کی بنیاد ہلانے والے گھر کے فرد نہیں ہوتے۔ گھر کے سارے فرد ازل سے لڑتے جھگڑتے آئے ہیں لیکن وہ جدا نہیں ہوتے لیکن جب کوئی باہر کا چاہنے والا سیندھ لگا کر آجاتا ہے تو پھر گھر کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔

گھر ہمیشہ مہربانیوں سے لٹتے ہیں، نئی محبتوں سے اجڑتے ہیں۔ ایسی مہربانیاں جو گھر کی سالمیت کو دیمک بن کر چاٹ جاتی ہیں۔ ایسی مہربانیاں جو ماں سے زیادہ چاہ کر کے کی جاتی ہیں۔ جب کوئی چاہنے والا گھر کے ایک فرد کی انا کو جگا کر اسے وہ سارے مظالم سمجھاتا ہے جو گھر کے دوسرے فرد اس پر کرتے رہتے ہیں۔ وہ ان ساری لڑائیوں کے ڈھکے چھپے معنی واضح کر دیتا ہے تو گھر کی پہلی اینٹ گرتی ہے۔ گھر کی ایک، ایک اینٹ محبت سے اکھاڑی جاتی ہے۔ ہر چوگاٹ ہر دہلیز چوم، چوم کر توڑی جاتی ہے۔

جب باہر کا چاہنے والا لفظوں میں شیرینی گھول کر گھر والوں کے خلاف بہکاتا ہے تو پھر کوئی سالمیت باقی نہیں رہتی کیونکہ ہر انسان کمزور لمحوں میں خود ترسی کا شکار رہتا ہے۔ وہ اس بات کی تصدیق میں لگا رہتا ہے کہ اس پر مظالم ہوئے ہیں اور اسی لیے وہ مظالم کرنے میں حق بجانب ہے۔

ہم اپنوں کو نہ سمجھا سکے تو ان کو کیا بتاتے کہ ہمارے گھر کی اساس غلط نہ تھی، چاہنے والے غلط نہ تھے۔ یہ پرانی محبت میں پرانے پن کی وجہ سے جو غلطیاں، کوتاہیاں موجود ہوتی ہیں ان کو اجاگر کرنے والے بہت ذہین تھے......!

ہندوستان کی نئی چاہت کے سامنے بنگلا دیش ہماری بات کیا سنتا؟

اقتباس از: ''امر بیل، بانو قدسیہ''
انتخاب: میمونہ عزیز، کراچی

محبت

محبت جیت ہوتی ہے
مگر یہ ہار جاتی ہے
کبھی دل سوز لمحوں سے
کبھی بے کار رسموں سے
کبھی تقدیر والوں سے
کبھی مجبور کاموں سے
مگر یہ ہار جاتی ہے
کبھی یہ پھول جیسی ہے
کبھی یہ دھول جیسی ہے
کبھی یہ چاند جیسی ہے
کبھی یہ دھوپ جیسی ہے
کبھی مسرور کرتی ہے
کبھی یہ روگ دیتی ہے
کسی کا چین بنتی ہے
کسی کو رول دیتی ہے
کبھی لے پار جاتی ہے
کبھی یہ مار جاتی ہے
محبت جیت ہوتی ہے
مگر یہ ہار جاتی ہے

انتخاب: جویریہ کنول، کراچی

کچھ کھٹی میٹھی ہماری بھی

سردیوں کے کپڑے نکالے تو دل میں غریبوں کے لیے ٹھاٹھیں مارتا سمندر سات فٹ کی بلندی تک جانے لگا۔ آخر کو ہمارے مال میں غریبوں کا بھی حق ہے۔ بہت سے کپڑے ایسے تھے جو میں دس سال سے پہن رہی تھی بلکہ کئی شالیں تو ہر سردی میں جیسے ہینگ کرتی ویسے ہی موسم گرما کی آمد پر واپس اسٹور میں رکھ دیتی۔ سویٹروں کا بھی یہی حال شارٹ سے لانگ، لانگ سے شارٹ کا فیشن آتا جاتا رہتا۔ اب اتنے قیمتی سویٹر تو غریبوں کو...... میرا مطلب ہے نکالے تو غریبوں کو دینے کے لیے ہی ہیں دل تو میرا چاہتا ہے غریبوں کی ہمدردی میں بڑا دل دھڑکتا ہے جیسے دن دیہاڑے ڈاکو کنڈا کھڑکاتا ہے مگر اب تو تہیہ کر لیا کہ ان سردیوں میں ضرور یہ دس سالہ پرانے نئے نکور حالت کے گرما گرم سویٹر، شالیں، کپڑے پیور وول کی قمیص (جسے ہاتھ میں پکڑو تو ایسے لگے جیسے ریشم پکڑا ہو۔) غریبوں کو دے دوں آخر کو وہی اب حقدار ہیں۔ اپنے پشمینہ کی فیروزی کڑھائی والی کالی شال...... یہ تو مجھے بہت سوٹ کرتی ہے، اچھا ایسا کرتی ہوں

یہ رکھ لیتی ہوں، ہاں یہ پیور وول کا اسکن سویٹر شاکنگ پنک ڈوری ورک والا یہ نکال دیتی ہوں...... ہاں دے تو دو لیکن غریب غربا گھر میں دھو، دھو کر میری تین سالہ بیٹی کے ناپ کا کر دیں گے۔ انہیں کیا پتا یہ کپڑے ڈرائی کلین کروائے جاتے ہیں دل کے نرم گوشے نے فریاد کی بیچارے ڈرائی کلین کے پیسے کہاں سے لائیں گے لہٰذا یہ انہیں دے کر ان کا درد نہ بڑھایا جائے۔ ہاں یہ یلو ویلیوٹ کی شرٹ نیٹ دوپٹے کے ساتھ ہاں یہ سوٹ نکال دیتی ہوں لیکن اس کے ساتھ نیٹ کا اتنا بھاری دوپٹا گھر میں کام کرنے میں دشواری ہوگی ایسا کرتی ہوں اپنی دوسرے نمبر والی بیٹی کا اس دوپٹے سے فراک بنوادوں گی گرمیوں میں پہن لے گی اول خویش بعد درویش میری بڑی بیٹی بنارسی ساڑی اٹھالائی ماما یہ تو آپ پہنتی نہیں ہیں، آپ ایسا کریں کسی غریب کو دے دیں۔ ویسے بھی آج کل ٹی پنک کلر ان نہیں ہے ساڑی دیکھ کر میری چیخ نکل گئی۔ جانتی ہو یہ ساڑی کتنے کی خریدی تھی۔ پندرہ سال پہلے پینتالیس ہزار کی تھی آج لینے جاؤ اول تو یہ چیز ملے گی نہیں تم رہنے دو، میں ٹریڈمل پر اپنا وزن کم کرتی ہوں اس ساڑی کی خاطر بیتی کی بیٹی کی اگلے مہینے شادی ہے وہاں پہن لوں گی۔ تمہارے پاپا کو میں اس ساڑی میں بہت چارمنگ لگتی ہوں۔ ویسے بھی غریب کیا جانیں ساڑی پہننے کے آداب...... ویسے اب الماریوں میں جگہ نہیں بچی کچھ نہ کچھ تو ضرور نکالنا ہی پڑے گا۔ غریبوں کے لیے آخر ان کا بھی تو حق ہے۔ ویسے تو میری پانچوں بیٹیوں کے دلوں میں میری طرح جذبہ غریباں کوٹ، کوٹ کر بھرا ہے۔ چھوٹی بیٹی میری پنک کلر کی فل ایمبرائڈڈ شال اٹھالائی جو میں پانچ سال پہلے دبئی سے ستر ہزار کی خرید کر لائی تھی۔ وہ شال جب بھی میں اوڑھتی ہوں ایک وکھرا ہی تفاخر کا احساس ہوتا ہے بیٹا جب میں مرجاؤں گی ناں تب بھی یہ شال کسی کو نہ دینا پانچوں بہنیں ہر سال ایک، ایک بار پہن لیا کرنا میری ایک قیمتی نشانی سمجھ کر۔ پکڑا اِدھر میں نے جھپٹا مار کر اپنی لخت لخت بیٹی سے وہ شال چھین لی۔

دفع کرو ایک ہمارے نہ دینے سے ان کے حالات تھوڑی بگڑ جائیں گے یہ غریب لوگ ایسے ہی رہیں گے اب ہم کس، کس کا خیال رکھیں اور بھی غم ہیں زمانے میں......

آسیہ عامر، کراچی

مجبوری

غیر دماغ پروفیسر لاہور سے کراچی پہنچ کر ٹرین سے اترے تو برے، برے منہ بنا رہے تھے۔ گھر پہنچ کر بیوی سے بولے۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں ٹرین میں سفر مجبوراً ہی کرتا ہوں۔ اس بار جہاز میں سیٹ نہیں ملی تو ٹرین سے آنا پڑا۔ اوپر سے سیٹ ایسی ملی کہ میری پیٹھ اس طرف تھی جس طرف ٹرین چل رہی تھی۔ جب بھی مجھے ٹرین میں ایسی سیٹ پر بیٹھنا پڑے تو طبیعت خراب ہوجاتی ہے۔"

بیگم بولی۔ "تو آپ سامنے والے مسافر سے سیٹ بدل لیتے۔"

پروفیسر: سوچا تو میں نے بھی یہی تھا لیکن سامنے والی سیٹ پر کوئی تھا ہی نہیں۔"

غائب دماغی

ایک غائب دماغ پروفیسر نے ایک بات یاد رکھنے کے لیے اپنی انگلی کے گرد ایک دھاگا باندھ لیا۔ رات کے کھانے کے بعد انہیں وہ دھاگا یاد آیا مگر انتہائی کوشش کے باوجود انہیں وہ بات یاد نہ آئی جس کی وجہ سے انہوں نے وہ دھاگا اپنی انگلی کے گرد لپیٹا تھا۔ وہ یہ سوچتے رہے، سوچتے رہے اور صبح پانچ بجے اچانک انہیں یاد آیا کہ انہوں نے دھاگا اس لیے باندھا تھا کہ وہ رات کو جلدی سونا چاہتے تھے۔

از: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

غزل

تمہیں یاد ہوگا کہ کب ہم ملے تھے
مجھے یاد پوری طرح ہے دسمبر
بڑی ہی کٹھن ہیں جدائی کی راتیں
تیری یاد آتی ہے شدت سے اکثر
تمہیں میرے راجا حویلی مبارک
غریبوں کی قسمت غریبی مقدر
فری یہ زمانہ بڑا مطلبی ہے
سبھی پھول چہرے مگر دل کے پتھر

کلام: فریدہ جاوید فری، لاہور

☆پروین......جنوبی پنجاب

میرے ہونٹوں پہ دعاؤں کی لکیریں روشن
میرے سینے میں سب ہی ساعتیں الہام کی ہیں
میری دکھتی ہوئی آنکھوں میں مگر آج کی شام
جتنی شمعیں بھی فروزاں ہیں تیرے نام کی ہیں

☆واجدہ درانی......جھنگ

مر گیا وہ شخص جس کا تم پوچھتے ہو
اس کو کسی کی یاد نے زندہ جلادیا

☆ثوبیہ مسرور......سیالکوٹ

موسم کوئی خوشبو لے کر آتے جاتے ہیں
کیا کیا ہم کو رات گئے تک وحشت رہتی ہے
دھیان میں میلا سا لگتا ہے بیتی یادوں کا
اکثر اس کے غم سے دل کی صحبت رہتی ہے

☆ربیعہ احسان......فیصل آباد

تھکا دیا اسے آندھیوں نے مل جل کے
وہ اِک پرندہ جو اونچی اڑان رکھتا تھا

☆ماہین مسعود......کمالیہ

سچائیوں کا جن کے سروں میں جنون تھا
پھر شہریار وقت نے وہ سر اڑا دیے
بارود کے خمار سے وحشت امڈ پڑی
اپنے ہی بھائیوں نے بھرے گھر اڑا دیے

☆ثمینہ کوکب......جہلم

پھر نیا سال، نئی صبح، نئی امیدیں
اے خدا خیر کی خبروں کے اجالے رکھنا

☆پروین افضل......بہاول نگر

تیری ہر بات محبت میں گوارا کر کے
دل کے بازار میں بیٹھے ہیں خسارہ کر کے
میں وہ دریا ہوں کہ ہر بوند بھنور ہے جس کی
تم نے اچھا ہی کیا مجھ سے کنارہ کر کے

☆جبینا......کراچی

دے، دے مجھے اے یارب چاہت وہ مدینے کی
دل میں بھی مدینہ ہو الفت ہو مدینے کی

☆فرخندہ جعفری......گجرات

تیری یادیں ہیں دسمبر کی شاموں جیسی
جو آتی ہیں تو جانا بھول جاتی ہیں

☆عروبہ ناز......کوٹلی

اِک برس اور بیت گیا دیکھو
کب تلک خاک یوں اڑانی ہے

☆زرینہ خانم......مظفر گڑھ

افواہ تھی میری طبیعت خراب ہے
لوگوں نے پوچھ، پوچھ کر بیمار کر دیا

☆فریدہ فری......لاہور

تم نے دیر کی آنے میں ورنہ
صبح تک دل کا دروازہ کھلا تھا

☆نگینہ ضیا......کیماڑی

خزاں کی رُت ہے جنم دن ہے اور دھواں اور پھول
ہوا بکھیر گئی موم بتیاں اور پھول

☆یاسمین کنول......پسرور

یہ اداسی تمہیں نہیں بجتی
مسکراہٹ کو تم بحال کرو
جو لگائے امیدیں بیٹھے ہیں
ان کی نظروں کا کچھ خیال کرو

☆زرتاشیہ نعمان......ملتان

میں چاہتی تھی وہ فقط میرا ہو ہم سفر
وہ میری کائنات سے بڑھ کر ملا مجھے
مدت کے بعد ہے وہ ستم گر ملا مجھے
جس کی مجھے تلاش تھی گوہر ملا مجھے

☆عرشیہ جنید......کراچی

میں رو دیتی ہوں اکثر بے حسی پر
کبھی بھولے سے جب اخبار دیکھوں
گزرتا جارہا تھمتا نہیں ہے
میں بیٹھی وقت کی رفتار دیکھوں

☆صائمہ سجاد بنگش ......کوہاٹ

کچھ خوشیاں کچھ آنسو دے کے ٹال گیا
جیون کا اِک اور سنہرا سال گیا

☆ساجدہ ظفر......کمالیہ

ہمیشہ ایک ہی تصویر رہ جاتی ہے آنکھوں میں
یہ پہلا ہجر ہے اور ایسا منظر کب بدلتا ہے
کسی کو سالِ نو کی کیا مبارک باد دی جائے
کیلنڈر کے بدلنے سے مقدر کب بدلتا ہے

☆نورین......ایبٹ آباد

یہ شہر میرے لیے اجنبی نہ تھا لیکن
تمہارے ساتھ بدلتی گئیں فضائیں بھی

☆تسنیم کوثر......کراچی

پیار سے بڑھ کر نہیں دنیا میں کوئی روشنی
پی گئے یہ روشنی تو آئینہ ہو جاؤ گے
گفتگو میٹھی کرو ہر شخص سے جھک کر ملو
دشمنوں کے واسطے بھی دلربا ہو جاؤ گے

☆زونیہ علی......کھاریاں

منکر ہے وہی اب میری پہچان کا محسن
اکثر مجھے خط خون سے لکھتا تھا وہ اِک شخص

☆حمنیٰ قندیل......ٹوبہ ٹیک سنگھ

خوش مزاجی بھی مشہور تھی اب سادگی بھی کمال ہے
ہم شریر بھی انتہا کے تھے اب سنجیدگی بھی کمال ہے

☆صدف......کراچی

یہ مرحلہ بھی محبت میں خوشگوار رہا
الجھنا تم سے تمہاری ہی آرزو کرنا

☆انیقہ انا......چکوال

لفظوں کی آبرو کو گنواؤ نہ یوں عدیم
جو مانتا نہیں اسے کہنا فضول ہے

☆زینب ظفر......کراچی

کس کو بتلائیں کہ آشوبِ محبت کیا ہے
جس پر گزری ہو وہی حال ہمارا جانے

☆فصیحہ آصف خان......ملتان

آج ڈھلتی ہوئی شام نے جب رنگ بدلا
مجھے بدلے ہوئے لوگوں کی بہت یاد آئی

☆ماہ نور خان......بہارہ کہو

میں نے جب یاد کیا یاد وہ آیا محسن
اس سے زیادہ اسے پابندِ وفا کیا کرتا

☆فہمیدہ جاوید......ملتان

تجھ کو رسوا نہ کیا خود بھی پشیماں نہ ہوئے
عشق کی رسم کو اس طرح نبھایا ہم نے

☆ثوبیہ ظہور......ضلع اٹک

دل کے جزدان میں اِک نام سجا ہے ناصر
ہم کسی حال میں ہوں اس کی خبر رکھتے ہیں

☆سعیدہ بانو......لوئر مال، مری

آ کسی روز دکھائیں تجھے یہ خانۂ دل
ہم تیری یاد کا سامان یہیں رکھتے ہیں

☆سپاس گل......رحیم یار خان

کاش تعبیر بھی آجائے کسی روز نظر
آئے دن خواب یہ آتے ہیں کہ وہ آتے ہیں

☆آسیہ عامر......کراچی

تصور میں صدا آؤ مگر کچھ تیرنا سیکھو
تم اکثر ڈوب جاتے ہو میرے اشکوں کے طوفاں میں

☆فروا......پنجاب

رکھ دے گا بدل کے وہ میرے روپ کی صورت
میں برف کا انسان ہوں تو دھوپ کی صورت

☆فروا اکرم......فیصل آباد

گلہ فضول تھا عہدِ وفا کے ہوتے ہوئے
سو چپ رہا وہ ستم ناروا کے ہوتے ہوئے
یہ قربتوں میں عجب فاصلے بڑھے کہ ہمیں
ہے آشنا کی طلب آشنا کے ہوتے ہوئے

☆☆☆

پیاری بہنو! خوش ذائقہ کے ان صفحات میں ہم آپ کے لیے معروف میزبان اور شیف شگفتہ یاسمین کے تیار کردہ کھانوں کی تراکیب بعنوان ''امی کی ریسیپی'' لے کر آئے ہیں۔ (مدیرہ)

شام کا ناشتا

آپ حیران نہ ہوں اکثر گھرانے شام کی چائے پر باقاعدہ اہتمام کرتے ہیں اور اسے شام کے ناشتے کا نام دیتے ہیں۔ آپ بھی جھٹ پٹ ناشتے تیار کر سکتی ہیں۔

☆ گھر میں دالوں سے نمکو بنایئے۔

ماش، چنے، مونگ یا کالی مسور کی دال، بارہ گھنٹے نمک کے ساتھ پانی میں بھگویئے۔ تلنے سے گھنٹا بھر پہلے نتھار کر کسی کاغذ یا کپڑے پر پھیلا دیں تاکہ اضافی پانی نکل جائے۔ کڑاہی میں تیل تیز گرم کر کے اس میں دال تلیں اور نکال کر خاکی کاغذ پر پھیلا دیں۔ ٹھنڈا ہونے پر کالی مرچ، نمک، اجینوموتو اور چاٹ مسالا ڈال کر نوش فرمائیں۔ یہ چیزیں آپ بنا کر ایئر ٹائٹ جار میں محفوظ بھی کر سکتی ہیں اس طرح مٹر کے دانے، کالے اور سفید چنے بھی تلے جا سکتے ہیں مگر ٹھنڈا ہونے دیں۔ مونگ پھلی کے اضافے سے یہ اور مزے کے ہو جائیں گے۔

☆ ایک تو ڈبل روٹی کو باسی نہ ہونے دیں اگر ہو جائے یا کبھی پہلا اور آخری سلائس بچ جائے تو پکوڑوں کی طرح بیسن کا آمیزہ بنائیں اور یہ سلائس اس میں ڈپ کر کے تلیں۔ ایک یا دو دن پرانی ڈبل روٹی کو استعمال کرنے سے پہلے اچھی طرح دیکھ لیں کہ پھپھوندی یا فنگس تو نہیں لگی اگر ہے تو استعمال نہ کریں۔

بعض اوقات بچے آدھے سلائس کھاتے ہیں اور آدھے چھوڑ دیتے یا پھر کنارے چھوڑ دیتے ہیں۔ انہیں ضائع نہ ہونے دیں۔ انہیں بیسن کے ہی آمیزے میں یا فرنچ ٹوسٹ کے آمیزے میں تل کر بچوں کو دیں اس صورت میں وہ کھا لیں گے۔

ادرک کا حلوا

اجزا: ادرک، 1/2 کلو۔ فائن آٹا، 1/2 کلو۔ گھی، 1/2 کلو۔ انڈے، 3 عدد۔ الائچی پاؤڈر، چائے کا آدھا چمچ۔ چینی، 3 کپ بھر کے۔ تازہ دودھ، ڈیڑھ کپ۔ بادام، کاجو اور پستے، حسب پسند۔

ترکیب: ادرک کو کم سے کم پانی ڈال کر باریک پیس لیں، آدھا گھی گرم کر کے ادرک ڈال کر اس کا پانی سوکھنے تک گولڈن کرنا ہے۔ خیال رہے کہ چمچ مسلسل چلاتی رہیں تاکہ ادرک برتن میں چپکے نہیں۔ آدھا گھی الگ برتن میں ڈال کر گرم کریں اور اس میں خوشبو آنے تک آٹا بھون کر ایک طرف رکھ لیں۔

ایک بڑے باؤل میں تینوں انڈے، الائچی پاؤڈر اور دودھ ڈال کر ہلکا سا پھینٹ لیں۔ ڈرائی فروٹ موٹے، موٹے کاٹ کر تھوڑے سے گھی میں فرائی کر کے ایک طرف رکھ لیں۔ ادرک گولڈن ہوتے ہی اس میں بھنا ہوا آٹا ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں اور جو ادرک پتیلی میں چپک جاتی ہے تو وہ بھی اس کے ساتھ نکل آئے گی۔ اب اس میں چینی ڈال دیں اور مکس کریں پھر اس میں انڈے اور دودھ کا جو آمیزہ تیار کیا تھا وہ ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ آخر میں بھنے ہوئے ڈرائی فروٹ ڈال کر چمچ چلائیں اور چولہے سے اتار لیں۔ مزیدار اور مقوی ادرک کا حلوا تیار ہے (اسے فریج میں رکھنے کی ضرورت نہیں ہے)

فرنچ ٹوسٹ

انڈا، دودھ اور چینی مکس کر کے اس میں ڈبل روٹی کے سلائس ڈپ کر کے تلیں۔ دودھ بالائی دار ہو تو اچھا ہے۔ سلائس سنہرا ہونے تک تلیں اگر کسٹرڈ بنا رہی ہوں اور پلین کیک ڈالنا مقصود ہو مگر وہ دستیاب نہ ہو تو سلائس کی اسی ترکیب سے کام چلایئے بس اس کے مزید چوکور ٹکڑے کر لیں۔ ایک سلیقہ مند خاتون خانہ اشیا کو ضایع ہونے سے بچا سکتی ہے اور بھرپور غذایت کا خیال رکھتے ہوئے چھوٹے موٹے گُر اپنا سکتی ہے مگر سب سے پہلے غذائی اشیا کی تازگی، صحت اور درستگی کا یقین کر لیجیے پھر استعمال کیجیے۔

ہمیشہ یاد رکھیں امی کی ریسیپی کیونکہ یہی ہے راز ہوم شیف بننے کا۔

سبزیوں کے کٹلس

اشیاء: گاجر درمیانہ سائز دو عدد، شلجم درمیانہ سائز دو عدد، شملہ مرچ ایک عدد، بند گوبھی آدھا پاؤ، مٹر ایک پاؤ، ہری پیاز آدھا پاؤ، ہری مرچ حسب ذائقہ، آلو ڈیڑھ کلو، نمک مرچ حسب ذائقہ، کارن فلاور تیل حسب ضرورت کباب تلنے کے لیے، مولی، ٹماٹر، کھیرا، چقندر ایک ایک عدد (سلاد کے لیے)

ترکیب: آلو ابال کر اچھی طرح ہاتھ سے بھُرتا کر لیں۔ اس میں الگ سے ایک کھانے کا چمچہ نمک، ایک کھانے کا چمچہ کٹی مرچ اور بھنا ہوا سفید زیرہ کھانے کا ایک چمچہ پیس کر ملا دیں اور کارن فلاور بھی ملائیں پھر تمام سبزیاں کاٹ لیں (زیادہ باریک نہ ہوں) اور ابلے ہوئے مٹر سمیت ذرا سے تیل میں فرائی کر لیں مگر سبزیاں زیادہ گلنے نہ پائیں۔ ٹھنڈی ہونے پر کسی کاغذ پر پھیلا دیں اور تیل خشک ہو جائے تو پسے ہوئے آلو کا کباب کی طرح پیڑا بنائیں اور اس میں تھوڑی سبزی ڈال کر تھوڑے سے پسے ہوئے آلو سے منہ بند کریں اور اس طرح تمام کٹلٹس تیار کر کے کباب کی طرح تل لیں۔ سلاد تیار کر کے سبزیوں کے گول گول قتلے رکھ دیں اور گرم گرم کٹلٹس درمیان میں رکھ کر خود بھی کھائیں اور مہمانوں کو بھی پیش کریں اگر کباب بکھرنے کا خدشہ ہو تو ڈبل روٹی یا رسک (پاپے) کا چورا لگا کر انڈے کے آمیزے میں لپیٹ کر بھی تل سکتی ہیں۔

از: نگہت آصف اسلام آباد

فرائی چانپ

اجزا: چانپ آدھا کلو، نمک حسب ذائقہ، لال مرچ ایک چمچ، کالی مرچ ایک چمچ، ادرک، لہسن پیسٹ دو چمچ، پسا ہوا گرم مسالا ایک ٹی اسپون، پسا ہوا کچا پپیتا ایک چمچ، بھنا ہوا اور پسا ہوا دھنیا اور سفید زیرہ ایک ایک چمچ، انڈا ایک عدد، زرد رنگ آدھا ٹی اسپون اور آئل فرائی کے لیے۔

ترکیب: چانپ دھو کر خشک کر لیں اور انڈے اور آئل کے علاوہ تمام اجزا چانپوں پر اچھی طرح لگا کر دو گھنٹے فریج میں رکھ دیں۔ انڈے کے آمیزے میں نمک ملا کر چانپ ڈبو کر فرائی کر لیں، خوب سرخ اور کرسپی ہونے پر اتار لیں۔ فرنچ فرائز، چٹنی اور سلاد کے ساتھ مزہ دوبالا ہو جائے گا۔

تابندہ جبین، کراچی

مٹر کی دال

اجزا: مٹر کے دانے آدھا کلو، لہسن ادرک اور ہری مرچ باریک کٹے ہوئے ایک ایک چائے کا چمچہ، نمک و مرچ حسب ذائقہ، تیل حسب ضرورت، سفید زیرہ کٹا ہوا ایک چائے کا چمچہ، املی کا گودا آدھا چمچہ۔

ترکیب: مٹر کے دانے نمک اور مرچ ڈال کر ابالنے کو رکھ دیں۔ گل جانے پر پانی سے نکال کر موٹا موٹا پیس لیں۔ اب مٹر کا ابلا ہوا باقی پانی ڈال کر دال کی طرح پتلا کر لیں، اب اس میں املی ڈال کر پانچ منٹ پکائیں۔ آخر میں ادرک، لہسن اور ہری مرچ تیل میں فرائی کر کے دال پر بگھار لگا دیں اوپر سے پسا زیرہ بھی چھڑک دیں۔ گرم گرم چپاتی کے ساتھ مٹر کی دال کا لطف اٹھائیں۔

فرزانہ جوہر، کراچی

پہلا انعام یافتہ سوال

☆ ربیعہ احسان......فیصل آباد

سوال ﴿ زمانے میں جتنی بھیڑ بڑھ رہی ہے لوگ اتنے ہی اکیلے کیوں ہوتے جا رہے ہیں؟

جواب ﴿ دماغوں کا فتور ہے۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ فرخندہ جعفری......گجرات

سوال ﴿ بعض لوگ ہر بندے کے سامنے الگ چہرہ لے کر آتے ہیں؟ آخر وہ اتنے چہرے کہاں سے لیتے ہیں؟

جواب ﴿ اُف......بہت مشکل سوال کر دیا بھئی۔

☆ فروا اکرم......فیصل آباد

سوال ﴿ نئے سال میں شوہر کو مٹھی میں بند کرنے کا کوئی نیا طریقہ بتا دیں؟

جواب ﴿ پہلے ہم تجربہ کر لیں پھر تمہیں بھی یہ راز بتا دیں گے۔ تھوڑا انتظار کرو۔

سوال ﴿ کہتے ہیں سفر کا مزہ لینا ہو تو ساتھ سامان کم رکھیے......اگر زندگی کا مزہ لینا ہو تو......؟

جواب ﴿ گناہوں کا سامان کم رکھیے۔

☆ پروین افضل شاہین......بہاول نگر

سوال ﴿ شوہر کی چٹنی بنانے کا طریقہ بتا دیں، میں نے اپنے میاں جانی کی بنانی ہے؟

جواب ﴿ راز کی باتیں یہاں کہاں بتا دیں بھئی۔

سوال ﴿ میرے میاں جانی بہکی، بہکی باتیں کرنے لگے ہیں، میں انہیں کہتی ہوں کہ سالگرہ آئی ہے وہ کہتے ہیں کہ کس کے ساتھ بتائیں، میں کیا کروں؟

جواب ﴿ ارے ان کی کلاس فیلو تھی ناں...... ''سالگرہ بانو۔''

سوال ﴿ میں نے اپنے میاں جانی سے کہا کہ نئے سال 2021ء میں میرا گھر کا خرچہ بڑھائیں، مہنگائی بہت زیادہ ہوگئی ہے تو وہ آسمان کی طرف دیکھنے کیوں لگے؟

جواب ﴿ اللہ تعالیٰ سے مدد جو مانگتی تو تھی...... اور کیا۔

☆ ثمینہ کوکب......جہلم

سوال ﴿ رشتوں کی رسی اب کمزور کیوں ہونے لگی ہے؟

جواب ﴿ یہ تو اپنی، اپنی سوچ کی بات ہے ڈیئر۔

☆ زرینہ خانم......مظفر گڑھ

سوال ﴿ کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ اب بیچارہ کیسے چلتا ہوگا؟

جواب ﴿ اِدھر اُدھر دیکھ کر چل ہی لیتا ہے۔

☆ جمینا......کراچی

سوال ﴿ گھنٹا گھر کس کا گھر ہے، کیا کرایے پر مل سکتا ہے؟

جواب ﴿ جا کر بات کر لو شاید سب سے بڑا بیٹا 12 تمہیں کوئی جواب دے سکے۔

سوال ﴿ تاس جیتنے پر انعام کیوں نہیں ملتا؟
جواب ﴿ بات تو صحیح سوچی تم نے۔
سوال ﴿ کدوکش کو آخر کدوکش ہی کیوں کہتے ہیں اور بھی سبزیاں ہیں آخر؟
جواب ﴿ ہاں کسی پہلے کدو کو کش کیا گیا بس جب سے یہی نام پڑا۔
☆ تسنیم کوثر...... کراچی
سوال ﴿ دل کا دلی سکون اور چین کہاں ملتا ہے؟
جواب ﴿ اللہ کی یاد میں۔
سوال ﴿ فلسفہ بگھارنا یا فلسفہ بولنا سے کیا مراد ہے؟
جواب ﴿ حقیقت دنیا بتانا۔
سوال ﴿ صرف رائی کا پہاڑ کیوں ہوتا ہے میتھی، زیرہ، کلونجی کا کیوں نہیں ہوتا بتایئے؟
جواب ﴿ کیوں تمہیں اپنا مسالا بیچنا ہے۔
☆ ربیعہ احسان...... فیصل آباد
سوال ﴿ لوگ سارے کھلونے چھوڑ کر جذبات سے کیوں کھیلتے ہیں؟
جواب ﴿ ٹوٹے کھلونے تو نظر آجاتے ہیں ٹوٹے جذبات کو نظر نہیں آتے ناں...... یوں صاف بچ جاتے ہیں۔
☆ یاسمین کنول...... پسرور
سوال ﴿ ہر نیا سال اتنا خاص کیوں ہوتا ہے؟
جواب ﴿ اپنا احتساب جو کرنا ہوتا ہے۔
سوال ﴿ نئے سال کو پرانا ہوتے کتنی دیر لگتی ہے؟
جواب ﴿ بس اگلا دن گزرتے ہی پرانا ہو جاتا ہے۔
سوال ﴿ فروری کو سال کا سب سے چھوٹا مہینہ کیوں کہتے ہیں؟
جواب ﴿ کیوں، تم نے 31 کا فروری آج تک دیکھا ہے۔
☆ فہمیدہ جاوید...... ملتان
سوال ﴿ فروری کی وجہ سے ہر طرف ٹھنڈ ہے مگر اپنا دماغ کیسے ٹھنڈا رکھوں؟
جواب ﴿ ماہنامہ پاکیزہ پڑھ کے اور کیا۔
سوال ﴿ میرا نام ہے ف سے فروری ہے، ف سے مگر وہ کیا ہے جو میرا نہیں ہے اور وہ ہے ف سے؟
جواب ﴿ فرمائشی حلوا۔
سوال ﴿ فروری کے مہینے میں دھوپ میں بیٹھ کر مالٹوں کی ٹرے سے انصاف کر رہی تھی کہ اچانک؟
جواب ﴿ ٹرے سے کیوں مالٹے کسی اور نے کھالیے۔
سوال ﴿ میری نندیں مجھ سے اتنی محبت کیوں کرتی ہیں؟
جواب ﴿ شکر خدا کا کرو۔
سوال ﴿ بندر کیا جانے ادرک کا سواد اور بندریا؟
جواب ﴿ کیا جانے ادرک کے حلوے کا سواد۔
سوال ﴿ میرے میاں کو ڈانس پسند ہے اور مجھے ڈانس کا شوق نہیں اب کیا کروں؟
جواب ﴿ سیکھ لو ورنہ یوٹیوب زندہ باد۔
☆ فرخندہ جعفری...... گجرات
سوال...... آخری سانس لیتے ہوئے مریض کو یہ کہہ کر کہ اسپتال سے کیوں نکال دیا جاتا ہے کہ اس کو کورونا ہے لے جاؤ......؟
جواب ﴿ تو ہوگا ناں......
سوال ﴿ اعمالوں کا حساب تو رب دے گا...... کسی کو مصیبت میں دیکھ کر لوگ کیوں کہتے ہیں اس کو اپنے اعمال کی سزا ملی ہے؟
جواب ﴿ اپنے آپ کو نیک ثابت کرنے کو۔
سوال ﴿ آخر سچ اتنا کڑوا کیوں ہوتا ہے، جسے کوئی بھی پینا پسند نہیں کرتا؟
جواب ﴿ اسی میں تو شفا ہوتی ہے پینے سے پہلے تھوڑی پتا چلتا ہے۔
☆☆☆
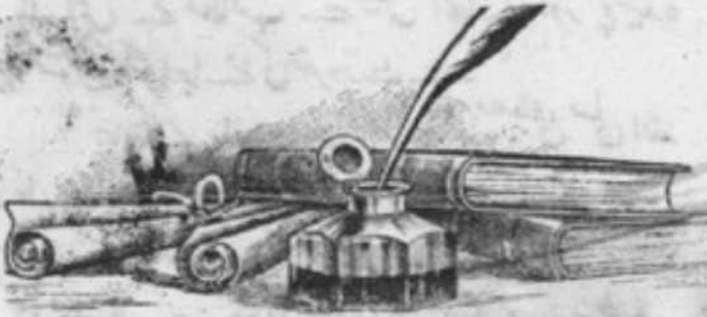
فضائل آیت الکرسی

آیت الکرسی پڑھنے سے:

☆ذہنی اور قلبی سکون نصیب ہوتا ہے۔
☆فقر و فاقہ اور رزق کی تنگی دور ہوتی ہے۔
☆آسیبی اور جادوئی اثرات ختم ہو جاتے ہیں۔
☆مال و اسباب چوری سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔
☆گھر میں اور کاروبار میں برکت ہوتی ہے۔
☆مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔
☆سب سے بڑھ کر یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ جو شخص کثرت سے آیت الکرسی پڑھے گا اس کا انجام بخیر ہوگا اور اس پر موت کی سختی آسان ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ!

اللہ نے اپنے عرش و کرسی کے نیچے اس آیت کو لکھا ہوا ہے وہاں سے اتار کر سورۂ بقرہ میں رکھ دیا گیا جسے حضرت جبرائیل امینؑ ستر ہزار فرشتوں کے ساتھ لے کر نازل ہوئے۔ یہ عظیم آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کی گئی کسی اور نبیؑ کو نہیں دی گئی۔ جسے کثرت سے پڑھنے والا شخص اللہ کا قرب اور جنت کا مستحق بن جاتا ہے۔ کثرت سے پڑھنے والے پر موت کی سختی آسان ہو جاتی ہے اور وہ اللہ کی پناہ میں آ جاتا ہے۔ فرشتے اس کے لیے دعائے خیر اور دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ پڑھنے والے کے گھر میں خیر و برکت خوش حالی اور سکون قلب نصیب ہوتا ہے۔ کثرت سے پڑھنے والا آسیبی اور جنات کے اثرات سے بہت حد تک محفوظ رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے گھر والے اور پڑوسی بھی ہر طرح محفوظ رہتے ہیں۔ جس گھر میں پڑھی جاتی ہے اس سے فقر و فاقہ، تنگ دستی، پریشانیاں اور ذہنی الجھنیں دور ہو جاتی ہیں۔ پڑھنے والا شخص اور اس کے گھر والے ہر طرح کی بیماریوں اور اس کی شدت سے محفوظ رہتے ہیں۔ پڑھنے والے شخص کی جنون اور متعدی مرض اور چوری سے حفاظت کی جاتی ہے۔ اسے پڑھ کر دم کرنے سے ہر طرح کے امراض اور مصائب سے حفاظت کی جاتی ہے۔ پڑھنے والے کے لیے فرشتے اگلے دن کی ساعت تک نیکیاں لکھتے اور برائیاں مٹاتے رہتے ہیں۔

آیت الکرسی احادیث کی روشنی میں

آیت الکرسی کے یہ فضائل مختلف احادیث سے ثابت ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت الکرسی جتنی بھی پڑھی جائے گی انسان اللہ کی رحمتوں سے اتنا ہی قریب ہوتا چلا جائے گا۔

قرآن کریم میں جگہ جگہ اللہ کی ذات وصفات کو بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ایسا تو ہے کہ چند آیتیں ملا کر اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا بیان ہے لیکن کسی ایک آیت میں اللہ کی بہت سی صفات کو جمع کر دیا گیا ہو۔ وہ صرف آیت الکرسی ہے جس میں ایک مرتبہ اللہ کا ذاتی نام اور سولہ مرتبہ اس کی صفات کو الفاظ اور ضمیروں میں بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے آیت الکرسی کو تمام آیات کا سردار فرمایا گیا ہے۔ امام غزالیؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص سچی طلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ تلاش کرے گا جس میں اس کی توحید، تقدیس اور صفاتِ عالیہ کو بیان کیا گیا ہو تو وہ صرف آیت الکرسی ہی میں ملے گی۔ (زرقانی)

☆☆☆

فضیلت آیات قرآنی

اس پُر آشوب اور وبائی امراض کے دور میں قرآن پاک سے استفادہ کرنا اور شفا حاصل کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اسے صرف پڑھنے کی حد تک نہیں

بلکہ اس کے مطالب سے فیض اٹھانے اور پوشیدہ حکمتوں کو بھی جاننے کی ضرورت ہے۔

ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورۂ کہف کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ یہ سورۂ مبارکہ دجال کے فتنے کو رفع کرنے میں مددگار ہے۔یعنی آج وہ دور ہے کہ جب ہر طرف سے دجالی فتنے سر اٹھائے ہوئے ہیں خصوصاً روز جمعہ اس کی تلاوت کا حکم ہے۔

فضائلِ سورۂ کہف

☆سورۂ کہف کی تلاوت سے دل منور اور روشن ہو جاتا ہے۔

☆سورۂ کہف کی تلاوت سے قلب کو سکون و اطمینان ملتا ہے۔

☆سورۂ کہف پڑھنے والا دجال کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔

☆سورۂ کہف پڑھنے سے رزق میں برکت ہوتی ہے۔

☆سورۂ کہف پڑھنے سے بگڑے ہوئے کام بن جاتے ہیں۔

افادیت سورۂ کہف

نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ کہف پڑھنے کے بے انتہا فائدے ہیں۔اس کی تلاوت ایک ایسا نور ہے جس سے دل روشن اور منور ہو جاتا ہے اور اللہ اس کی برکت سے زندگی کے اندھیرے دور کر دیتا ہے۔اس کو پڑھنے والا ہر طرح کے فتنوں سے اور آزمائشوں سے محفوظ رہتا ہے۔دجّال کے نکلنے کے بعد ایمان کو سنبھالنا بہت دشوار ہوگا مگر سورۂ کہف کی تلاوت کرنے والا ان شاء اللہ دجال کے فتنے سے بھی محفوظ رہے گا اور اس کو سکون قلب کی ایک خاص کیفیت نصیب ہوگی۔

☆حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔"جو شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف کی تلاوت کرے گا وہ آٹھ دن تک (یعنی اگلے جمعہ تک) ہر فتنہ سے محفوظ رہے گا۔اگر دجال نکل آئے گا تو اس کے فتنے سے بھی محفوظ رہے گا۔

☆ایک اور روایت میں ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف تلاوت کرے گا اس کے قدم سے لے کر آسمان تک ایک نور ہی نور ہوگا جو قیامت کے دن بھی روشنی دے گا اور پچھلے جمعہ سے اگلے جمعہ تک کے اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

حضرت انسؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ سورۂ کہف ایک ہی وقت میں نازل ہوئی جس کو ستر ہزار فرشتے (اپنے ہاتھوں پر اٹھائے) اس کے ساتھ آئے۔جس سے اس سورۃ کی شان ظاہر ہوتی ہے۔(روح المعانی بروایت بیہقی)

☆حضرت ابو دردؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جو شخص سورۂ کہف کی دس آیتیں حفظ کرلے گا وہ دجال کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔(مسلم،ترمذی،ابوداؤد،نسائی،مسند احمد)

☆حضرت سہل بن معاذؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جو شخص سورۂ کہف کی پہلی بارہ آیتیں اور آخری نو آیتیں پڑھے گا اس کے سر سے قدم تک ایک نور ہوگا اور جو پوری سورۂ پڑھے گا تو زمین سے آسمان تک نور ہی نور ہوگا۔(مسند احمد)

ان تمام معتبر حدیثوں سے معلوم ہوا کہ سورۂ کہف کے پہلے اور آخری رکوع کی آیتیں اور جمعہ المبارک کے دن مکمل سورۂ کہف پڑھنے کے بہت فضائل ہیں اور ان سے اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ان لوگوں پر نازل ہوتا ہے جو اس سورت کی تلاوت کرتے ہیں۔اس طرح اللہ تعالیٰ ان کی ساری پریشانیوں کو دور کر دیتا ہے۔

نوٹ:قرآن پاک کی تمام سورتوں کے بے انتہا فضائل اور مناقب ہیں اور ان شاء اللہ وقتاً فوقتاً اپنے قارئین کو اس سے آگاہ کرتے رہیں گے۔پروردگار عالم سے دعا ہے کہ ہمیں قرآن مجید فرقان حمید صحیح تلفظ وادائیگی کے ساتھ تلاوت کرنے کی توفیق عطا ہو۔الٰہی آمین!

☆☆☆

DON'T WAIT TO LOSE WEIGHT

وزن گھٹائیں
خوبصورت و تندرست ہو جائیں

ہر دس میں سے چار افراد موٹاپے کی وجہ سے ذیابیطس کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ہر دس میں سے دو افراد موٹاپے کی وجہ سے دل کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ہر دس میں سے چار افراد موٹاپے کی وجہ سے کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

Phytolacca e baccis Ø
10 drops thrice a day

+

Phytolacca americana 3x
1 tablet thrice a day

Dr. Willmar Schwabe
Germany
From Nature. For Health.

Original Medicines of Schwabe Germany, easily available now at all Homoeo Pharmacies

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

چھینکیں

ابوبکر...... فیصل آباد

ڈاکٹر صاحب میری عمر 16 سال ہے اور کالج میں پڑھتا ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ حد سے زیادہ چھینکیں آتی ہیں اور صبح کے وقت تو بے تحاشا۔ چھینکنے کی وجہ سے گلے میں بھی شدید درد ہوتا ہے۔ تھکاوٹ بہت زیادہ ہوتی ہے حتیٰ کہ کبھی کبھار بخار بھی ہو جاتا ہے۔ ناک سے پانی بھی بہتا ہے۔ میری صبح کی کلاس تقریباً چار گھنٹے کی ہوتی ہے، میں لیکچر پر یکسوئی سے توجہ نہیں دے پاتا۔ اسکالر شپ ہولڈر ہوں مگر ان چھینکوں اور الرجی کی وجہ سے نہایت تنگ اور پریشان ہوں۔ آپ ایسی دوا تجویز کر دیں جس سے میں جلد از جلد ٹھیک ہو جاؤں۔

جواب: نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر دن میں 3 مرتبہ ناک میں چڑھائیں۔ ٹھنڈا، گرم اور گرم، ٹھنڈا نہ کریں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ گرم چیز پینے یا کھانے کے بعد کوئی ٹھنڈی چیز استعمال نہ کریں اس طرح نہانے کے بعد فوراً ہوا میں نہ آئیں۔ ٹھنڈک سے گرمی میں اور دھوپ میں سے ٹھنڈی جگہ فوراً نہ جائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کرنے کے بعد دوبارہ حالت سے مطلع

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

مارچ 2021ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________________

پتا: ____________________

____

کریں Belladona 30 اور Nat. mur 30 کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر چار مرتبہ لیں۔

لیکوریا

شازیہ...... بھاولپور

مجھے دو سال سے لیکوریا کا مسئلہ ہے۔ کبھی زیادہ ہو جاتا ہے تو کبھی کم۔ میں بہت کمزور ہوں، مجھے بھوک بہت کم لگتی ہے، کچھ کھانے کو دل نہیں چاہتا اور پیٹ میں کبھی کبھی درد بھی ہوتا ہے۔ جسم میں خون کی کمی ہے جس کی وجہ سے پورے جسم میں درد رہتا ہے۔ ڈاکٹر کو چیک کروایا تو انہوں نے بس کمزوری بتائی باقی سب کچھ نارمل ہے۔ میں دودھ بھی پیتی ہوں اور فروٹ بھی کھاتی ہوں لیکن پھر بھی بہت کمزور ہوں۔ ہڈیاں نظر آتی ہیں۔ صحت روز بروز گرتی جارہی ہے۔ نسوانی حسن کی بھی بہت کمی ہے۔ پلیز آپ کوئی ایسی دوا تجویز کریں جس سے مجھے بھوک لگے اور غذا جزوبدن ہو، جگر خون پیدا کرے تاکہ جسم میں خون کی کمی پوری ہوجائے۔ لیکوریا اور نسوانی حسن کے لیے بھی دوا تجویز کریں۔ تاکہ میں جلد صحت یاب ہوجاؤں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دیں گے۔ (آمین)

جواب: خون کی کمی کا کوئی ٹیسٹ کروایا ہے؟ اس کے بغیر آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ خون کی کمی ہے اور خون نہیں بن رہا۔ CBC اور Thyroid Profile کرا کر رپورٹ بھیجیں اور ایک ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Bovista 30 Ferum Met 30,Iodium 30 کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی ڈال کر تین مرتبہ لیں۔ لیکوریا کس رنگ کا اور کب ہوتا ہے۔ جلن، خارش کے متعلق بھی لکھیں۔

مقعد کا زخم

ودود...... خوشاب

میں کافی عرصے سے Fistula کے مرض میں مبتلا

ہوں شروع میں، میں نے کوئی دھیان نہ دیا، مختلف اقسام کے مرہم، کریم لگاتا رہا مگر بے سود۔ پھر سرجن کو دکھایا تو معائنہ کر کے بتایا کہ یہ فسچولا ہے اس کا آپریشن ہوگا۔ لوگوں سے مشورہ کیا اور کئی جگہ پڑھا بھی کہ یہ پھر پانچ یا چھ ماہ بعد ہو جاتا ہے۔ جب یہ دانہ بنا کافی خون نکلا مگر دانے میں نہ کوئی جلن ہے نہ تکلیف۔ میں نے تین ماہ ہومیو پیتھک دوائی کھائی مگر دانہ ختم نہ ہوا۔ بتایا کہ پاخانہ کی نالی کے ساتھ ایک زخم بن جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ دانہ بنتا ہے۔ پہلے سے اب مواد بننا کم ہو گیا ہے مگر دانہ اپنی جگہ موجود ہے۔ ویسے چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ بڑا گوشت، انڈا، مچھلی، تلی ہوئی چیزیں، بیکری آئٹم سب بند کر دیے ہیں۔ بادی چیزوں سے بھی پرہیز کرتا ہوں۔ آپ کا بڑا احسان ہوگا کہ اس کا حل تجویز کردیں اللہ آپ کو اس کی جزا دے۔ آمین!

جواب: تیز مرچ مصالحوں کے علاوہ سب کچھ کھائیں۔ قبض نہ ہونے دیں۔ تازہ پھل اور سبزیاں زیادہ سے زیادہ کھائیں۔ Sulphur 200 کی ایک خوراک صبح نہار منہ 5 قطرے لیں۔ پھر ایک دن کے وقفے سے Peonia-30 کے 5،5 قطرے دن میں 3 بار لیں۔

لاڈ پیار و ضدی بچے

اریبہ...... لاہور

میری بیٹی کی عمر 7 سال ہے۔ چار سال سے نظر کی شدید کمزوری کا شکار ہے جس کی وجہ سے اسے عینک لگانی پڑتی ہے۔ آنکھوں کے اسپیشلسٹ کو دکھایا جن کے مطابق تقریباً 14 سال تک اس کی نظر مزید کمزور ہونے کا امکان ہے۔ صبح سو کر اُٹھتی ہے تو اس کے سر میں درد ہورہا ہوتا ہے۔ کبھی کبھار متلی کی شکایت بھی کرتی ہے۔ اس کے پیٹ میں کیڑے ہیں۔ ہمیشہ اوندھا سوتی ہے اور سوتے میں دانت بھی پیستی ہے۔ رنگت زرد ہے، چڑچڑی بھی

بہت ہے۔ حساس بھی بہت زیادہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو خود پر سوار کر لیتی ہے۔ گھر میں بیٹی کو دونوں بھائیوں کی نسبت فوقیت حاصل ہے اور گھر کا ماحول بھی دوستانہ ہے۔ میری بیٹی کا مسئلہ حل کر دیں، میں اور میری بیگم ساری عمر آپ کو دعائیں دیں گے۔ پاکیزہ کے توسط سے آپ نے انسانیت کی خدمت کا جو بیڑا اُٹھایا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے۔

جواب: بیٹی سے زیادہ لاڈ نہ کریں، بچے زیادہ لاڈ پیار سے بگڑ جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ والدین ان کی ہر فرمائش پوری کریں گے۔ اور جب بھی کسی وجہ سے والدین ایسا نہیں کرتے تو بچے چڑچڑے اور ضدی ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اچھی تربیت کا تقاضا ہے کہ احتیاط کریں۔ اگر وہ چشمہ لگانے کا مشورہ دیں تو ضرور لگائیں۔ اگر ایسا نہیں کریں گے تو آنکھوں پر زیادہ زور پڑے گا۔ بادام، مصری، سونف کو پیس کر صبح و شام دودھ میں ملا کر دیں۔ گاجر کا استعمال زیادہ سے زیادہ کروائیں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Physostigma 200 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں صبح دیں اور دن بھر میں تین مرتبہ Calc Phos6,Calc Flour 30, Cina 30 کے 5،5 قطرے ایک کپ پانی میں دیں۔ تین ماہ بعد حالت بتائیں۔

مینسز سے پہلے لیکوریا

نوشیزہ......چکوال

میں پاکیزہ میں شوابے کلینک کئی سال سے پڑھ رہی ہوں۔ یہ بہت اچھا سلسلہ ہے اور ہم جیسے لوگ جو چھوٹے شہروں میں رہتے ہیں ان کو بہت فائدہ ہو رہا ہے۔ مجھے ماہانہ پیریڈ سے ایک ہفتہ پہلے لیکوریا ہو جاتا ہے، ساتھ کمر اور ٹانگوں میں درد ہوتا ہے۔ ہر مہینہ اپنے ٹائم پر ہوتے ہیں۔ مجھے دماغی اُلجھن بہت زیادہ ہے کچھ فیملی کے مسئلے مسائل ہیں اور کچھ سوچتی بھی بہت زیادہ ہوں۔ کھانا پینا بس نارمل ہے۔ آپ مجھے اچھی سی دوا دیں آپ کی شکر گزار رہوں گی۔

جواب: اپنی پریشانی پر اللہ کی طرف راغب ہوں۔ متوازن غذا کھائیں۔ درج ذیل ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی استعمال کریں , Kali.phos 30 Bovista 30 , Pulsatilla 30 کے 5،5 قطرے ایک کپ پانی میں دن میں تین مرتبہ پئیں۔ Magnesium Phos Pentarkan Ptk 60 کی ایک گولی دن میں 3 مرتبہ تین ماہ تک لیں۔

ناک کی ہڈی اور خارش

فردوس......راولپنڈی

میری ناک کی ہڈی بڑھی ہوئی ہے۔ اکثر نزلہ زکام رہتا ہے۔ جسم پر اکثر خارش رہتی ہے۔ پسینا آنے پر یا پانی لگنے پر جلن ہوتی ہے۔ دانوں میں پیپ نہیں ہوتی مگر جلن اور خارش کی وجہ سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ ہومیوپیتھک کا کافی علاج کروایا۔ وقتی طور پر خارش میں افاقہ ہوتا ہے مگر کچھ عرصے بعد پھر خارش شروع ہو جاتی ہے۔ برائے مہربانی دونوں مسئلوں کے لیے دوا تجویز کریں۔

جواب: ٹھنڈی کھٹی چیزوں سے پرہیز کریں۔ گرم کے بعد ٹھنڈا یا ٹھنڈے کے بعد گرم استعمال نہ کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ صبح نہار منہ Sulphur 200 کی ایک خوراک یعنی 7 قطرے آدھا کپ پانی میں لیں۔ ایک دن بعد Calc.flour, Belladona 30 Kali.mur 30 کے 5،5 قطرے آدھا کپ پانی میں 3 مرتبہ پیا کریں۔ ایک ماہ کے استعمال کے بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔

ہر کھانے کے بعد اجابت

امیر......راولپنڈی

میں جب بھی کوئی چیز کھاؤں یا کھانا کھاؤں تو مجھے اُس کے فوراً بعد اجابت ہوجاتی ہے۔ برائے مہربانی اس کا کوئی علاج تجویز کردیں کیونکہ اس وجہ سے میں کسی دعوت میں شرکت کرنے سے گھبراتا ہوں۔ مجھے میٹھی چیزیں بہت زیادہ پسند ہیں۔

جواب: چربیلی غذاؤں سے پرہیز کریں۔ بھوک سے کم کھانا کھائیں تاکہ ہضم ہوسکے۔ باربار کھانے پینے سے پرہیز کریں۔ تیز مرچ مصالحے اور گائے کے گوشت سے پرہیز کریں۔ کھچڑی، چاول کھائیں، موسم کے پھل بھی استعمال کریں، انار کے دانے کھائیں۔ اس کے علاوہ دن میں چار مرتبہ Argentum Nitricum 30 کے 5،5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ پندرہ دن استعمال کریں۔

وزن بڑھانا چاہتا ہوں

راہول...... سکھر

میری عمر 20 سال ہے اور میرا وزن 45 کلوگرام ہے۔ میں تقریباً ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آتا ہوں۔ مناسب کھاتا پیتا ہوں مگر پھر بھی صحت نہیں بنتی۔ چار مہینے بعد میری شادی ہونے والی ہے۔ برائے مہربانی کوئی ایسی دوا تجویز کریں کہ میں صحت مند اور موٹا ہوجاؤں۔

جواب: آپ نے تفصیل سے اپنا حال نہیں لکھا، اپنے جسم کی ساخت اور مزاج کے بارے میں بھی لکھیں۔ Alfalfa Q ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کے 11 قطرے ہر کھانے سے ایک گھنٹا پہلے آدھا گلاس پانی میں لیں۔ Calc Carb 30 کے 5 قطرے دن میں تین مرتبہ آدھا گلاس پانی میں لیں۔ ناشتے میں، دودھ، مکھن، دہی، بالائی، پراٹھا استعمال کریں۔ نشاستے دار غذائیں، کھجور، کیلا اور آلو کھائیں۔ ہلکی ورزش کیا کریں۔

قد بڑھانا ہے

عاقلہ...... کراچی

میری عمر 18 سال ہے اور وزن 50 کلو ہے۔ میرا

قد 5 فٹ 2 انچ ہے۔ کئی سالوں سے میرا قد نہیں بڑھ رہا ہے۔ برائے کرم قد بڑھانے کی کوئی دوا تجویز کریں۔

جواب: عاقلہ بی بی قد 17 سال بعد کم ہی بڑھتا ہے اور خاندانی اثرات بھی ہوتے ہیں۔ البتہ کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ اچھی متوازن غذا استعمال کریں۔ متوازن غذا سے مراد انڈا، دودھ، مکھن، گھی، گوشت (گائے، بکرا، مچھلی) دالیں، پھل و سبزیاں کھائیں۔ صبح سویرے ورزش کا اہتمام کریں خصوصاً لٹکنے والی ورزش آپ کے لیے مفید ہے۔ اگر مزاج میں تیزی ہو، غصہ جلد آتا ہو تو Thyroidinum 30 صبح و شام لیں... اور Baryta Carb 30 دوپہر اور رات کھانے کے بعد پانچ پانچ قطرے استعمال کیجیے اور اپنے احوال سے بھی آگاہ کرتی رہیں۔

پاؤں کے تلوؤں میں جلن

محمد علی...... کوٹ ادو

مجھے گزشتہ 3 سال سے پاؤں کے تلوؤں میں جلن ہورہی ہے۔ ہر قسم کے میڈیکل، ہومیوپیتھک اور دیسی علاج کرواچکا ہوں لیکن کوئی بھی فائدہ نہیں ہوا۔ میرا یورک ایسڈ پہلے بڑھا ہوا تھا اب دواؤں سے کنٹرول میں ہے۔ اور کیلشیم ٹھیک ہے۔ شوگر 115 ہے۔ بند جوتے پہننا میرے لیے بہت مشکل ہوگیا ہے۔ ایسی دوا تجویز کریں کہ میں اس تکلیف سے نجات پاسکوں۔ میرے سر کے بال بھی بہت تیزی سے سفید ہورہے ہیں۔ یادداشت بھی بہت کمزور ہوگئی ہے۔

جواب: سبزیوں اور پھلوں کا استعمال بڑھادیں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ صبح نہار منہ ایک دفعہ 2 قطرے آدھا کپ پانی میں Sulphur 200 کے لیں۔ ایک دن کے بعد Iodium 30 اور Acid Phos 30 کے 5،5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں تین مرتبہ لیں۔

HbA1C کا ٹیسٹ کرا کر ایک ماہ کے بعد اپنی طبیعت سے مطلع کریں۔

کانوں سے کم سنائی دینا

تبسم......ملتان

میرا مسئلہ میرے کان کا ہے۔ بچپن میں مجھے ہائی گریڈ فیور ہو گیا تھا جس سے میرے کان کی رگ متاثر ہوئی تھی۔ وائیں کان کی رگ جس کی وجہ سے میں سن نہیں سکتی۔ فیور کی وجہ سے میرا دایاں کان متاثر ہوا۔ ڈاکٹر کے مطابق دونوں کان کے پردے ٹھیک ہیں۔ میں مکمل بہری نہیں ہوں۔ بس یہ ہے کہ مجھے دور کی آواز... سنائی نہیں دیتی، موبائل پر کال آرہی ہو تو میں نہیں سن سکتی۔ کوئی سرگوشی میں بات کرے تو میں وہ بھی نہیں سن سکتی۔ میرے تعلیمی دور میں مجھے ٹیچرز کی کوئی بات سنائی نہ دیتی تھی۔ میری عمر 28 سال ہے میں ان میرڈ ہوں۔ اسی نہ سننے کی وجہ سے میں کہیں جاب بھی نہیں کر سکتی۔ اذان... بھی مجھے نہیں سنائی دیتی۔ میرے دوسرے کان کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔

جواب: ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کا Mullen Oil کے اسے 2 قطرے دونوں کانوں میں دن میں تین مرتبہ ڈالیں۔ 2 ماہ بعد حال بتائیں۔

منہ کے چھالے

نور زمان......سکھر

میرا مسئلہ یہ ہے میرے منہ میں ہر وقت چھالے رہتے ہیں جس کی وجہ سے منہ میں بہت درد رہتا ہے۔ کھانا بھی نہیں کھا سکتا۔ معدہ خراب رہتا ہے۔ گھٹنوں میں درد رہتا ہے جس کی وجہ سے روزانہ دو گولی پونستان (فورٹ) کھاتا ہوں، میں گٹکا بھی کھاتا ہوں۔ برائے مہربانی میرے لیے کوئی علاج تجویز فرمائیں، تازیست دعا گو رہوں گا۔

جواب: یاد رکھیں نسوار، تمباکو پینا، مضرِ صحت ہے۔ اسی طرح گٹکا بھی ہے، اس کا استعمال فوراً ترک کر دیں۔ متوازن غذا کھائیں۔ دودھ دہی کا استعمال کریں۔ کھانا آہستہ آہستہ چبا کر کھائیں۔ کھانے کے ساتھ اور فوراً بعد پانی کا استعمال نہ کریں۔ Borax30, Calc.Carb Merc.sol30, Rhustox30 (ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی) کی ہر شیشی سے 5،5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد پھر کیفیت سے مطلع کریں۔

سفید بال

سائرہ بانو......لیہ

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے سر کے تقریباً 80% بال سفید ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ آپ پلیز کوئی اچھی سی دوا تجویز کریں کہ میرے بال کالے ہو جائیں۔

جواب: غم، فکر، ناقص غذا، پانی غیر معیاری، شیمپو، تیل اور کچھ جسمانی تبدیلیاں جو وقت و عمر کے ساتھ ہوتی ہیں، بالوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ آپ پابندی سے علاج کرائیں انشاء اللہ فائدہ ہوگا لیکن آہستہ آہستہ اس لیے مستقل مزاجی کے ساتھ علاج کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Acid Phos Q کے 5 قطرے ایک کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں اور Lycopodium 30 کے 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ... 2 ماہ بعد اپنی کیفیت سے آگاہ کریں۔

☆☆☆